صبا





شاہینہ چندا مہتاب

اسٹاکسٹ:۔
مکتبہ القریش ◎ سرکلر روڈ
اردو بازار، لاہور۲۔ فون: 7668958
E.mail: al_quraish@hotmail.com

معیاری اور خوبصورت کتابیں
باہتمام...... محمد علی قریشی

باراول ——— 2007ء
مطبع ——— نیراسد پریس
ڈیزائن ——— ذاکر
کمپوزنگ ——— وسیم احمد قریشی
قیمت ——— -/200 روپے

انتساب

وہ جس نے باپ کی موت کے بعد اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو باپ کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ جس نے اپنی جوانی، پیسہ، محبتیں خاندان پر نچھاور کر دیں۔ بے حد محترم، قابلِ احترام، قابلِ قدر اور دل کے تمام ادب و آداب کے ساتھ اپنے بڑے بھائی

الحاج میاں محمد مبارک کے نام۔

اپنے اوپر طاری ہونے والے خوف گھبراہٹ وحشت اور بے چینی کو وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی مگر اس سے پیچھا چھڑانا اب اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ گزرا ہوا وقت لوٹ کر نہیں آ سکتا تھا مگر یہی گزرا ہوا وقت پچھتاوا اور سزا بن کر اس کے ذہن پر محیط ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم بے سکون ہو گئی تھی۔ ایک طوفان باہر تھا اور دوسرا اس کے اندر۔ آسمان پر بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ منہ زور ہوا کی سائیں سائیں رات کے اس گہرے سکوت کو کچھ اور بھی زیادہ دہشت ناک بنا رہی تھی۔

اس کے باوجود ثناء اپنے اندر کی گھبراہٹ سے پریشان ہو کر کمرے سے باہر نکل آئی اور بے ارادہ منہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھنے لگی۔ کوئی کوئی ستارہ نظر آ رہا تھا مگر ان کو بھی ایک دوسرے کے پیچھے لپکتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑے اپنے بھاری وجود کے نیچے چھپا لیتے تھے۔ ثناء یہ کھیل بھی مزید نہ دیکھ سکی۔ اکتا کر اس نے گردن نیچے جھکا لی۔ بے دھیانی میں ننگے پیر اور ننگے سر ہی باہر نکل آئی تھی۔ اس کے شولڈر کٹ بال، تیز ہواؤں سے منتشر ہو کر چہرے پر بکھر بکھر جا رہے تھے۔

ثناء نے ایک ہاتھ سے منہ پر آئے ہوئے بال سمیٹے اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لان میں آ گئی جو ڈرائنگ روم کے بالکل سامنے تھا۔ لان کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت سا بیٹھنے اور لیٹنے کے لیے جھولا لٹک رہا تھا۔ اسی جھولے پر بیٹھنے کے لیے وہ بے چین رہتی تھی۔ مچل مچل جایا کرتی تھی مگر اب جبکہ یہ جھولا اس کی ملکیت بن چکا تھا۔ بیٹھنا تو دور کی بات وہ اس کو چھونے کی بھی طاقت نہ رکھتی تھی۔ اپنی یہ کیفیت خود اس کی سمجھ میں بھی نہ آتی تھی کہ اب وہ اس جھولے سے کیوں دور بھاگنے لگی ہے۔

یہ کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ چیخ چیخ کر ممی سے کہہ رہی تھی۔

''ممی اب یہ کمرہ اور جھولا میرا ہے۔صرف میرا ہے نا ممی؟'' اس نے بچوں کی طرح مچل کر پوچھا تھا۔اور فوزیہ نے بھی خوش ہوتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں سنی! اب سب کچھ تمہارا ہے، سب کچھ۔ اب کوئی بوجھ ہمارے درمیان نہیں۔ اب ہماری زندگی ہوگی۔ اب کوئی نفرت آمیز چیز ہمارا سکون برباد نہیں کرے گی۔''

مگر اب ثناء سوچ رہی تھی۔کون کس پر بوجھ تھا؟ اس کا فیصلہ تو آج ملنے والے خط نے کر دیا تھا۔

اس نے ایک بار پھر خط کھولا اور لان میں لگے بلب کی زرد روشنی میں اس مختصر تحریر پر نظر ڈالی اور پھر خط بند کر کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔مگر سکون نہ اب اندر تھا نہ باہر۔

''اف اللہ! میں کیا کروں۔'' ثناء نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

آج سے دس دن پہلے میں کتنی خوش تھی۔مگر اب وہ اپنے کمرے میں لیٹی سونے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کیونکہ سارا دن صباء کی ناسازی طبع کی وجہ سے اسے پاپا کی آواز پر کبھی اندر اور کبھی باہر آنا جانا پڑ رہا تھا۔صباء کو دیکھ کر اسے خوامخواہ وحشت ہو رہی تھی۔ پاپا پر بھی غصہ آ رہا تھا جو صبح سے اس کے سرہانے کھڑے تھے۔اور وہ تھی کہ مرنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ثناء کا بار ہا جی چاہا، پاپا اور ڈاکٹر ذرا ادھر اُدھر ہوں تو وہ صباء کا گلا دبا کر منٹوں میں یہ قصہ ختم کر دے جو سب کے لیے مصیبت بنی ہوئی تھی۔مگر وہ ایسا سوچ سکتی تھی، کر نہیں سکتی تھی۔صباء اس کے پاپا کی چہیتی بہن تھی۔ بڑی مشکل سے وہ سونے کی اجازت لے کر اپنے کمرے میں آئی تھی۔ ابھی آنکھ بھی نہ لگی تھی کہ نومی بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''آپی..... آپی۔'' وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''نان سنس۔کتنی بار کہا ہے اجازت لے کر میرے کمرے میں آیا کرو۔'' ثناء نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا۔

''ثناء آپی! وہ صباء پھپھو کی طبیعت.....''

''کیا ہوا ہے صباء پھپھو کی طبیعت کو مجھے معلوم ہے وہ زندہ ہوں گی؟'' ثناء اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''پوری بات تو سن لیں۔'' نومی جھنجلا کر بولا۔''اب ان کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب

ہے۔ پاپا آپ کو بلا رہے ہیں۔''

''نومی! سچ کہہ رہے ہو؟'' ثناء کے لہجے میں خوشی کا بھرپور عنصر شامل تھا۔نومی نے منہ بنا کر اس کو دیکھا اور بگڑ کر کہا۔

''ایک مرتے ہوئے انسان پر اس طرح خوش ہونا کوئی اچھی بات نہیں آپی۔ وہ اب ملک عدم کو رخصت ہونے ہی والی ہیں۔آپ کو کم از کم اب ان کے بارے میں اس لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔اس راہ پر سب کو ہی جانا ہے۔''

اس خبر سے ثناء کو جو خوشی ہوئی وہ تو سہیل سے منگنی ہونے پر بھی نہ ہوئی تھی۔وہ بھاگی بھاگی صباء کے کمرے میں داخل ہوئی تو صباء پھپھو سیدھی لیٹی گہری گہری سانسیں لے رہی تھیں۔آنسو تھے کہ ان کی آنکھوں سے بے تحاشہ بہتے چلے جا رہے تھے۔شاید موت کو سامنے دیکھ کر ڈر رہی ہیں۔ثناء نے دل میں سوچا۔صباء کے قریب ہی اس کی ممی کھڑی تھیں۔مگر ان کے چہرے پر ذرا سی بھی پریشانی یا ہمدردی نہ تھی۔ دوسری طرف دادی جان کھڑی تھیں اور خلاف توقع آج ان کے چہرے پر کچھ اداسی بھی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان کا تخلیق کردہ شاہکار آج دم توڑ رہا تھا۔البتہ اس کے پاپا کی آنکھوں میں حقیقی افسردگی اور نمی تھی، جیسے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ اپنے رومال سے بار بار صباء کے آنسو صاف کرتے اور ایک ہی بات کہتے۔''صباء! گھبراؤ نہیں۔تم اچھی ہو جاؤ گی۔فکر مت کرو۔'' اس کے باوجود صباء تھی کہ روئے چلی جا رہی تھی۔اس کے اندر کیا دکھ تھا؟ کیا غم تھا؟ اس کو شاید اس وقت ثناء کے پاپا ہی سمجھ رہے تھے۔ثناء کو دیکھتے ہی بولے۔

''سنی! اپنے چچا اور سب پھپھوں کو فون کر کے بتاؤ کہ صباء کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

''مگر پاپا! آپ جو ہیں صباء پھپھو کے پاس۔ان لوگوں کو اتنی رات گئے پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' ثناء کو ان سب لوگوں کا اپنے گھر آنا سخت ناگوار گزرتا تھا۔

''سنی۔'' پاپا غصے سے بولے۔اسی دم صباء نے آنکھیں کھول کر ثناء کو دیکھا اور ثناء نفرت سے ناک سکیڑ کر صباء کو دیکھتی ہوئی منہ بنا کر کمرے سے چلی گئی۔

دو پھپھیاں اور ایک چچا لاہور ہی میں رہتے تھے۔جبکہ ایک پھپھو اسلام آباد میں اور باقی دو جو امریکہ میں رہتی تھیں۔ان کو تو بلانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ثناء نے سب کو فون کرنے کے بعد بے دلی سے اسلام آباد کے نمبر ڈائل کیے۔دوسری جانب سے فوراً ہی

ریسیور اٹھالیا گیا۔ گویا کوئی پہلے ہی سے فون کا منتظر تھا۔

''ہیلو کون؟'' ثناء نے پوچھا؟ اور پھر عمر فاروق کی آواز پہچان کر بولی۔ ''پھپھو صباء کی طبیعت بہت خراب ہے آپ لوگ اگر آ سکتے ہیں تو فوراً لاہور آ جائیں۔''

''اوہ نو۔'' دوسری طرف سے عمر فاروق کے منہ سے مشکل آواز نکلی۔ ''شاید اسی لیے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کب سے خراب تھی ان کی طبیعت؟'' مگر جواب دینے کے بجائے ثناء نے کھٹ سے فون بند کیا۔ ''اونہہ...... آیا بڑا ہمدرد۔'' ثناء نفرت سے بڑبڑائی۔ پھر پاپا کی تیز آواز سن کر بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''صباء......'' رضوان نے تقریباً چیختے ہوئے پکارا۔ صباء نے بڑی مشکل سے آخری سانس لیتے ہوئے آنکھیں کھول کر ان کو دیکھا اور ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا ''ماں'' ثناء نے دیکھا ان کی دادی دو قدم آگے بڑھیں۔ پھر فوزیہ نے پلٹ کر ان کو دیکھا تو وہ جہاں تھیں وہیں رک گئیں اور صباء کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ قریب کھڑے ڈاکٹر نے مایوسی سے سر ہلایا تو ثناء نے دیکھا پاپا کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہنے لگے تھے۔ دادی جان جہاں تھیں وہیں کھڑی رہیں۔ جیسے قریب آ کر صباء کو دیکھنا کوئی گناہ ہو۔ البتہ ثناء اور فوزیہ کی آنکھیں بالکل خشک تھیں بلکہ دل کے اندر خوشی کی جو لہریں اٹھ رہی تھیں اس کا تھوڑا تھوڑا عکس چہرے سے بھی عیاں ہو رہا تھا۔ یعنی خس کم، جہاں پاک۔

''اماں...... امی جان!'' رضوان ماں سے لپٹ کر روتے ہوئے ان کو صباء کے قریب لائے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ ''امی! دیکھو صباء مجھ سے روٹھ کر چلی گئی۔ آپ کو تو معلوم ہے امی! میں نے اسے کبھی کچھ نہیں کہا۔ کبھی کچھ نہیں، پھر بھی یہ چلی گئی۔'' کہتے ہوئے انہوں نے صباء کا چہرہ ڈھانپ دیا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے اندر اندر سب لاہور والے آ گئے تھے اور ان کا گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔ ڈھائی بجے پھپھو پروین، میجر عمر فاروق کے ساتھ پہنچ گئیں۔ مگر تب صباء رخصت ہو چکی تھی۔ سب بہنیں رو رہی تھیں خود ثناء کے پاپا بھی ان میں شامل تھے۔ مگر باقی سب لوگ چپ تھے یہاں تک کہ ثناء کی دادی بھی، جیسے ان کو بھی صباء کے مرنے کا کوئی افسوس نہ تھا۔ اور ثناء کو تو سہیل سے باتیں کرنے سے ہی فرصت نہ مل رہی تھی۔ تاہم جب جنازہ اٹھنے لگا تب اچانک ثناء کی نظر عمر پر پڑی اور وہ حیران رہ گئی۔ عمر، میجر ہونے کے باوجود اس وقت

بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ شاید گزشتہ ساری رات آہ و زاری کی نذر ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

پھر جنازہ چلا گیا سب بہنیں روتے روتے چپ ہو گئیں مگر پروین روتی رہی۔ ثناء نے ناگواری سے ان کی طرف دیکھا۔ دل میں آیا کہ کہہ دے جنازہ تو چلا گیا اب کس کے لیے بین کر رہی ہیں؟ کیا اب ہمیں مارنے کا پروگرام ہے؟ لحاظ تو وہ کم ہی کسی کا کرتی تھی۔ مگر اس وقت نہ جانے کیوں ضبط کر گئی۔ تاہم فوزیہ کے قریب آ کر وہ اونچی آواز میں بولی۔

''ممی! رات سے کچھ نہیں کھایا، صبح ناشتہ نہیں ملا۔ اب کیا کھانا بھی نہیں ملے گا۔ سہیل کو زور کی بھوک لگی ہے۔''

''سہیل جنازے کے ساتھ نہیں گیا؟'' ثناء کی ممانی نے پوچھا تو فوزیہ اٹھتی ہوئی بولی۔

''ارے بچہ ہے وہ جا کر کیا کرتا اور پھر جن کی سگی تھی۔ وہ تو گئے ہیں۔'' پھر وہ ناگواری سے سب کو دیکھتی ہوئی کچن میں چلی گئیں اور ثناء، پھپھو پروین کی آواز سن کر چونک پڑی جو کہہ رہی تھیں۔

''مجھے معلوم ہوتا ایسا ہو گا تو میں کبھی اسے آنے نہ دیتی۔ یہاں آنے سے دو روز قبل ہی تو اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا تھا ان کو کوئی صدمہ پہنچا ہے۔ ان کے دل پر کوئی بوجھ ہے، کوئی پریشانی ہے۔ انہیں میں نے کہا بھی، صباء ابھی نہ جاؤ مگر کہنے لگیں اتنے ماہ رہ چکی ہوں اب جب بھائی جان کہتے ہیں اپنے گھر آؤ تو کیوں نہ جاؤں۔ حالانکہ اس کا اپنا دل بھی یہاں آنے کو نہیں چاہتا تھا۔ مگر جب بھائی جان لینے گئے تو وہ انکار نہ کر سکی۔'' بات ختم کر کے پروین پھر رونے لگی تو ثناء تنک کر بولی۔

''کیا آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ ہم نے ان کو زہر دیا ہے؟''

''میں نے یہ کب کہا؟'' پروین نے کچھ زیادہ محبت سے اس کو نہ دیکھا تھا۔

''پھر آخر آپ کی اس بات کا مطلب کیا ہے؟'' وہ بدتمیزی سے بولی۔

''تم کون ہوتی ہو مطلب پوچھنے والی؟'' پروین نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔ ثناء نے ناک سکیڑ کر ناگواری سے انہیں دیکھا اور پھر بولی۔

''ممی ٹھیک کہتی ہیں، آپ سب لوگوں کے ساتھ چاہے جتنی بھی نیکی کی جائے، آپ اس کا مطلب ہمیشہ الٹ ہی لیتی ہیں۔ کیونکہ آپ لوگوں کی ذہنیت ہی ایسی ہے۔''

"بکواس مت کرو ثناء! ماں کی طرح تمہاری زبان بھی بہت لمبی ہے۔" بڑی پھپھو زاہدہ نے نفرت سے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔ اتنے میں فوزیہ بھی واپس آ گئی۔

"چلو سنی تم سب لوگ کھانا کھا لو۔"

"ممی! صباء والا کمرہ اب میرا ہو گا نا۔" ثناء جاتے جاتے پھپھیوں کو جلانے کے لیے بولی۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں یہ تو پہلے بھی تمہارا ہی تھا، اور اب بالکل تمہارا ہو گیا۔ مگر بیٹا پہلے قالین اور پردے وغیرہ بدلنے ہوں گے۔" فوزیہ نے بات ختم کی تو ثناء طنز بھری نظروں سے پھپھیوں کو دیکھتی ہوئی اٹھ گئی۔

صباء کو دفنانے کے بعد سب لوگ واپس آ گئے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں عمر، ثناء کو نظر نہ آیا تھا۔

رات کو جب سہیل جانے لگا تو ثناء اس کو صباء کے کمرے کی طرف لے آئی۔

"دیکھو سلو۔" وہ خوشی سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ بولی۔ جیسے اس گھر سے جنازہ نہیں ڈولی اٹھی ہو۔ "سلو! اب یہ کمرہ میرا ہے، بہت عرصہ سے مجھے اس کمرے میں رہنے کی خواہش تھی۔ مگر پاپا کو بیٹی سے زیادہ بہن کا خیال تھا مگر دیکھو آج قدرت نے مجھے اس کمرے کی وارث بنا دیا۔ بہت کشادہ کمرہ ہے۔"

"جی ہاں، وارث تو بنا دیا مگر افسوس صرف کچھ ماہ کے لیے۔ اس کے بعد جناب کو یہ کمرہ بھی چھوڑنا پڑے گا۔" سہیل نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیوں چھوڑنا پڑے گا؟" ثناء نے حیران ہو کر سہیل کو دیکھا۔

"اس لیے کہ پھر......" سہیل نے رک کر خوشی سے اسے دیکھا اور اس کے بالوں کی ایک لٹ کو جھٹکتے ہوئے بولا۔ "پھر ہمارے گھر کا کوئی کمرہ جنابہ کا منتظر ہو گا۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" ثناء زور سے ہنس دی پھر بولی۔ "آؤ تمہیں اندر سے کمرہ دکھاؤں۔ تم نے تو شاید اسے کبھی اندر سے دیکھا ہی نہیں۔"

"نا بابا نا۔ ہو سکتا ہے تمہاری پھپھو بھوت کی شکل میں اندر موجود ہوں۔" سہیل نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"ہشت، ایسی باتیں نہیں کرتے۔ ہم نے کون سا انہیں اپنے گھر میں سکھ سے رہنے دیا ہے جو وہ مرنے کے بعد بھی یہاں آئیں گی۔ جناب وہ سیدھی اسلام آباد جایا کریں گی۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔" سہیل رخصت ہوا تو ثناء اپنے کمرے میں جانے کے بجائے صباء کے کمرے میں داخل ہوئی اور بغیر لائٹ آن کیے مسکراتی ہوئی بیڈ پر لیٹ گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے کسی انسانی وجود کی موجودگی محسوس کر کے اس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ پہلا خیال سہیل کی باتوں کی روشنی میں بھوت کا ہی اس کے ذہن میں آیا تھا۔ خوف سے کانپتے ہوئے اس نے جلدی سے ٹیبل لیمپ آن کیا اور روشنی میں ثناء یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ میجر عمر فاروق اپنی سرخ ہوتی ہوئی آنکھوں سے اس کو گھور رہا تھا۔

"تم......" ثناء کا پورا وجود غصے کی آگ میں سلگ اٹھا۔ "تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟" ثناء نے نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے بدتمیزی سے کہا۔ اپنے باپ کے خاندان والوں سے وہ ایسی ہی بدتمیزی سے پیش آتی تھی۔ اگرچہ عمر فاروق، عمر میں اس سے بڑا تھا مگر وہ جب بھی اسے بلاتی اسی طرح مخاطب کرتی۔

"یہی بات میں تم سے پوچھ سکتا ہوں۔ تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟" عمر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"یہ کمرہ میرا ہے، سمجھے آپ؟" ثناء نے چیخ کر کہا۔ اگر اس میں قوت ہوتی تو وہ آگے بڑھ کر بیڈ الٹ کر عمر کو نیچے گرا دیتی۔

"آہستہ بولو، انسانوں کی طرح، جانوروں کی طرح چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں۔ باقی رہی کمرے کی بات تو یہ کمرہ صباء آنٹی کا ہے اور تم......" انہوں نے ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"یہ کمرہ اب میرا ہے اور میں کہہ رہی ہوں آپ یہاں سے چلے جائیں۔" ثناء نے ضبط کی آخری کوشش کی۔ ورنہ جی تو چاہ رہا تھا آگے بڑھ کر عمر کا منہ نوچ لے۔

"نہیں......تم جاؤ یہاں سے۔" عمر نے اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

"ممی ٹھیک کہتی ہیں۔ اس خاندان کا ہر فرد گھٹیا سوچ کا مالک ہے۔" ثناء کی بات سن کر عمر گو غصہ ضبط کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ مگر اب اس کے چہرے پر فوجیوں والی سختی تھی۔

"بہتر ہو گا اب تم یہاں سے دفعان ہو جاؤ" اس نے ثناء کو گھورتے ہوئے بگڑ کر کہا۔

"کیوں میں کیوں دفعان ہو جاؤں۔ آپ ہی دفعہ ہو جائیں......آپ تو......" جملہ ادھورا رہ گیا۔ کیونکہ عمر کا بھاری ہاتھ اس کے گالوں پر ایک گہرا نشان چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔

"اب جاؤ" اس نے یوں کہا جیسے اب تک محض ثناء اس تھپڑ کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔

تھپڑ بالکل اچانک پڑا تھا۔ ثناء کو عمر سے اس قسم کی توقع ہرگز نہ تھی۔ ایک دم ہی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ کر رہ گئے تھے۔ ثناء کی سمجھ میں نہ آیا، اب کیا کرے۔ عمر کے خطرناک تیور دیکھ کر وہ غصے سے بھری باہر چلی گئی۔ "تم میر عمر فاروق! وہی تو ہو جو مجھ سے محبت کا ڈرامہ کرتے تھے۔ میرے پیار کی بھیک مانگتے تھے۔ مگر جب میں نے تمہیں ٹھکرا دیا تو اب غصے میں بھرے رہتے ہو۔ ذلیل انسان! یہ تھپڑ تمہیں بہت مہنگا پڑے گا۔ میں ابھی ممی کو بلا کر لاؤں گی۔"

وہ پاپا کے بیڈروم میں آئی مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔ یعنی وہ لوگ سو چکے تھے۔ اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ عمر کو برا بھلا کہتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی اور جب تک نیند نہیں آئی وہ گال پر ہاتھ رکھے عمر کو کوستی رہی۔

صبح رسم قل تھی، قرآن ختم ہوتے ہی عمر فاروق اپنے والد کے ساتھ اسلام آباد چلے گئے کیونکہ باقی سب بہنوں کو دسویں تک یہیں رہنا تھا۔ ختم کے بعد لوگوں کے جاتے ہی ثناء نے صباء کے کمرے سے سامان نکال نکال کر باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ برآمدے میں بیٹھی سب بہنیں خاموشی سے یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں کہ اچانک رضوان آ گئے۔

"سنی! یہ کیا کر رہی ہو؟" انہوں نے غصے سے پوچھا۔

"پاپا...... اپنے لیے کمرہ ڈیکوریٹ کرنے لگی ہوں۔" ثناء نے لاڈ سے اٹھلا کر کہا۔

"سنی! تمہیں ذرا بھی تمیز نہیں۔ اب تم اتنی چھوٹی بھی نہیں ہو کہ کوئی بات بھی نہ سمجھ سکو۔ چلو سامان واپس کمرے میں رکھو یہ سب خوشیاں دسویں کے بعد منا لینا۔" انہوں نے زہریلے لہجے میں کہا اور ثناء جلدی جلدی سامان اندر رکھنے لگی۔

سب کے سامنے جو توہین ہوئی تھی اس کا بدلہ اس نے اس طرح لیا کہ ان دس دنوں میں اس نے ماں اور نانی کے ساتھ مل کر جی بھر کر پھپھوں کو باتیں سنائیں جو ہمیشہ کی طرح انہوں نے بڑے صبر و تحمل سے سنیں۔ کسی کی زبان سے اف تک نہ نکلا۔

دسویں والے دن عمر بھی آ گئے۔ وہ اکیلے ہی تھے، ان کے ساتھ کرنل نہیں تھے۔ جب قرآن ختم ہو گیا تو ثناء کی نانی بولیں۔

"فوزی! کیا چہلم تک یہ سب لوگ یہیں رہیں گے؟" حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح

جانتی تھیں کہ سب بہنیں آج چلی جائیں گی۔

"کیوں یہاں رہیں گے؟" فوزیہ نے کسی کا بھی لحاظ کیے بغیر بگڑ کر کہا۔ "دس دن رہ لیے کیا یہ کافی نہیں؟"

"اچھا...... اچھا میں سمجھی، اب یہ لوگ چہلم پر پھر آئیں گے۔" ثناء کی نانی نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیا کرتی تھیں۔

"کیوں، چہلم پر کیوں آئیں گے یہ لوگ؟ چہلم پر آنا ان کے لیے ضروری تو نہیں۔ ہم نے کوئی ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔ سب اپنے اپنے گھروں میں بھی تو چہلم کی فاتحہ کر سکتے ہیں۔ ماں تو ان کو منہ نہیں لگاتی اور اب صباء بھی زندہ نہیں جس کے بہانے سے ہر شخص منہ اٹھا کر چلا آتا تھا۔"

تینوں بہنوں نے آنسو ضبط کرتے ہوئے یہ باتیں سنیں مگر بھائی کی محبت کا جو فرض تھا اس نے ان سب کے منہ پر خاموشی کے تالے ڈال دیئے تھے۔

ثناء جانتی تھی اب کے بعد کوئی ان کے گھر نہیں آئے گا مگر وہ تو خود ماں سے زیادہ خوش تھی۔

جاتے ہوئے عمر، صباء کی بڑی تصویر اور ان کے کمرے میں لگی ہوئی شاندار پینٹنگ بھی ساتھ لے گئے تھے۔ ان سب کے جاتے ہی ثناء نے نومی اور فومی کے ساتھ مل کر کمرے کی صفائی شروع کر دی تھی۔

جب وہ بیڈ کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر ٹھیک کر رہی تھی۔ اچانک ایک موٹی سی ڈائری نکل کر قالین پر گر گئی۔ ثناء نے اس کو اٹھا کر سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا۔ کمرے کی صفائی سے فارغ ہوئی تو شام ہو رہی تھی تھکن کی وجہ سے ثناء جلد ہی سو گئی۔

اگلی صبح وہ خوشی خوشی تیار ہو کر دس دن بعد یونیورسٹی گئی۔ کیونکہ صباء کی موت کی وجہ سے وہ دس روز تک یونیورسٹی نہ جا سکی تھی۔ یونیورسٹی سے واپسی پر اسے ہمیشہ سہیل ڈراپ کرتا تھا۔ آج بھی حسب معمول سہیل اسے چھوڑ کر آگے بڑھا ہی تھا کہ اندر داخل ہوتی ہوئی ثناء کو پوسٹ مین نے ایک غیر ملکی خط دیا۔ ثناء حیران ہو کر سوچنے لگی کس کا ہو سکتا ہے پھر خط پر نظر پڑتے ہی وہ صباء کا نام دیکھ کر چونک پڑی۔ اس نے جلدی سے خط چاک کیا اور پڑھنے لگی اور جب پڑھ چکی تو اچانک صباء کی ڈائری یاد آ گئی وہ بھاگ کر کمرے میں آئی۔ دراز

کھول کر ڈائری نکالی اور بیڈ سے ٹیک لگا کر پڑھنے لگی۔ پہلے صفحے پر ایک خوبصورت قطعہ تھا۔

کچھ عشق تھا کچھ مجبوری تھی سو میں نے جیون ہار دیا
میں کیسا زندہ آدمی تھا اک شخص نے مجھ کو مار دیا
وہ عشق بہت ہی مشکل تھا آسان نہ تھا یوں جینا بھی
اس عشق نے زندہ رہنے کا مجھے درس دیا پندار دیا

ثناء جوں جوں ڈائری پڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد ہوتا گیا۔ سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگا تھا۔ اور پیشانی عرق آلود ہوتی جا رہی تھی۔

ڈائری پڑھ لینے کے بعد ثناء نے گھبرا کر جلدی سے ڈائری بند کی۔ وہ ملزم اور مجرم کا فیصلہ اتنی جلدی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر فیصلے کی گھڑی آ پہنچی تھی۔ ڈائری بند کرنے سے کیا حقیقت چھپ سکتی تھی۔ صباء نے جو زندگی گزاری تھی وہ تو آئینے کی طرح اس کے سامنے تھی۔

ثناء نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور ایک بار پھر ڈائری کھول کر بیٹھ گئی۔



کئی دنوں سے صباء پریشان سی تھی اور پریشانی بھی کوئی ایسی ویسی نہیں تھی خود اس کی پوری زندگی کا سوال تھا۔ اس کے مستقبل کا سوال تھا۔ وہ دوراہے پر کھڑی تھی مگر کوئی راستہ بھی سجھائی نہ دے رہا تھا۔ سارا دن سوچوں کی نذر ہوتا اس کے باوجود اس اہم مسئلے کا کوئی حل اس کی سمجھ میں نہ آتا۔

ادھر گھر میں آج کل لوگوں کی آمدورفت بڑھتی جا رہی تھی۔ ماں، باپ اس کی اور پروین کی شادی کی تیاریاں مکمل کر چکے تھے مگر روز نت نئے لوگوں کے آنے کے باوجود کوئی اچھا رشتہ نہ مل رہا تھا۔ وجہ ظاہر ہے جہیز ہی تھا۔

ان کی فیملی ماشاء اللہ بہت بڑی تھی۔ چھ بہنیں اور دو بھائی تھے۔ بڑی بہن زاہدہ تھی ان سے چھوٹے رضوان اور رضوان سے چھوٹی صباء، صباء سے چھوٹی پھر دو بہنیں تھیں پروین اور نسرین ان کے بعد بھائی عرفان اور آخر میں پھر دو بہنیں فرحت اور راحت۔

باپ کا اچھا خاصہ اپنا ذاتی کاروبار تھا مگر ان ہی دنوں جب بچے بڑے ہو رہے تھے۔ باپ بری صحبت کا شکار ہو گیا۔ گھر سے اسے برائے نام دلچسپی رہ گئی۔ ایسے میں ماں، باپ کا سارا غصہ بچوں پر نکالتی۔ ان کے باپ پر بھی چیختی چلاتی مگر کسی پر کچھ اثر نہ تھا۔ آخر جب

سب کچھ لٹا کر شوہر نے گھر کی راہ لی تو نہ صرف تہی دست تھا بلکہ بیمار اور معذور بھی۔ پل پل ساتھ دینے والے دوست منہ موڑ گئے تھے۔ گھر میں بیماری کے ساتھ ساتھ غربت نے بھی ڈیرے جما لیے۔ رضوان ابھی اس قابل نہ تھا کہ کاروبار سنبھالتا۔ سب کام ختم ہو گیا۔ ان حالات میں جیسے تیسے کر کے بڑی بیٹی کی شادی کر کے خود کو ایک بوجھ سے ہلکا کیا اور خود محنت مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلانے لگی۔ جبکہ شوہر معذور ہو کر ایسا اندر آ بیٹھا کہ پھر باہر جانے کی کوشش ہی نہ کی۔

وقت یونہی گزرنے لگا۔ قسمت ایک بار پھر ان کے گھر پر مہربان ہوئی اور رضوان کسی نہ کسی طرح باہر کا ویزا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پھر ان کی محنت سے گھر میں ایک بار پھر خوشحالی آ گئی۔

گھر کے حالات اچھے ہوتے ہی ماں صباء اور پروین کے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتی تھی۔ اس کے بعد ان کا خیال تھا کہ رضوان باہر سے آ جائے تو اس کے ساتھ نسرین کی شادی ہو جائے۔ باقی عرفان اور دو چھوٹی بہنیں رہ جاتیں۔

مگر بہت تلاش کے باوجود کوئی اچھا رشتہ نہ مل رہا تھا۔ ادھر رضوان تھا کہ اپنے ہر خط میں لکھتا۔ ''امی آخر اب کس بات کی کمی ہے اب دیر کیوں کر رہے ہیں آپ لوگ؟ جلدی سے شادیاں کر دیجیے۔'' باپ نے جب بار بار خط میں یہ بات پڑھی تو بولا۔

''چاہے کسی مزدور سے ہی نکاح پڑھا دو مگر جلدی کرو، ایسا نہ ہو کہ تمہاری ان بیٹیوں کی وجہ سے وہ پیسے بھیجنا ہی بند کر دے۔ عرفان تو ابھی پڑھ رہا ہے اب تو سب کچھ رضوان پر ہے اور ایک تم ہو کہ شہزادوں کو ڈھونڈ رہی ہو۔ ختم کرو اس قصے کو۔''

حالات ایسے ہوں تو ہر شخص خود غرض بن جاتا ہے۔ صرف ماں، ماں رہتی ہے۔

''تمہیں بیچ میں بولنے کی ضرورت نہیں۔'' زبیدہ کو غصہ آ گیا۔ ''سب کچھ لٹا کر اب گھر بیٹھ گئے ہو۔ میری سگی بیٹیاں ہیں۔ جب اچھا رشتہ ملے گا تب شادی کروں گی۔ بے شک تم باپ، بیٹے جو کچھ چاہو کہتے رہو مجھ پر کچھ اثر نہ ہو گا۔''

''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو زبیدہ! لڑکیاں تو اپنے گھروں کی ہو جائیں گی اور میں اب کسی قابل نہیں۔ عرفان چھوٹا ہے، ہمیں رضوان ہی کو سنبھالنا ہے۔ بیٹا کما رہا ہو تو اس کی بات ماننی پڑتی ہے۔ اسی لیے تم سے کہتا ہوں جو کام بھی کرو سوچ سمجھ کر کرو۔''

"اچھا، اچھا..... ٹھیک ہے سوچ لوں گی۔" زبیدہ نے کہا اور پروین کو آوازیں دینے لگی۔

گھر کی یہ پریشانیاں کیا کم تھیں کہ ایک نئی پریشانی صباء پر نازل ہوگئی تھی۔ آفاق تھے کہ روز ملنے پر زور دے رہے تھے مگر وہ مسلسل انکار کر رہی تھی۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ آفاق کیا کہنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کی ہر اَن کہی بات کو سمجھ لیتی تھی مگر آفاق اس کی مجبوری نہیں سمجھ پا رہے تھے۔ اور سب سے بڑی مشکل تو یہ تھی کہ اگر وہ یہ بات اپنے ماں، باپ سے کرتی تو ان کا ردعمل کچھ اچھا نہ ہوتا۔ اپنے انجام کے بارے میں اگرچہ صباء شروع ہی سے جانتی تھی۔ مگر اس کے باوجود نہ جانے کیوں وہ اس راستے پر چلتی چلی گئی تھی۔ بغیر کسی خوف کے، صرف ایک امید کے سہارے۔ کیونکہ دنیا امید پر قائم ہے اور اسی تصور کے سہارے وہ اکثر سوچتی، ہوسکتا ہے امی ابو مان ہی جائیں۔ مگر اس وقت گھر کا جو نقشہ تھا اس میں کسی طرح یہ بات فٹ نہ ہو رہی تھی اور وقت تھا کہ گزرے جا رہا تھا۔

نہ جانے کیوں صباء کو بغیر بات کیے ہی یقین تھا کہ اگر اس نے آفاق کے بارے میں ماں سے بات کی تو وہ کبھی رضامند نہ ہوں گی بلکہ الٹا یہ ہوگا ان حالات میں جلدی سے جیسا بھی اچھا برا رشتہ ملے گا وہ صباء کی شادی کر دیں گی۔ صباء کو ان کی پسند کی شادی کر لینے میں بھی اعتراض نہ ہوتا۔ اگر درمیان آفاق نہ آ گئے ہوتے۔ کچھ حادثے گو کہ بالکل اچانک ہوتے ہیں۔ مگر عمر بھر کے لیے ذہن پر چھا جاتے ہیں۔ صباء سوچتی اگر میں نے شادی کر لی تو آفاق مجھے بے وفا کہیں گے جبکہ شادی کر کے خود مجھے بھی آفاق کے بغیر سکون نہیں ملے گا۔

دوسری پریشانی چھوٹی تین بہنیں تھیں جو اس کی شادی کے بعد بھابی کے رحم و کرم پر رہ جاتیں۔ ماں باپ پہلے ہی لڑکیوں سے بے زار بیٹھے تھے اور چھوٹا بھائی ابھی پڑھ رہا تھا۔

صباء دن رات ان ہی سوچوں میں گم رہنے لگی تھی۔ مگر کوئی حل، کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

آخر بہت دن سوچنے کے بعد اسے فی الحال یہی فیصلہ مناسب لگا کہ اس وقت شادی سے انکار کر دے اور اس کے انکار پر پروین کے ساتھ نسرین کی شادی کر دی جائے۔ نسرین کو گوٹہ کناری کے کپڑے پہننے کا شوق بھی بہت تھا اور پھر شادی کے لائق بھی ہوگئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" صباء نے سوچا۔ "میں امی سے کہہ دوں گی۔ مگر...... مگر...... آفاق، وہ بے چین سی ہوگئی۔ ان کو کیا جواب دوں گی۔ ان کو کیسے سمجھا پاؤں گی اور کیا میں یونہی ساری

زندگی بھائی کے در پر بیٹھی رہوں گی؟ لیکن اگر میں نے شادی کر لی تو ایک طرف اگر آفاق ہیں تو دوسری طرف چھوٹی بہنیں۔ فری اور راہی کو تو بھابی نوکر بنا کر رکھے گی اور ان بچیوں کا کیا قصور ہے اور پھر یہ ضروری تو نہیں کہ نسرین کی شادی رضوان بھائی جان کے ساتھ ہی ہو جائے، ہوسکتا ہے بھائی جان انکار کر دیں کہ میرے پاس ابھی اتنے وسائل نہیں، مجھے شادی نہیں کرنی چاہیے۔ یہی ٹھیک رہے گا کہ میں شادی سے انکار کر دوں۔" اس نے فیصلہ کیا اور پُرسکون ہوگئی۔

مگر یہ دن کا فیصلہ تھا۔ رات ہوئی تو صباء نے سوچا یہ کیا حماقت ہے، شادی ہو یا نہ ہو کیا میں آفاق کے بغیر رہ سکتی ہوں۔ دوسروں کے لیے میں خواہ مخواہ اپنی ساری زندگی برباد کر لوں، میں بجائے امی کے زاہدہ باجی سے بات کروں گی۔ بھلا یہ بھی کوئی تک ہے میں ان سب کے لیے اپنی پوری زندگی خراب کر کے بیٹھ جاؤں، البتہ ہوسکتا ہے یہ لوگ پروین اور نسرین کی شادی دھوم دھام سے کر دیں اور میرا سادگی سے نکاح کر دیں۔ مجھے جہیز وغیرہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آفاق کے پاس خدا کا دیا سب کچھ موجود ہے اور پھر آفاق خود بھی تو جہیز کو پسند نہیں کرتے۔ ہاں یہ صحیح ہے میں باجی سے بات کروں گی۔

اگلے روز جب زاہدہ باجی آئیں تو وہ ان کو اکیلے دیکھ کر ان کے قریب جا بیٹھی۔

"باجی! ایک بات کہوں؟" صباء نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں بھئی کہو، کیا بات ہے؟" باجی نے آہستہ سے کہا۔

"وہ باجی، آپ پروین اور نسرین کی شادی کر دیجیے۔" صباء نے جلدی سے بات مکمل کر کے منہ بند کر لیا۔

"اور تمہاری شادی؟" زاہدہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

صباء کی سمجھ میں نہ آیا۔ ان کے سامنے اپنے نکاح کی بات کیسے کرے مگر بات تو بہرحال کرنی تھی۔

"میرا صرف نکاح کر کے رخصت کر دیجیے۔" صباء نے جھجکتے اور شرماتے ہوئے بات مکمل کی۔ اتنے میں زبیدہ جو کہ قریب آ چکی تھی اس نے بھی یہ بات سن لی اور بولی۔

"اے لو، جہیز کے بغیر کہاں رشتہ ملے گا۔ لوگوں کی تو عادت ہوگئی ہے۔ جہیز کو پہلے دیکھتے ہیں لڑکی کو بعد میں۔"

''ہاں یہ تو ہے۔لوگوں کو خدا کا ڈر بھی نہیں رہا۔امی، صباء کو کیا معلوم تین کپڑوں میں نکاح پڑھا کر جانے والی لڑکیوں کا سسرال میں کیا انجام ہوتا ہے۔''

''اور امی اگر اس کے باوجود کوئی ایسا اچھا رشتہ مل جائے تو؟'' صباء نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

ماں نے بغور اسے دیکھا کچھ سمجھنے کی کوشش کی پھر خشک لہجے میں بولیں۔ بالفرض مل بھی جائے تب بھی ہم کون سی ہاں کرنے والے ہیں۔ہمیں محلے اور برادری کا بھی تو منہ دیکھنا ہے۔لوگ کیا کہیں گے۔ بیٹا باہر کما رہا ہے اور بیٹی کا صرف نکاح کر دیا۔نہیں یہ ہرگز نہیں ہو گا مگر تم...... تم ایسی باتیں کیوں کر رہی ہو۔کیا تمہاری نظروں میں ایسا کوئی امیدوار ہے۔کیا تم اپنے خاندان کے رسم و رواج کو نہیں جانتیں۔تمہاری شادی کا مسئلہ ہمارا مسئلہ ہے۔تمہیں بیچ میں بولنے کی ضرورت نہیں۔تم اپنے کمرے میں جاؤ میں جو پسند کروں گی وہی ہو گا۔''

''جی بہتر امی۔'' صباء نے کہا اور خاموشی سے اٹھ گئی۔تاہم اپنے پیچھے اس نے ماں کی تیز آواز سنی۔

''یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔نسرین کی شادی رضوان کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ رضوان کا خیال ہے صباء اور پروین کی شادی کے بعد اس ٹوٹے پھوٹے گھر کو پھر سے بنائیں۔''

''مگر امی مکان بنانا اتنا ضروری تو نہیں، ٹھیک ٹھاک ہے۔دیکھیں امی! بہو آنے سے پہلے جتنی بیٹیاں بھی اپنے گھر کی ہو جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔'' زاہدہ نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ کہاں سمجھنے والی تھی۔ ماتھے پر بل ڈال کر بولیں۔

''کیا تم یہ چاہتی ہو میری بہو ایسے اجڑے مکان میں آئے؟ نسرین کی شادی بے شک بعد میں ہو مگر یہ مکان پہلے بنے گا۔'' یہ سب باتیں سن کر صباء ایک بار پھر پریشان ہو گئی کہ اچانک فرحت نے آواز دی۔

''صباء باجی! آپ کی سہیلی کا فون ہے۔'' صباء گھبرا گئی یقیناً فون آفاق نے کیا ہو گا اور وہی نکلا۔

''آپ نے فون کیوں کیا ہے؟'' صباء نے بگڑ کر پوچھا۔

''بھئی کیا کرتا تم جو ملنے نہیں آ رہی ہو؟ کیا وجہ ہے؟ یہ تم نے خود کو گھر میں کیوں بند کر لیا؟ تمہیں معلوم ہے میں جاب کے سلسلے میں باہر جا رہا ہوں۔''

''جی معلوم ہے۔'' صباء نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اور پھر یہ بھی معلوم ہو گا کہ میں تمہیں ساتھ لے جانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے مجھے شادی کرنی ہو گی۔ایک تم ہو کہ ہاتھ نہیں آ رہیں۔'' آفاق کے لہجے میں شوخی تھی۔

''پلیز آفاق! میں ابھی آپ سے نہیں مل سکتی۔'' صباء کے لہجے میں بے رخی تھی۔

''کچھ وضاحت بھی تو کرو۔'' آفاق نے جھلا کر پوچھا۔

''کچھ فیصلہ کروں گی تو وضاحت بھی کروں گی۔'' صباء نے مدھم لہجے میں کہا۔ کیونکہ ماں سے ہونے والی بات چیت کے بعد وہ ایک بار پھر سوچوں میں گھر گئی تھی۔

''کیا فیصلہ صباء؟'' آفاق نے اس کے لہجے کی بے چینی محسوس کرتے ہوئے جلدی سے پوچھا۔

''جب فیصلہ کر لوں گی تو آپ کو بھی بتا دوں گی مگر پلیز اس دوران میں مجھے فون نہ کرنا۔'' پھر آفاق ''ارے ارے'' کرتا رہ گیا مگر صباء نے فون بند کر دیا۔

پھر تین ماہ اس فیصلے کی نذر ہو گئے۔وہ خود سے لڑ لڑ کر نڈھال ہو چکی تھی۔صبح کو فیصلہ کرتی ''شادی نہیں کروں گی'' مگر رات کی تاریکیاں جب اسے ڈراتیں تو وہ گھبرا جاتی۔فوراً فیصلہ بدل دیتی، لیکن کب تک؟ دیر یا سویر، یہ فیصلہ تو اسے کرنا ہی تھا۔آخر یہ سوچ کر کہ اس کے بدلے کتنی زندگیاں آرام پائیں گی۔اس نے فیصلہ کیا۔وہ شادی نہیں کرے گی۔ہاں یہ ہوسکتا ہے۔اگر بھابی اچھی ملی اور قسمت نے بھی اس کا کچھ ساتھ دیا تو وہ ان سے آفاق کے بارے میں ضرور بات کرے گی اور پھر ہو سکتا ہے میرے اور آفاق کے درمیان کے فاصلے مٹ جائیں۔

اس فیصلے کو آخری شکل دیتے ہی اس نے گھر میں اعلان کر دیا کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔

''مگر شادی نہ کرنے کی وجہ۔'' ماں نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''بس ماں ایک چیز کے لیے میرا دل نہیں مانتا تو آپ کیوں زور دیتی ہیں۔''

''مگر دل کیوں نہیں مانتا اور پھر تم دنیا سے نرالی تو نہیں، تمہاری شادی ضرور ہو گی۔''

''نہیں...... میں شادی ہرگز نہیں کروں گی۔میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔''

''ارے تمہاری عمر کیا، تمہاری سوچ کیا۔'' زاہدہ باجی اسے ڈانٹنے لگیں۔''ارے یہ دو چار سال کی بات تھوڑی ہے۔تمہاری پوری زندگی کا سوال ہے۔ بھائیوں پر مان مت کرو۔

شادی کے بعد سب اپنے بیوی بچوں کا سوچتے ہیں اور بھابیوں کو تو ایک ایک بات کی چبھن کئی کئی دن تک محسوس ہوتی ہے۔ تمہاری عمر ہی کیا ہے تم کیا جانوں ان باتوں کو۔'' سب نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر چونکہ صباء جانتی تھی۔ فی الحال یہی فیصلہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ سو وہ مضبوطی سے اس پر قائم رہی۔ گھر میں ہر روز اس موضوع پر بات چیت ہوتی اور صباء چپ چاپ ایک کونے میں پڑی سنتی رہتی۔ آخر تھک ہار کر سب گھر والے چپ ہو گئے تو وہ آفاق سے ملنے چلی آئی۔

لارنس گارڈن کے خوبصورت اور پُرسکون گوشے میں بیٹھی وہ آفاق کی باتیں سن رہی تھی۔ اپنا فیصلہ تو اس نے آتے ہی آفاق کو سنا دیا تھا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر آفاق کے قرب میں اس کی باتیں سننے لگی تو وہ فیصلہ ریت کے گھروندے کی طرح ڈھل جائے گا۔ جو اس نے تین ماہ لگا کر کیا تھا اور آفاق اس کی بات کو محض مذاق ہی سمجھتے تھے جبکہ وہ سنجیدہ تھی۔

''آخر تم نے کیا سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے؟ اور پھر اکیلے ہی اکیلے تم نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا۔ کیا میری اپنی کوئی سوچ نہیں تھی۔ میرا کوئی دخل نہیں تھا، تمہاری زندگی میں جو فیصلہ کرتے وقت تم مجھ سے پوچھتیں۔ صباء! یہ فیصلہ غلط ہے۔ اس کی کوئی...... اہمیت نہیں کیونکہ میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔ صباء پلیز سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تمہارے علاوہ کسی سے شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ محض ڈائیلاگ نہیں حقیقت ہے۔'' آفاق نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''مجھے یقین ہے، ایسا نہیں ہوگا۔'' صباء نے پُرسکون لہجے میں کہا حالانکہ اندر سے دل اتھل پتھل ہونے لگا تھا۔

''وجہ؟'' آفاق نے گھور کر اسے دیکھا۔

''آفاق! آپ سمجھتے کیوں نہیں، یہ محبت تو بس ایسے ہی فضول چیز ہے۔ محض محبت کے لیے خود کو ضائع کرنا حماقت ہے۔ محبت سے ہٹ کر بھی کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ بھی محبت جیسی فضول چیز میں خود کو ضائع نہ کریں۔'' صباء نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا یہ اور بات تھی کہ وہ خود بھی اندر سے ٹوٹ کے بکھر رہی تھی۔

''محبت فضول چیز ہے، یہ تم پہلے نہیں جانتی تھیں؟'' آفاق نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''نہیں...... مگر آپ نے کچھ اس انداز میں محبت کی تھی کہ میں بھی اس نشے میں ڈوبتی چلی گئی۔ مگر اب ایسی کوئی بات نہیں۔'' صباء نے آنکھوں میں آئی نمی کو چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔

''کی تھی۔'' آفاق نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''تھی سے تمہارا کیا مطلب ہے ارے پگلی! میں تو اب بھی تم سے محبت کرتا ہوں اور آخری سانس تک کروں گا۔''

''پلیز آفاق! ایسا مت کہیے۔ میں نے کہا نا میں آپ سے شادی نہیں کر سکتی۔ یہ میری مجبوری ہے۔''

''کیا مجبوری ہے تمہیں، مجھے نہیں بتاؤ گی میں بھی تو تمہارا اپنا ہوں۔''

''مجھے افسوس ہے میں اپنی مجبوری کی وضاحت نہیں کر سکتی اور آپ بھی اب اس قصے کو ختم کر دیں آپ باہر تو جا ہی رہے ہیں مجھے سو فیصد یقین ہے۔ آپ کچھ عرصہ بعد نارمل ہو جائیں گے اور...... اور شادی بھی کر لیں گے۔''

آفاق نے دکھ سے اسے دیکھا اور بھرائے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''تمہیں سو فیصد یقین ہے کہ میں تمہیں بھول جاؤں گا۔ یعنی میری محبت اس قابل نہ تھی۔ اس میں اتنا اثر بھی نہیں تھا کہ تمہیں اس بات کا یقین ہوتا کہ میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں یہ کتنے دکھ کی بات ہے۔ صباء! محبت کچھ لوگوں کے نزدیک وقت گزاری کا ذریعہ ہوتی ہے۔'' انہوں نے رک کر غور سے صباء کو دیکھا۔ ''اور کچھ لوگوں کی زندگی کا مفہوم اور مقصد حیات ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے تم نے وقتی طور پر دل لگی کی ہو حالانکہ میرا دل اس بات کو تسلیم نہیں کرتا لیکن صباء میرا کیا قصور ہے میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا۔ میں تو تم سے محبت کرتا ہوں تم میری زندگی کا لازمی جزو ہو، میری حیات کا حاصل ہو، جب سے تم ملی ہوء رے اندر باہر تو تم ہی تم ہو اور تم کہتی ہو میں تمہیں بھول جاؤں گا۔''

''میں نے ٹھیک کہا ہے۔'' صباء نے کمزور سی آواز میں کہا۔ حالانکہ دل تڑپ تڑپ کر اس کی ہر بات کی نفی کر رہا تھا۔

''اور اگر نہ بھول سکا تو؟''

''تو مجھے اپنا منتظر پاؤ گے۔'' بے ساختہ صباء کے منہ سے نکلا اور پھر وہ کھڑی ہو گئی

کیونکہ وہ جانتی تھی اب اگر مزید آفاق کے سامنے رہی تو وہ فیصلہ جو تین مہینے کی کشمکش کے بعد ہوا ہے۔ وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ بھلا دنیا میں کوئی ایسا بھی ہوگا جو اپنی خوشیوں کو خود اپنے ہاتھوں ٹھکرا دے۔ اس نے آخری نظر آفاق پر ڈالتے ہوئے، جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

آفاق نے سر اٹھا کر اسے دیکھا مگر روکا نہیں۔

اور وہ جو اس کے سامنے چٹان بنی بیٹھی رہی تھی۔ گھر آتے ہی تکیے میں منہ دے کر رونے لگی۔ منزل سامنے ہوتے ہوئے بھی دور ہو گئی تھی اور اب مستقبل اس کی آنے والی بھابی کے ہاتھ میں تھا۔ اگر یونہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جاتا تو پھر وہ آفاق کو خط لکھتی اب لوٹ آؤ آفاق! اب ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں لیکن یہ ابھی دو سال بعد کی بات تھی۔

پھر آفاق اسے ملے بغیر فرانس چلے گئے اور وہ سوچتی رہ گئی۔ ''کیا اب کبھی ہماری ملاقات ہو سکے گی؟ یا وہی ملاقات آخری ملاقات بن جائے گی۔'' وہ سوچتی میں نے اچھا کیا جو آفاق کو کسی امید میں گرفتار نہیں کیا۔ خواہ مخواہ میرے ساتھ اس کی زندگی بھی برباد ہوتی اب اچھا ہے وہ مجھے بے وفا ہی سمجھے۔ اس طرح وہ نارمل ہو جائے گا اور پھر وہ شادی بھی کر لے گا۔

وہ چپ ہو کر اپنی تنہائی کے بارے میں سوچنے لگی۔

آفاق کے جانے کے تقریباً تین ماہ بعد ہی پروین اور نسرین کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ پروین کے میاں فوج میں کیپٹن تھے جبکہ نسرین کے میاں کا اپنا بزنس تھا۔ دونوں بہنیں اپنے گھر ٹھیک ٹھاک تھیں اور باہر شاید بھائی بھی پُرسکون ہو گئے تھے۔ پُرسکون تو صباء بھی تھی۔ شادی اگر آفاق سے نہ ہوئی تھی تو کسی اور سے بھی نہیں۔ گویا وہ آج بھی آفاق کی امانت تھی۔ اس کی محبت تھی۔ اور یہی بات اسے سکون بخشتی تھی۔

وقت اپنی مخصوص چال چلتے ہوئے گزرنے لگا۔

گھر میں بھائی کے لیے لڑکی کی تلاش شروع ہو گئی تھی اور گھر بھی نئے سرے سے بننا شروع ہو گیا تھا۔ سب گھر والوں کا سارا دن مصروف گزرتا۔ دن تو انہی مصروفیات میں گزر جاتا۔ مگر رات آفاق کو اپنے ساتھ لیے دھرتی پر اترتی اور صباء کروٹ بدل بدل کر اس کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی۔ مگر اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہو پاتی۔

آفاق کو فرانس گئے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔ مگر اس نے بھی خط لکھنا گوارہ نہ کیا۔

صباء اکثر سوچتی۔ ''کیا واقعی وہ مجھے بھول چکے ہیں؟ میں نے کون سا یاد رکھنے والا سلوک ان

کے ساتھ کیا تھا۔ جو وہ مجھے یاد کرتا۔'' وہ دکھ سے سوچتی۔ ''شاید وہ سچ مچ مجھے بے وفا سمجھتا ہے۔ مگر وہ کیا جانے میں یہ فیصلہ کرتے وقت کتنی بار بے موت مری تھی۔''

انہی سوچوں میں رات گزر جاتی۔

پرانے گھر کی جگہ جدید طرز کا خوبصورت گھر بن چکا تھا اور بھائی کے لیے لڑکی بھی پسند کی جا چکی تھی۔ ادھر پروین اور نسرین بھی اپنے اپنے گھروں میں خوشگوار زندگی بسر کر رہی تھیں۔ ان کو خوش دیکھ کر صباء خود بھی خوش ہو جاتی۔

اور پھر اچانک ایک دن پروین کا فون آیا کہ صباء کو فوراً بھیج دیں۔ کیونکہ اس کے ہاں ڈلیوری ہونے والی تھی۔ صباء یا اس کے گھر والوں کو بھلا کیا اعتراض تھا...... بغیر کسی پس و پیش کے صباء اسلام آباد چلی آئی۔ بہن اور بہنوئی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

صباء کے آنے کے کچھ دن بعد ہی پروین نے ہسپتال میں ایک خوبصورت صحت مند بچے کو جنم دیا۔ پروین کے میاں اس وقت موجود نہ تھے۔ پروین کو ہسپتال چھوڑ کر وہ ضروری کام سے گئے تھے۔ صباء نے ان کو فون کیا اور خود بہن کے پاس آ گئی اور جب سسٹر نے پوچھا آپ بچے کا نام کیا رکھیں گی تو صباء جو پہلے ہی گھر سے نام سوچ کر چلی تھی۔ فوراً بولی ''شاہ زیب'' پروین نام سن کر مسکرا دی کچھ دیر بعد ہی انوار بھائی آ گئے ڈاکٹر نے ان کو مبارک باد دی تو وہ جھک کر بیٹے کو دیکھنے لگے اور صباء کچھ سوچ کر باہر آ گئی۔ تاہم باہر نکلتے نکلتے اس نے سنا۔ انوار کہہ رہے تھے۔

''نہیں پروین اپنے بچے کا نام میں خود رکھوں گا۔ میں نے تمہیں بتایا بھی تھا عمر فاروق۔''

''مگر اب تو صباء نام رکھ چکی ہے۔'' پروین نے احتجاج کیا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' انوار کے لہجے میں لاپرواہی تھی۔ ''نام بہرحال عمر فاروق ہی رہے گا۔''

''مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اس کا رکھا ہوا نام پسند نہیں کریں گے تو صباء کو کبھی یہاں نہ بلاتی۔ اب میں اس سے کیا کہوں گی اور پھر وہ کیا سوچے گی کہ میرا بچے پر کیا اتنا بھی حق نہیں تھا۔'' پروین افسردہ ہو گئی تھی۔

''یہ میں نے کب کہا لیکن جو حق میرا یا تمہارا ہے وہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ جتنی محبت ہم اپنے بچے سے کر سکتے ہیں کوئی دوسرا نہیں کر سکتا اور جتنی محبت ہمارا بچہ ہم سے کرے گا اتنی

کسی اور سے نہیں۔ باقی رہا یہاں صباء کو بلانے کا سوال تو میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا۔ میں نرس کا انتظام کرلوں گا تم خود ہی نہیں مانیں۔'' وہ ایک بار پھر جھک کر اپنے بیٹے کو دیکھنے لگے۔ گول مٹول سا خوبصورت صحت مند بچہ جسے پا کر ان کے اندر ایک نیا احساس جاگا تھا۔

''آپ کتنے خشک لہجے میں باتیں کر رہے ہیں۔ آپ کو میرا بھی خیال نہیں۔'' پروین نے خفگی سے کہا۔

''سوری پروین، مجھے تمہارے جذبات کا احساس ہے۔'' وہ اسے خفا دیکھ کر نرمی سے بولے۔ ''مگر یہ بھی تو سوچو یہ میرا پہلا بچہ ہے۔''

''ہاں بچہ تو صرف آپ کا ہے۔ میں تو کچھ نہیں لگتی اس کی۔'' پروین نے ناراضگی سے کہا تو انوار مسکرا کر بولے۔

''اچھا تو میں اس طرح کہتا ہوں یہ پہلا بچہ ہے۔ صباء کو اگر نام رکھنے کا بہت شوق ہے تو دوسرے بچے کا نام وہ رکھ لے۔''

صباء نے مزید کچھ نہ سنا۔ بھاگتی ہوئی راہداری میں آ گئی اور شرمندگی سے سوچنے لگی۔

''میں نے خواہ مخواہ جلد بازی میں نام رکھنے کی غلطی کی۔ میں نام رکھوں گی اپنے بھائی کے بچوں کا میں کیوں بہن کے بچے کا نام رکھنے لگی۔''

اگرچہ وہ دو ماہ وہاں رہی مگر مجبوری سے، ورنہ دل تو بار بار کہتا اپنے گھر بھاگ چلو حالانکہ اس کی دلجوئی کی خاطر پروین نے کہا بھی تھا۔

''صباء! یہ نام ان کی مرحومہ والدہ نے رکھا تھا۔ اسی لیے انہوں نے رکھ دیا۔ تم برا محسوس مت کرنا۔ انوار کہتے تھے۔ دوسرے بچے کا نام تم ہی رکھنا۔''

''چھوڑو پروین!'' صباء اس کی خاطر مسکرا کر بولی۔ ''نام کا کوئی مسئلہ نہیں، مجھے تو عمر فاروق بہت اچھا لگا ہے۔'' اور یہ سن کر صباء کو برا محسوس نہیں ہوا پروین بھی خوش ہوگئی۔ تاہم صباء کے لیے یہ پہلی توہین اور پہلی چوٹ تھی۔ جس کو اس نے پوری شدت سے محسوس کیا تھا مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ ایک چوٹ تو کیا اب، دنیا میں اس کے لیے چوٹیں ہی چوٹیں تھیں۔

دو ماہ جیسے تیسے گزار کر وہ واپس اپنے گھر آ گئی۔ جہاں اک عجیب سا سکون تھا۔

وقت تیزی سے گزر گیا۔ رضوان بھائی شادی کے لیے چھٹی لے کر پاکستان آ گئے۔ باری باری سب بھائی بہنوں سے ملے، مگر جب صباء کو دیکھا تو نہ جانے کیوں اندر ہی اندر

اک عجیب سی ہلچل اور ہمدردی کا جذبہ محسوس کیا۔ مگر بظاہر چپ رہے، یہ دیر تک نہیں پوچھا۔

''آپ نے صباء کی بجائے چھوٹی بہن کی شادی کیوں کی اور اگر صباء کی شادی پہلے نہیں کی تو کم از کم میری شادی کے ساتھ ہی طے کر دی ہوتی۔''

مگر انہوں نے کچھ نہ پوچھا۔ ایک تو اس لیے کہ صباء کی نہیں تو نہ سہی ان کی اپنی شادی تو ہو رہی تھی۔ دوسرے ان کے پاس اب صباء کی شادی کے لیے دو لاکھ کی رقم بھی نہیں تھی۔ تاہم یہ ہو سکتا تھا کہ وہ خود شادی نہ کرتے اور صباء کی ہو جاتی مگر وہ مجبور تھے کیونکہ باہر سب دوست یہی کہتے تھے۔ ''یاد رکھو تمہارے ماں باپ آخری بیٹی سے فارغ ہو کر ہی تمہاری شادی کریں گے۔ جب بھی کسی خاندان کا بیٹا باہر سے آتا ہے۔ ماں، باپ اسے پیسوں کی مشین سمجھ کر نظر انداز کرتے ہوئے صرف دوسرے بچوں کا سوچتے ہیں۔ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو گا۔'' لیکن ان کے ساتھ نہیں ہوا تھا۔ اپنی شادی کی خبر پڑھ کر وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ دوستوں نے نہ صرف ان کو مبارک باد دی تھی بلکہ ساتھ حیرت کا اظہار بھی کیا تھا۔

وہ اپنی نئی خوبصورت زندگی کے سپنے دیکھتے ہوئے پاکستان آئے تھے۔ مگر صباء کو دیکھ کر یہ خوشی ماند پڑ گئی تھی۔ وہ ذرا سے نارمل ہوتے مگر جیسے ہی صباء کو دیکھتے تو خوشی پر اوس سی پڑ جاتی۔ تاہم چند دن بعد یہ پریشانی ختم ہو گئی۔ زاہدہ پروین اور نسرین شادی سے دو ہفتے قبل ہی آ گئی تھیں۔ ان کے آنے سے گھر میں ایک ہنگامہ سا ہو گیا تھا اور اس ہنگامے میں صباء بھی شامل تھی۔

وہ سارا دن ہنس ہنس کر باتیں بھی کیے جاتی اور کام بھی اور جب کام سے فارغ ہوتی تو عمر فاروق کو لے کر بیٹھ جاتی، ایسے میں وہ بالکل نارمل ہی لگتی۔ اس کی کسی بھی حرکت سے یہ نہیں لگتا تھا کہ وہ خود بھی کچھ چاہتی ہو یوں رضوان، صباء کو بھول کر اپنی خوشیوں میں مگن ہو گئے۔

شادی کے ہنگامے اگرچہ مدھم پڑ چکے تھے اور بچے کھچے اکا دکا مہمان بھی رخصت ہو چکے تھے پھر بھی گھر میں ہر دم ایک عجیب سی خوشی اور ہنگامہ سا رہتا۔ پھر بھائی، بھابی ہنی مون کے لیے سوات چلے گئے اور صباء سوچنے لگی، بھابی تو واقعی قسمت سے بہت اچھی ملی ہے۔ وہ جیسے ہی ہنی مون ٹرپ سے واپس آئیں گی۔ میں ان سے آفاق کے بارے میں بات کروں

گی۔ بھابی یقیناً اس سلسلے میں میری مدد کریں گی اور آفاق اچانک یہ خبر سن کر کتنے خوش ہوں گے۔ صباء کو بے اختیار آخری ملاقات یاد آ گئی جب وہ حیرت اور غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ صباء کو گھور رہے تھے اور صباء ان کی حالت کو نظر انداز کرتی ہوئی چلی آئی تھی۔ نہ انہوں نے صباء کو رکنے کو کہا تھا اور نہ صباء خود رکی تھی۔

''باجی! آپ کیا سوچ رہی ہیں؟'' فری کی آواز سن کر صباء چونک پڑی۔

''کیوں کیا بات ہے؟'' صباء نے تلخی سے پوچھا۔ اسے فری کی آمد اس وقت سخت ناگوار گزری تھی کیونکہ وہ اس وقت آفاق کے تصور میں گم تھی۔

''باجی! بھیا، بھابی آ گئے ہیں۔'' فری نے بتایا تو وہ جلدی سے سب کچھ بھول بھال کر خوشی سے باہر بھاگی۔ بھیا ماں کے پاس بیٹھے نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے اور بھابی ہنس ہنس کر سب کی خیریت دریافت کر رہی تھیں۔ صباء کو دیکھتے ہی بولیں۔

''کیسی ہو صباء؟''

''جی بھابی جان! اچھی ہوں۔'' صباء نے بغور انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ خوبصورت تو وہ پہلے ہی بہت تھیں مگر ان دو ماہ میں وہ اور بھی نکھر گئی تھیں۔

''اچھا......'' بھابی مسکرائی۔ ''نظر مت لگا دینا۔'' پتہ نہیں انہوں نے مذاق میں کہا تھا یا حقیقت میں صباء سمجھ نہ سکی تھی۔

''ارے فری، راحی تم کھڑی کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ بھابی اور بھیا کے لیے کرسیاں لے آؤ اور صباء تم۔'' ماں نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''تمہیں عقل کب آئے گی۔ کیا ہر بات تمہیں کہہ کر ہی سمجھانی پڑے گی؟ خود دکھائی نہیں دیتا۔''

''کیا......؟'' صباء نے حیران ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اری کمبخت، چائے کے لیے پانی ہی رکھ دو۔'' ماں نے ڈانٹا تو صباء منہ بنا کر کچن میں چلی گئی۔

چائے لے کر آئی تو بھابی سب کو وہاں اتاری گئی نہ صرف تصویریں دکھا رہی تھیں بلکہ ساتھ قینچی کی طرح زبان بھی چلا رہی تھیں۔ ''یہ فلاں جگہ کی ہے، یہ فلاں مقام ہے، صباء بھی چائے رکھ کر شوق سے تصویریں دیکھنے لگی۔

اگلے روز فری اور راحی سکول چلی گئیں تو صباء گھر کے کام کاج میں جت گئی۔ کام کاج

سے فارغ ہو کر وہ منہ ہاتھ دھوتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ آج ضرور بھابی سے آفاق کے بارے میں بات کروں گی۔ مگر بات کا آغاز کس طرح کروں گی وہ سوچنے لگی پھر وہ تولیے سے منہ صاف کر رہی تھی جب ماں کی آواز سنائی دی۔

''صباء! تم جلدی سے جانے کی تیاری کرو۔''

''کہاں؟'' صباء نے حیران ہو کر ماں کو دیکھا؟ اتنے میں بھابی اندر سے چلی آئیں۔

''ارے بھئی صباء! انوار کا فون آیا ہے۔ پروین کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان لوگوں نے تمہیں بلایا ہے۔ جلدی کرو، عرفان تمہیں چھوڑ آئے گا۔''

اگرچہ صباء کو عمر کی پیدائش پر جانے کا تلخ تجربہ یاد تھا مگر اس نے ان لوگوں سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے چپ چاپ اپنے کمرے کا رخ کیا۔ دل وہاں جانے کے لیے رضامند نہیں تھا۔ مگر محض بہن کی وجہ سے اسے جانا ہی پڑا۔

جس دن صباء آئی تھی۔ اس رات پروین نے ایک مردہ بچے کو جنم دیا تھا۔ ڈاکٹر نے نہ صرف مردہ بچے کی خبر دی تھی بلکہ ساتھ یہ بھی کہہ دیا تھا۔ اگر پھر بچہ ہوا تو بچے کے ساتھ ساتھ زچہ کو بھی خطرہ ہوگا اس دن پروین بہت روئی تھی۔

''صباء تمہیں معلوم ہے۔'' پروین نے بہن کو مخاطب کیا۔ ''انوار کہتے تھے اس بچے کا نام صباء رکھے گی، مگر صباء میرا بچہ۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ صباء سے دو برس ہی تو چھوٹی تھی اس لیے صباء کا نام ہی لیتی تھی۔

''صبر کرو پروین! اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ دیکھو، اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی کوئی اولاد نہیں۔ تمہارا تو پھر ماشاء اللہ بیٹا ہے۔ کیا ہوا اگر تمہارے ہاں کوئی اور بچہ نہ ہوگا۔ تم عمر کی زندگی کے لیے دعا کیا کرو۔ تم نے سنا نہیں سیانے لوگ کہتے ہیں 'ہو ایک اور ہو نیک' خدا عمر کی زندگی دراز کرے اور اسے نیک بنائے۔'' صباء نے اس کو تسلی دی تو کھڑکی کے قریب کھڑے انوار بھی بیڈ کے قریب آ گئے۔ اگرچہ صدمہ ان کے چہرے سے بھی عیاں تھا۔ مگر وہ محبت بھرے لہجے میں پروین کو سمجھاتے ہوئے بولے۔ ''ہمیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ تمہیں ماں کہنے کے لیے عمر فاروق موجود تو ہے۔ کیوں صباء؟''

''جی ہاں، انوار بھائی! میں تو پہلے ہی اسے سمجھا رہی تھی۔'' صباء نے بہن کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر صباء! میرا عمر اکیلا رہے گا۔ اس کا کوئی بہن بھائی نہیں ہوگا۔" پروین روتی رہی۔

"پلیز پروین...... تم اسی طرح روتی رہیں تو مجھے دکھ ہوگا۔" انوار اس کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر بیٹھ گئے اور صباء باہر چلی آئی۔

اس بار دو ماہ کی بجائے چھ ماہ وہاں رہی کیونکہ پروین کی طبیعت زیادہ تر خراب ہی رہتی تھی اور عمر فاروق صباء کو سنبھالنا پڑتا اور پھر جیسے ہی پروین صحت یاب ہوئی صباء فوراً لاہور آ گئی۔

سب لوگ اسے دیکھ کر بے انتہا خوش ہوئے۔ بھابی تو کچھ زیادہ ہی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ "صباء یقین کرو میں نے تمہیں بہت مس کیا؟"

"واقعی؟" صباء نے مسکرا کر پوچھا۔

"تمہارا خیال ہے میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" فوزیہ نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"ارے نہیں بھابی جان! میں جانتی ہوں آپ بہت اچھی ہیں۔" صباء نے مسکرا کر کہا اور دل میں سوچا شاید اب میری منزل مجھے مل جائے۔ بھابی کتنی اچھی ہیں۔ میں جلد ہی بھابی سے اس مسئلے پر بات کروں گی۔

"کیا سوچنے لگیں؟" فوزیہ نے پوچھا تو صباء ہنس کر بولی۔ "کچھ نہیں بھابی یونہی ایک خیال آ گیا تھا۔"

"لگتا ہے بہت حسین خیال تھا جب ہی تو تمہارے چہرے پر قوس قزح کے رنگ بھر گئے ہیں۔" فوزیہ نے شرارت سے ہنستے ہوئے اسے دیکھا تو صباء نظریں چرا کر کچن میں کھانا کھانے چلی گئی۔ مگر فوزیہ فوراً اس کے پیچھے آئی اور ہاتھ پکڑ کر باہر لاتی ہوئی بولی۔

"تم آج ہی آئی ہو اور آتے ہی کام کرنے لگیں، چلو آؤ آج کام مت کرو۔"

"جی بہتر۔" صباء مسکرائی اور دل میں سوچا۔ "میری غیر موجودگی میں شاید امی نے بھابی کو کام پر لگا دیا ہے۔ چلو اچھا ہے اب ہم مل کر کام کیا کریں گے۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کا یہ خیال غلط ہو گیا۔ جب فوزیہ چیخ چیخ کر فری اور راہی کو آوازیں دینے لگی۔ وہ دونوں جب بھاگتی ہوئی فوزیہ کے قریب آئیں تو صباء نے بغور انہیں دیکھا۔ وہ دونوں سہمی سہمی اور کچھ خوفزدہ تھیں۔

"کپڑے پریس کر دیئے؟" فوزیہ نے راہی کو تقریباً گھورتے ہوئے پوچھا۔

"جی بھابی جان!" راہی نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"کپڑے پریس ہوئے اور تم فوراً کہیں چھپ کر بیٹھ گئیں۔ صباء نے تم لوگوں کی عادتیں بہت بگاڑ رکھی ہیں۔ اپنے آپ تمہیں کوئی کام نظر ہی نہیں آتا۔ جاؤ جا کر کبابوں کے لیے قیمہ پیسو اور فری تمہارا کھانا ابھی تیار ہوا ہے کہ نہیں؟"

"جی بھابی جان! صرف پلاؤ رہتا ہے وہ پکانے لگی ہوں۔"

"اچھا ٹھیک ہے پلاؤ بنا کر تم سلاد بنا لینا اور راہی تم کباب خود ہی تلنا قیمہ پیس کر اب جاؤ۔"

فوزیہ نے انہیں جانے کا اشارہ کیا پھر صباء کو کچھ سوچتے دیکھ کر بولی۔ "اصل میں تم نے ان دونوں کو بہت ڈھیل دے رکھی ہے۔ آخر اگلے گھر بھی انہیں جانا ہے۔ کیا یہ سب اچھا نہیں کیا میں نے؟"

"شاید......" صباء نے اکتائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"آؤ میرے کمرے میں آ جاؤ۔ وہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" فوزیہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"شکریہ بھابی! میں اپنے کمرے میں جاؤں گی۔ تھکی ہوئی ہوں، تھوڑا آرام کروں گی۔"

"اچھا جیسے تمہاری مرضی۔" فوزیہ اسے وہیں چھوڑ کر چلی گئی۔ صباء خود بھی اٹھنے کا سوچ رہی تھی کہ ماں چلی آئیں۔

"امی! آپ نے ابھی تک بھابی کو کام پر نہیں لگایا۔" صباء نے تلخی سے پوچھا۔

"لو بھلا ابھی سے اسے کام پر لگا دوں۔" ماں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔

ماں نے ایک نظر صباء کے غصے سے سرخ ہوتے چہرے پر ڈالی اور بولی۔ "سچی بات ہے میری بہو تو پہلے بچے کی پیدائش تک آرام کرے گی اور پھر اسے کام کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے تم درجن بھر بہنیں کس لیے ہو۔ یوں بھی تم نے دیکھا ہے میری بہو کی خوبصورتی کو وہ تو شوکیس میں لگا کر دیکھنے والی چیز ہے کہ کام کرنے والی۔"

"اچھی بات ہے۔" صباء نے ناگواری سے کہا۔ "بچہ اگر دس سال نہیں ہوگا تو کیا وہ دس سال آرام کرے گی۔"

''ارے......ارے کمبخت! تیرے منہ میں خاک۔ کیسی بد فال منہ سے نکال رہی ہو۔''

صباء نے کوئی جواب نہ دیا۔ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ راہی اور فری دونوں اپنے کام میں مصروف تھیں۔

''کیوں بھئی تم دونوں کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟'' صباء نے پیار سے بہنوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

فری تو چپ رہی مگر راہی تلخی سے بولی۔ ''کام سے فرصت ملے گی تو پڑھائی بھی کر لیں گے۔ آپ جائیں سیریں کریں۔''

صباء اس کی بات سن کر مسکرا دی پھر کمر پر ہلکی سی چپت لگاتی ہوئی بولی۔ ''تمہارے خیال میں میں سیر کر رہی تھی۔ جنابہ وہاں سب سے بڑا کام عمر فاروق کو سنبھالنا تھا۔ خیر اب تم جاؤ میں سب کچھ دیکھ لوں گی۔'' صباء نے کہا تو وہ دونوں فوراً ہی چلی گئیں۔ ''بے چاری یہ معصوم بچیاں۔'' صباء نے سوچا اور پلاؤ کو دم پر رکھ کر کباب تلنے لگی۔

اگلی صبح صباء کام کاج سے فارغ ہو کر ابھی بیٹھی ہی تھی کہ فری جو طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے کالج نہیں گئی تھی۔ بھاگتی ہوئی آئی اور ایک غیر ملکی خط صباء کے آگے پھینکتی ہوئی بولی۔

''آپی! اس پر آپ کا نام لکھا ہے مگر یہ غیر ملکی خط ہے۔ کہاں سے آ سکتا ہے یہ؟''

اک انجانی سی مسرت سے صباء کا دل دھڑک اٹھا۔ ''آفاق'' اس نے دل میں سوچا۔

''آپی میں پڑھوں؟'' فری نے خط اٹھانے کی کوشش کی تو صباء ایک دم ہوش میں آ گئی۔

''تم کیوں پڑھو گی۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔'' صباء نے کہا۔

''مگر یہ ہے کس کا؟'' فری ابھی تک حیران تھی۔

''پڑھوں گی تو پتہ چل جائے گا۔'' صباء نے کہا اور خط لے کر فوراً اپنے کمرے میں آ گئی۔

''اف آفاق! یہ دو سال بعد تمہیں میرا خیال کیسے آ گیا۔'' اس نے بے ساختہ خط چوم لیا اور پھر کچھ دیر یونہی خط کو دیکھنے کے بعد پڑھنے لگی۔ خط کا آغاز ایک خوبصورت شعر سے کیا گیا تھا۔

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے جینے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا ہم نے تجھے یاد کیا

ڈیئر صباء آداب!

یہ لکھنا تو فضول ہی ہو گا کہ میں خیریت سے ہوں اور امید ہے تم بھی خیریت سے ہو گی۔ نہ تو میں خیریت سے ہوں اور نہ ہی تم خیریت سے ہو یہ میرا دل کہتا ہے۔ وقت رخصت ایک تو تم عجلت میں تھیں دوسرے تم نے میری محبت کی توہین کی تھی۔ مارے غصے کے میں تمہیں رکنے کا بھی نہ کہہ سکا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ ہم ایک دوسرے سے جدا ہو رہے تھے مگر کس صورت میں، خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب سنو یہاں کی روداد۔ یہاں پہنچتے ہی میں نے تمہارے مشورے پر عمل شروع کیا۔ بقول تمہارے کہ میں یہاں آتے ہی شادی کر لوں گا۔ افسوس تمہارا خیال غلط ثابت ہوا۔ دو سال گزر گئے مگر میں ناکام رہا۔ سوچا کم از کم تمہیں خبردار تو کر دوں۔ تم سناؤ اپنی، کیسی ہو؟ دن رات کا کیا عالم ہے؟ کیا کبھی اتفاق سے مجھے یاد کرتی ہو یا، سنو کیا تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کر سکتیں؟ یوں تو دن رات گزر ہی رہے ہیں مگر خیر، خط ختم کر رہا ہوں۔ اگر خط کا جواب دو تو ایک احسان ہی سمجھوں گا۔ اپنا ایڈریس اور فون نمبر بھیج رہا ہوں کبھی فرصت ملے تو یاد کر لینا۔ اچھا خدا حافظ۔''

والسلام۔ ابھی تک تمہارا...... آفاق

اس کا خط پڑھ کر صباء کو ہنسی بھی آئی اور دکھ بھی ہوا۔ میں جانتی تھی آفاق کہ تم بھی شادی نہیں کرو گے۔ مگر میرے اپنے آفاق اس کے سوا میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ میں تمہیں کوئی ایسی امید دلانا نہیں چاہتی تھی جس میں کھو کر تم اپنی ساری زندگی خراب کر دو میں چاہتی تھی۔ تم بے شک مجھے بے وفا سمجھو مگر بھول جاؤ۔ میں تو خود ایک امید کے سہارے جی رہی ہوں اور اب جبکہ وہ امید حقیقت کا ایک روپ دھارتی ہوئی نظر آتی ہے تو یقیناً میں تمہیں بہت جلد ایک خوشخبری سنا سکوں گی۔ تب تم ساری ناراضگی بھول جاؤ گے۔'' صباء نے سوچا اور مسکرا دی کیونکہ وہ جانتی تھی اب یہ دوری تھوڑے عرصہ کی ہے۔

صباء کے آنے کے تقریباً تین روز بعد ہی فوزیہ میکے چلی گئی اور صباء کے لیے پھر وہی دن رات ہو گئے، وہ بھابی سے بات کرنے کا سوچ رہی تھی اور بھابی چلی گئیں۔ آخر اس مشکل کا حل کیا ہو گا؟ بھابی کبھی کبھار ایک آدھ دن کے لیے میکے سے آتیں اور چلی جاتیں

جتنا وقت بھی وہ رہتیں، انہیں باتوں سے ہی فرصت نہ ملتی۔

ان کے اس آنے جانے میں دو سال کا یہ عرصہ خاموشی کی نذر ہو گیا اور رضوان چھٹی پر پاکستان آ گئے اور فوزیہ جو کبھی بیماری اور کبھی کچھ بہانہ بنا کر میکے ہی میں رہتی تھی پھر سسرال آ گئی۔

پھر وہی خوشیوں بھرے دن رات تھے۔ دن بھر کام کے ساتھ ساتھ باتیں بھی خوب ہوتیں، قہقہے بکھرتے۔ اسی دوران میں صباء نے دو ایک بار بھابی سے بات کرنے کی کوشش کی مگر بات سننا دور کی بات، فوزیہ کو تو اس کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔ رضوان کے ساتھ کبھی اپنے چچا کے گھر جا رہی ہے۔ کبھی ماموں کے کبھی ماں کے اور کبھی نانی کے۔

تھک ہار کر صباء نے سوچا شاید زندگی یونہی گزر جائے گی۔

صبح سے وہ گھر بھر کے غلاف اور کپڑے دھونے میں لگی ہوئی تھی۔ آتے جاتے رضوان نہ جانے کیوں اسے بار بار دیکھ رہے تھے۔ وہ صبح کی نماز سے فارغ ہوتے ہی کام میں جت گئی تھی۔ ناشتہ بھی اس دوران میں امی نے بنایا تھا۔ تمام کپڑے تقریباً گیارہ بجے تک دھل گئے تھے اور صباء تھکی تھکی سی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی تھی کیونکہ بقول ماں کے میری بہو پہلے بچے تک کام نہیں کرے گی۔ شادی کو ڈھائی سال گزر گئے تھے مگر ابھی تک پہلا بچہ نہ ہوا تھا۔

کچھ سوچ کر رضوان اٹھے اور جب اوپر فوزیہ کے پاس گئے تو وہ بیٹھی میک اپ کر رہی تھی۔ رضوان کو دیکھ کر مسکرائی۔

''کہیں جا رہی ہو کیا؟'' رضوان نے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔

''کیوں، کیا میک اپ کہیں جانے کے لیے ہی کیا جاتا ہے۔ گھر کے لیے میک اپ نہیں ہو سکتا۔'' وہ اٹھلاتی ہوئی رضوان کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ رضوان نے غور سے اسے دیکھا، گالوں اور آنکھوں پر افشاں چم چم کر رہی تھی اور ایسے میں فوزیہ اور بھی خوبصورت لگ رہی تھی مگر نہ جانے کیوں بجائے اس کے کہ ان کے دل میں کوئی خوبصورت جذبہ جاگتا عجیب سی بے زاری ان پر چھا گئی۔

''گھر کے لیے صرف میک اپ ہی نہیں ہوتا بلکہ کام بھی ہوتا۔ اگر کام نہیں کرتی ۔ تو یہ سب بھی مت کیا کرو۔'' وہ تلخ لہجے میں بولے۔

فوزیہ کے جذبوں پر اوس پڑ گئی۔ اپنی شدید توہین کا احساس ہوا۔ دل چاہا چیخ کر کہے گھر میں تین تین نوکرانیاں موجود ہیں تو مجھے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے مگر یہ کہہ کر وہ شوہر کو ناراض کرنا نہیں چاہتی تھی۔ واپس ڈریسنگ ٹیبل کی طرف مڑتی ہوئی بولی۔ ''امی جان نے خود ہی کام پر نہیں لگایا۔''

''اور تمہیں خود کوئی احساس نہیں۔'' رضوان سنجیدگی سے بولے۔ ''صبح سے صباء کپڑے دھو رہی ہے۔ تم سے اتنا نہیں ہوا کہ دوپہر کا کھانا ہی بنا لیتیں اب وہ تھکی کھانا بنانے لگی ہے لیکن وہ کھانا نہیں بنائے گی۔ اب تم جاؤ اور جا کر کھانا بناؤ مگر پہلے میک اپ صاف کر لینا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی ان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔

''کھانا میں بناؤں؟'' فوزیہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کیوں، کھانا بنانے سے تمہاری شان یا حیثیت گھٹ جائے گی۔'' رضوان کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔

''مگر رضوان۔'' فوزیہ روہانسی ہو کر بولی۔ ''بہو کو کام پر لگانا تو باقاعدہ ایک رسم ہوتی ہے۔ میں یونہی۔''

''میں کسی رسم و رواج کو نہیں مانتا۔'' رضوان اس کی بات کاٹ کر بولے۔ ''یہ کمبخت سارے رسم و رواج ایشیائی لوگوں کے لیے ہی رہ گئے ہیں۔ جا کر کھانا بناؤ، یہ میرا حکم ہے۔''

فوزیہ خاموشی سے اٹھی، میک اپ صاف کیا اور منہ بناتی ہوئی نیچے چلی آئی۔

صباء برآمدے میں بیٹھی سبزی بنا رہی تھی۔ فوزیہ اس کے آگے سے ترکاری کا برتن اٹھاتی ہوئی بے زاری سے بولی۔ ''لاؤ آج دوپہر کا کھانا میں بنا دیتی ہوں۔''

''ارے بھابی آپ؟'' صباء نے حیران ہو کر انہیں دیکھا۔ ''نہیں نہیں اب تو میں فارغ ہوں۔ کھانا خود ہی بنا لوں گی۔''

فوزیہ نے دل میں سوچا۔ ''اگر بناؤ گی بھی تو مجھ پر یا میرے خاندان پر کوئی احسان تو نہیں کرو گی۔ تم سب لوگوں کو خود ہی کھانا ہے میں تو اکیلی ہوں۔''

''نہیں صباء آج تم کھانا نہیں بناؤ گی۔'' رضوان جو سیڑھیوں میں کھڑے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ بہن کے قریب آ کر محبت سے بولے۔ ''آج کھانا ان کو بنانے دو بھئی انہیں بھی تو کچھ آنا چاہیے۔'' رضوان نے منہ بناتی فوزیہ کو دیکھ کر کہا۔

"جی بہتر بھائی جان۔" صباء بھائی کے کہنے پر اٹھی۔ فوزیہ نے آنکھوں میں زہر بھر کر اسے دیکھا مگر صباء اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس وقت وہ شدید قسم کی تھکاوٹ محسوس کر رہی تھی اور اسی تھکاوٹ میں بڑی پیاری نیند آئی۔

بہت دیر بعد سو کر اٹھی تو ماں غصے سے بھری باہر بیٹھی تھی۔ "صباء تم آخر یہاں کس لیے ہو؟" اسے دیکھتے ہی انہوں نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا مطلب امی؟" صباء نے کھلے بالوں کا جوڑا بناتے ہوئے حیرت سے ان کو دیکھا۔

"تم نے فوزیہ سے دوپہر کا کھانا کیوں بنوایا؟ تم سے یہ چھوٹے موٹے کام بھی نہیں ہو سکتے۔"

'اچھا تو یہ بات ہے۔' صباء نے دکھ سے سوچا۔ 'یہ کیسی ماں ہے جس کو بیٹی کا نہیں بہو کا خیال ہے۔ ایک تو ان کے جہیز کے پیسے بچائے، اس پر یہ ستم کہ اب نوکر بن کر رہو، ہونہہ دیکھی جائے گی۔' اس نے نفرت سے سوچا اور تلخی سے کہا۔ "اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

"تمہیں تو کسی بات میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا۔ بہرحال آئندہ میری بہو کوئی کام نہیں کرے گی۔"

صباء کوئی تلخ جواب دینا چاہتی تھی کہ باپ کی آواز آئی۔ "صباء آج کا اخبار تو لانا۔"

"جی ابو پہلے کھانا کھا لوں پھر اخبار سناتی ہوں۔" صباء نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا اور کچن میں آ گئی۔ "واہ" کھانا نہیں بنائے گی۔ مجھے کیا خود ہی ایک دن پچھتائیں گے۔

تاہم اس کے بعد اتنا ضرور ہوا، بھائی لاکھ کہتے رہتے۔ "صباء تمہاری بھابی یہ کام کرے گی، تمہاری بھابی کھانا بنائیں گی۔" مگر وہ ان کی ایک نہ سنتی۔ صاف انکار کر دیتی۔ "نہیں بھائی جان! یہ تو میرا کام ہے اسے بھلا کوئی دوسرا کیوں کرے۔" اس کی آنکھوں میں گہرا طنز ہوتا اور ان ہی دنوں فوزیہ کو کام نہ کرنے کا بہانہ مل گیا۔ وہ امید سے تھی۔ گھر بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ رضوان کے باہر جانے کے دن قریب آ رہے تھے۔ دوسری بہنیں بھی بھائی کو رخصت کرنے چلی آئیں۔ بھابی کے امید سے ہونے کی خبر سنی تو وہ بھی بہت خوش ہوئیں اور خوش کیوں نہ ہوتیں۔ بھائی نے ان کی خوشیوں کے لیے کیا کچھ نہ کیا تھا اور اب بھائی کی خوشیوں کا وقت تھا۔ صباء کو تو جب بھی وقت ملتا بھیا کو پکڑ کر بیٹھ جاتی اور ہر بار ایک ہی بات کہتی۔

"بھیا جی! کچھ بھی ہو بچے کا نام میں رکھوں گی۔ لڑکی ہو یا لڑکا۔" اور بھیا فوراً ہنس

کر کہتے۔

"ضرور، ضرور بھئی، پہلا حق تمہارا ہی تو ہے۔ نام تم ہی رکھو گی۔"

"اور اگر بھابی نے نہ رکھنے دیا تو؟" فوزیہ کا رویہ دیکھتے ہوئے صباء کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو جاتا؟

"کیوں، بھابی کیوں نہ رکھنے دیں گی؟" رضوان، بیوی کو دیکھتے تو وہ فوراً مسکرا کر کہتی۔

"بابا! میں کون ہوتی ہوں انکار کرنے والی، تمہارا جو جی چاہے نام رکھنا۔" تو صباء فوراً بولی۔

"ٹھیک ہے اگر لڑکی ہوئی تو اس کا نام رکھیں گے شہر بانو اور اگر......"

"ارے تیرے منہ میں خاک، پہلے ہی لڑکی کا نام لے لیا۔" ماں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "پہلا پہلا ہے خدا میرے بیٹے کو چاند سا بیٹا دے۔"

"اور اگر لڑکی ہی ہوئی تو۔" صباء شرارت سے مسکرائی۔

"کیوں، لڑکی ہو گی؟" فوزیہ ناگواری سے بولی۔ "لگتا ہے تم دل سے یہ دعا مانگ رہی ہو۔"

"ارے بھئی تم لوگ کیوں جھگڑتے ہو۔" رضوان فوراً بولے۔ "بیٹی تو خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ اگر خدا نے مجھے پہلے رحمت سے نوازا تو میں بہت خوشی محسوس کروں گا۔"

"رحمت بھی لے لیں گے خدا کی۔" ماں فوراً ناک چڑھا کر بولی۔ "لیکن پہلا بیٹا ہونا چاہیے تم نے دیکھا نہیں تمہاری تینوں بہنوں کے ہاں پہلے بیٹے ہی ہوئے ہیں۔ اب تمہارے گھر بیٹا کیوں نہیں ہو گا؟ پہلے بیٹا ہی ہو گا۔" انہوں نے یوں کہا جیسے پہلے ہی سے بیٹے کی بکنگ کروا رکھی ہو۔

"امی جان! ختم کیجیے اس بحث کو خدا کے کاموں میں کس کو دخل ہے۔" راہدہ نے یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی۔

پھر رضوان باہر چلے گئے اور ان کے ساتھ ہی فوزیہ اپنے میکے چلی گئی۔ اگر کبھی کبھار فوزیہ ان سے ملنے کے لیے آتی بھی تو ساتھ اس کی ماں ضرور ہوتی۔ بقول اس کی ماں کے ایسی حالت میں وہ اپنی بیٹی کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

❁ ✽ ❁

وقت یونہی سبک روی سے آگے بڑھنے لگا۔

جون کے مہینے میں پروین ان سے ملنے آ گئی۔ ساتھ نہ صرف عمر فاروق تھا بلکہ اس کا شوہر میجر انوار بھی تھا۔ مہمانوں کے گھر میں آتے ہی خوشیاں بھی دو چند ہو گئیں۔ خاص کر عمر فاروق کی وجہ سے، جو اب چار سال کا ہونے والا تھا سارے گھر میں وہ سب سے زیادہ صباء سے مانوس تھا۔ وہ نہ صرف ذہین اور خوبصورت تھا بلکہ باتونی بھی بہت تھا۔ فری، راہی جب بھی اسے اپنے قریب بلاتیں وہ بھاگ کر صباء کے پاس آ جاتا۔

''آنٹی جان! چھپا لو۔'' وہ صباء کی گردن میں جھول جاتا اور اگر کبھی عرفان اس کے موڈ کے خلاف زبردستی پکڑنے لگتا تو وہ منہ بنا کر کہتا۔ ''ماموں گندے'' اور خود بھاگ کر صباء کی گود میں چڑھ جاتا اور صباء کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

''کیوں یہ تمہاری زیادہ سگی آنٹی ہیں۔'' پروین ہنس کر پوچھتی۔

''ممی گندی۔'' عمر نے کہا اور صباء کے پاس بھاگ گیا جو سبزی بنا رہی تھی وہ قریب بیٹھ کر ایک ایک چیز اسے پکڑانے لگا۔ وہ ایسے ہی کرتا تھا اگر صباء فرش دھو رہی ہوتی تو پانی کے ڈونگے بھر کر لاتا۔ کئی بار گرتا بھی مگر باز کبھی نہ آتا۔

شام کو پروین، انوار کے ساتھ ایک نئے بنے ہوئے پارک کو دیکھنے جا رہی تھی خود تیار ہو کر بولی۔ ''آؤ عمر آپ کو بھی تیار کر دوں۔''

''ممی! آنٹی جان بھی جائیں گی۔'' عمر نے اپنے سامنے بیٹھی صباء کو دیکھا۔

''اگر موڈ ہو تو آنٹی بھی چلیں۔'' پروین نے پیار سے بہن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی۔ میں نہیں جا سکتی۔'' صباء نے انکار کرتے ہوئے شربت کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

''پاپا! آپ آنٹی سے کہیں۔'' عمر نے باپ کی ٹانگوں سے لپٹتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! آپ کی آنٹی لوگوں کا کہنا کم ہی مانتی ہیں۔ یہ ضرورت سے زیادہ انڈی پنڈنٹ ہیں۔'' انوار نے شرارت سے صباء کو دیکھا۔

''کچھ بھی سمجھ لیں۔'' صباء مسکرائی تو انوار سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولے۔

''ارے بھئی عمر ضد کر رہا ہے چلی چلو۔ یقین جانو تمہیں حفاظت سے واپس لے آئیں گے۔'' ان کے لہجے میں بدستور شرارت تھی۔

''جی بہتر۔'' صباء نے اور انکار کرنا مناسب نہ سمجھا اور اندر چلی گئی مگر اب مسئلہ تھا لباس کا۔ ابھی اس نے لون کا کوئی سوٹ بھی نہیں بنایا تھا بلکہ ماں نے ابھی کوئی سوٹ بنا کر دیا ہی نہ تھا۔ باقی کپڑوں میں سے اسے اپنا کوئی سوٹ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ بھائی کی شادی پر اگرچہ بہت کپڑے بنائے تھے مگر تمام گوٹے کناری کے تھے۔ اس کے بعد بھی کچھ سوٹ بنائے مگر صباء کو ان میں سے کوئی بھی پسند نہ آیا۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی تھی کہ کچھ دن قبل ہی فوزیہ ایک خوبصورت سوٹ لائی تھی۔ صباء کا دل چاہ رہا تھا کہ وہی سوٹ پہن لے پھر اس نے سوچا کہیں بھابی برا نہ مانیں۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اکتا کر بولی۔

''پروین! تم چلی جاؤ، میرے پاس کوئی ڈھنگ کا سوٹ بھی نہیں۔''

''تو اس میں پریشانی کیسی۔ میرا کوئی بھی سوٹ پہن لو۔'' پروین نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

''نہیں بھئی، انوار بھائی کیا سوچیں گے۔ میرے پاس ایک سوٹ بھی نہیں۔''

''کچھ نہیں سوچیں گے وہ۔'' پروین بولی۔ ''بلکہ میں خود ہی ان سے کہہ دوں گی کہ صباء کو یہ کلر اچھا لگا تھا۔ اس لیے میں نے یہ سوٹ صباء ہی کو دے دیا۔''

''تمہیں جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہارا سوٹ نہیں پہن سکتی۔ ویسے تو بھابی کا ایک سوٹ ہے وہ پہن لوں۔'' صباء دل کی بات زبان پر لے آئی۔

''ہاں..... ہاں پہن لو۔ اس میں سوچنے یا پوچھنے کی کیا بات ہے۔ وہ ہماری ہی بھابی ہیں۔'' پروین نے کہا تو صباء تیار ہونے چلی گئی۔

ایک ہفتہ رہ کر پروین واپس چلی گئی۔ کچھ روز بعد ہی فوزیہ بھی آ گئی۔ ساتھ ہمیشہ کی طرح اس کی ماں نہیں تھی بلکہ ملازمہ تھی۔ کچھ دیر وہ ان کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی رہی پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ہی وہ منہ چڑھائے باہر آئی اور فری کو اپنے ساتھ لے گئی۔

''کیوں بلایا تھا بھابی نے؟'' فری باہر آئی تو صباء نے پوچھا۔

''اپنے سوٹ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں کہ کس نے پہنا تھا؟''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''وہی جو کہنا تھا کہ یعنی میں نے بتا دیا کہ آپ نے پہنا تھا۔''

''اچھا۔'' صباء خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ ''گویا بھابی اپنے سامان کو چیک کرنے

آتی ہیں کہ کوئی ہاتھ تو نہیں لگاتا۔ ہم سے ملنے نہیں آتیں اور ہم تو گویا نوکر ہیں کتنی بری ہے یہ بھابی۔''

شام تک فوزیہ رہی مگر اس کا موڈ آف ہی رہا۔ بے زاری سے کبھی اِدھر بیٹھتی، کبھی اُدھر اور پھر شام کو جاتے ہوئے سوائے کمرے کے باقی سب چیزوں کو تالے لگا کر چلی گئی۔

صبح صباء کام کرنے فوزیہ کے کمرے میں آئی۔ دل پر ایک گہری چوٹ پڑی۔ فوزیہ جاتے ہوئے وہ سوٹ جو صباء نے پہنا تھا پھاڑ گئی تھی۔ صباء کا دل ایک دم بھر آیا۔ پھر جو آنسو بہنا شروع ہوئے تو رکتے ہی نہیں تھے۔ وہ خود بھی حیران تھی کہ اتنا پانی کہاں سے اس کی آنکھوں میں آ گیا۔ راہی، فری افسردہ کھڑی بہن کو دیکھ رہی تھیں جب وہ کسی طور چپ ہونے میں نہ آئی تو وہ ماں کے پاس آئیں۔

''امی جی! آپ باجی کو چپ کروائیں۔ وہ بہت رو رہی ہیں۔'' راہی نے خود بھی روتے ہوئے کہا۔

''کیوں، صباء کیوں رو رہی ہے۔'' ماں نے جو ناشتے کے بعد اپنی ٹوٹی ہوئی تسبیح کو بھرنے میں مصروف تھی چونک کر پوچھا۔

''امی! آپ آئیں تو سہی۔'' فری ان کو بازو سے پکڑ کر صباء کے پاس لائی اور جب راہی نے صباء کے رونے کی تفصیل بتائی تو ماں بجائے ہمدردی کے بگڑ کر بولیں۔

''تم نے پہنا ہی کیوں تھا اس کا سوٹ وہ نہ جانے دل میں کیا سوچ رہی ہو گی۔''

''کیا ہوا بھئی؟'' صباء کے ابو پوچھنے لگے اور قبل اس کے کہ ماں کچھ بتاتی صباء چپکے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وہ جانتی تھی اب باپ بھی ماں کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔

فوزیہ نے دوبارہ سسرال آنا مناسب نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی ڈلیوری تک اس کے گھر سے کوئی ان کے یہاں آیا تھا۔ فون پر ہی صباء کی امی خیریت پوچھ لیتیں، اور پھر فون پر ہی ان لوگوں نے فوزیہ کے ہاں بچی ہونے کی اطلاع دے دی تھی۔

صباء کی امی فون سنتے ہی جب جانے کے لیے تیار ہوئیں تو صباء نے یاد دہانی کے طور پر ماں سے کہا۔

''امی جان! بھابی سے کہہ دیجیے گا بچی کا نام وہ ''شہر بانو'' ہی رکھیں۔''

''اچھا کہہ دوں گی۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور چلی گئیں۔

مگر وہاں تو فوزیہ کچھ اور ہی سوچ کر بیٹھی تھی۔ صباء کی امی کو دیکھتے ہی فوزیہ کی ماں تلخی سے بولی۔

''آج کیا لینے آئی ہیں آپ؟''

''بھئی اپنی پوتی کو دیکھنے آئی ہوں اور کیا لینے آئی ہوں؟'' زبیدہ نے جواب دیا تو فوزیہ کی ماں لڑنے کے سے انداز میں بولی۔

''صباء نے میری بیٹی کا سوٹ کیا سمجھ کر پہنا تھا؟ ابھی وہ زندہ تھی خدانخواستہ مر تو نہیں گئی۔''

''اس بات پر خود بھی میں نے اسے ڈانٹا تھا۔'' صباء کی امی نے صفائی پیش کی۔

''خیر آپ ڈانٹیں یا نہ ڈانٹیں۔ فوزیہ اب اس گھر میں ہرگز نہیں جائے گی۔'' فوزیہ کی امی نے یکطرفہ فیصلہ سنا دیا۔

''مگر بہن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ فوزیہ میری بہو ہے۔ وہ ہمارے گھر نہیں جائے گی تو اور کہاں جائے گی؟''

''یہ فیصلہ ہو چکا ہے، اب تو لڑکا آئے گا اور اسی سے بات کی جائے گی۔ آپ سے فوزیہ کا کوئی تعلق نہیں۔ آپ جا سکتی ہیں۔'' انہوں نے بات ختم کی تو صباء کی ماں مارے غصے اور توہین کے احساس سے فوراً اٹھ کر گھر چلی آئیں۔ اور پھر صباء کو دیکھتے ہی غصے بھرے لہجے میں بولیں۔

''اب تو خوب خوشیاں منا۔''

''امی لڑکی کیسی ہے۔'' فری نے ان کے لہجے کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ مگر وہ بدستور اسی لہجے میں صباء سے مخاطب تھیں۔

''اب ایک ایک کر کے سارے کپڑے پہن لینا۔ اس نے کہہ دیا ہے وہ اب یہاں نہیں آئے گی۔ میں پوچھتی ہوں تمہیں ضرورت کیا تھی، اس کا سوٹ پہننے کی؟ اگر اتنا ہی شوق تھا کپڑے پہننے کا تو شادی کروائی ہوتی۔ خصم لے آتا۔ کم از کم ہمارے گھر میں تو فساد نہ ہوتا۔ وہ نہیں آئی تو میں کیا کروں گی۔ اپنی پوتی کو روز کیسے دیکھوں گی؟''

'نہیں آتی تو نہ آئے۔ جہنم میں جائے۔' صباء نے جل کر سوچا۔ صرف ایک سوٹ ہی

تو پہنا تھا اور کیا کیا ہے میں نے اور وہ تو جیسے اسی انتظار میں بیٹھی تھی کہ کوئی چھوٹی موٹی بات ہو اور وہ علیحدگی کا مطالبہ کر سکے اور ماں نے محض اس کی وجہ سے کتنی باتیں بنائی ہیں۔ انہی لوگوں کی عزت کا خیال تھا ورنہ میں اگر کورٹ میرج کر لیتی تو یہ لوگ میرا کیا بگاڑ لیتے۔ ہونہہ ایک سوٹ کے لیے اتنا ہنگامہ ایسے پچاس سوٹ آفاق خرید کر میرے سر کا صدقہ سمجھ کر لوگوں میں بانٹ دے لیکن آفاق؟ بات تو وہی ہوئی، فوزیہ اپنے شوہر کی کمائی سمجھ کر ہی اتراتی ہے حالانکہ وہ میرا بھائی بھی ہے۔ شاید شوہر کی کمائی پر بیوی صرف اپنا حق سمجھتی ہے اور آفاق کی کمائی بھی تو صرف میرے لیے ہوتی۔ میں اگر آج بھی اسے لکھوں تو کیا وہ مجھے کچھ نہ بھیجے۔ مگر میں...... میں کسی سے کیوں کہوں، میں کسی سے کچھ نہیں مانگوں گی۔ کسی سے کچھ نہیں لوں گی۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

پھر وہ باپ اور عرفان کو آتے دیکھ کر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کیونکہ اسے معلوم تھا بات ایک بار پھر نئے سرے سے شروع ہو گی اور باپ بھائی بھی اسی کو قصور وار کہیں گے کیونکہ ان سب کو فوزیہ سے محبت تھی۔

اپنے کمرے میں آ کر بھی وہ بے چینی سے ٹہلتی رہی۔ کبھی اٹھتی رہی، کبھی بیٹھتی رہی اور بس ایک ہی بات سوچتی رہی، کیا معلوم تھا۔ سوٹ پہننا اتنا بڑا جرم بن جائے گا۔

فوزیہ نے جو کہا تھا کر دکھایا۔ بچی تین ماہ کی ہو گئی تھی۔ مگر وہ ایک بار بھی نہ آئی اور نہ ہی کبھی فون کیا۔ اگر کبھی یہ لوگ فون کرتے بھی تو وہ جان بوجھ کر رانگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیتی۔



اچانک ایک رات رضوان آ گئے۔ ماں، باپ اور سب بہن بھائیوں سے ہنسی خوشی ملے۔ ماں نے سوچا قبل اس کے کہ وہ بیوی کے بارے میں پوچھے خود ہی سب کچھ بتا دینا چاہیے۔ یہی سوچ کر انہوں نے تمام تفصیلات ان کے گوش گزار کر دیں۔

ماں کی زبانی سب حالات سن کر وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر آہستہ لہجے میں بولے۔

''امی! فوزیہ نے بھی مجھے تفصیل سے خط لکھا تھا اور بتایا تھا۔ صباء جب جی چاہتا ہے میرے کپڑے نکال کر پہن لیتی ہے اور یوں بھی بغیر کسی وجہ کے اٹھتے بیٹھتے مجھے باتیں سناتی رہتی ہے۔ آپ واپس آئیں گے اور اپنا الگ گھر لیں گے تو میں آؤں گی ورنہ اس گھر میں کبھی نہیں

جاؤں گی۔ جہاں میری کوئی عزت نہیں۔'' رضوان خاموش ہو گئے۔

''ٹھیک لکھا ہے اس نے۔'' باپ نے سر ہلاتے ہوئے بہو کی حمایت کی۔

صباء تو چپ ہی رہی کیونکہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی صفائی کس طرح پیش کرے جب اس کے اپنے ہی اسے جھوٹا ثابت کر رہے تھے۔ اسے غلط کہہ رہے تھے۔ پھر غیروں سے کیا شکوہ۔ وہ خاموش بیٹھی ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھی کہ راہی بولی۔

''بھائی جان! باجی صباء نے تو صرف ایک ہی بار بھابی کا سوٹ پہنا تھا۔ وہ بھی اس لیے کہ پروین اور انوار بھائی گھومنے کے لیے صباء باجی کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے چونکہ باجی کے پاس اپنا کوئی اچھا سوٹ نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے بھابی کا پہن لیا حالانکہ پروین باجی نے کہا تھا کہ وہ ان کا سوٹ پہن لے۔''

''مگر اس نے سوٹ پہنا کیوں؟ بات تو سوٹ پہننے کی وجہ سے چلی ہے۔ اگر اس کے پاس سوٹ نہیں تھا تو گھومنے نہ جاتی۔'' ماں نے تلخی سے کہا۔

اور رضوان، صباء کو دیکھنے لگے جو مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرموں کی طرح کھڑی فیصلے کی منتظر تھی۔ رضوان کے اندر اچانک ہی کچھ ہوا اور پھر ان کی خود اپنی سمجھ میں بھی یہ بات نہ آئی کہ صباء کے لیے ان کے دل میں اتنا پیار کہاں سے امڈ آیا تھا۔ انہوں نے ندامت سے سوچا۔ شادی کے بعد وہ صرف فوزیہ کے لیے ہی شاپنگ کرتے رہے ہیں۔ اسی کی ضروریات کے متعلق سوچتے رہے ہیں۔ گو کہ صباء نے شادی سے انکار کر دیا تھا مگر کیا اس کے ساتھ اس کی ضروریات زندگی کے لیے انہیں خود سوچنا چاہیے تھا فوزیہ تو چلو غیر تھی مگر وہ تو اس کے اپنے تھے اور اب مسلسل صباء کو دیکھتے ہوئے وہ خود کو مجرم سمجھ رہے تھے اور شاید اپنے اس جرم کے کفارے کے لیے ہی وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

''امی جان! سوٹ اس کے جہیز کا تو نہ تھا۔ صباء کے بھائی کی کمائی کا تھا۔ اس پر پہلا حق صباء ہی کا تھا۔ اگر فوزیہ ان باتوں کی وجہ سے الگ ہونا چاہتی ہے تو اب اپنے ماں، باپ کے گھر ہی رہے گی اور آپ سب بھی سن لیں، آپ میں سے اب کوئی اسے لینے نہیں جائے گا اور نہ ہی اسے کوئی فون کرے گا۔ وہ اگر اپنا گھر بسانا چاہتی ہے تو اسے خود یہاں آنا ہو گا۔''

''مگر بیٹا ہماری بچی۔'' ماں نے کہنا چاہا۔

"بچی کہیں بھاگ نہیں جائے گی۔ میں بھی دیکھتا ہوں کتنا عرصہ ماں، باپ کے گھر رہتی ہے۔ بہت غرور ہے اسے اپنے حُسن پر، ماں، باپ اور بھائی پر، اب جب تک وہ خود معذرت کر کے اسے یہاں چھوڑنے نہیں آئیں گے۔ تب تک اس گھر میں فوزیہ کے لیے کوئی جگہ نہیں۔" رضوان کے چپ ہوتے ہی صباء اٹھ گئی اور رضوان جو مستقل پاکستان آ گئے تھے۔ عرفان سے کاروبار شروع کرنے کے بارے میں بات چیت کرنے لگے۔

"بیٹا! غلطی ہماری ہے۔ مان لینی چاہیے۔" باپ نے صباء کے جاتے ہی اسے سمجھانے کی آخری کوشش کی کیونکہ وہ ہر حال میں فوزیہ کو واپس اپنے گھر لانا چاہتے تھے۔

"ابو پلیز، میں آپ لوگوں سے زیادہ اس عورت کو سمجھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کیا اچھا ہے اور کیا برا۔ آپ دیکھیں گے وہ لوگ خود اسے چھوڑ کر جائیں گے۔" رضوان نے سمجھایا تو باپ بھی چپ ہو گیا۔

رضوان نے خوب اچھی طرح اپنا بزنس سیٹ کر لیا تھا مگر فوزیہ ابھی اکڑ میں وہیں بیٹھی تھی۔ بقول اس کے رضوان خود آ کر اسے لے جائیں۔ مگر رضوان نے صاف جواب دے دیا تھا کہ آنا چاہتی ہو تو خود ہی آؤ، بصورت دیگر وہیں ساری عمر بیٹھی رہو۔ فوزیہ تو نہیں آئی تھی، البتہ یہ ضرور ہوا تھا کہ رضوان جب بھی شاپنگ کے لیے جاتے صباء کے لیے ایک دو سوٹ ضرور لے کر آتے اور بجائے اس کے صباء سوٹ دیکھ کر خوش ہوتی دکھ کی ایک لہر اس کے دل میں اٹھتی اور ایسے میں نہ چاہتے ہوئے بھی آفاق خیالوں میں شکوے کرتا چلا آتا اور صباء اسے خیال ہی میں اپنی مجبوریاں بتانے اور سمجھانے لگ جاتی۔

جب اِدھر سے کوئی بھی فوزیہ کو لینے نہ گیا تو فوزیہ کے ماں، باپ نے کچھ خطرہ سا محسوس کیا اور پھر فوزیہ کا بھائی خود اسے گھر آ کر چھوڑ گیا۔ رضوان نے بھی اور سزا دینی مناسب نہ سمجھی اور خوش آمدید کہا۔ ان کے خیال میں اس غلطی کی اتنی ہی سزا کافی تھی اور فوزیہ کے آتے ہی صباء کے ماں، باپ ضرورت سے زیادہ ہی خوش ہو گئے تھے۔ کبھی پوتی کو پیار کرتے، کبھی بہو کو اور فوزیہ کے سامنے ہی کبھی صباء کو ڈانٹنے لگ جاتے کہ محض اس کے سوٹ پہننے کی وجہ سے وہ اپنی پوتی سے اتنا عرصہ دور رہے۔

بچی کا نام فوزیہ نے ثناء رکھا تھا اور پیار سے سب اس کو ثنی کہتے تھے۔ ثنی تھی بھی پیاری اور بڑی خوبصورت بچی۔

فوزیہ نے واپس آ کر صرف ایک کام شروع کیا تھا اور وہ کام تھا یہ کہ سوائے صباء کے وہ سب پر اپنے پیار کے پھول نچھاور کرتی۔ خاص کر ساس، سسر کا کچھ زیادہ ہی خیال رکھنے لگی تھی اور صباء نے اپنے دل میں جس امید کا دامن ایک طویل عرصہ سے تھام رکھا تھا۔ اسے اب بالکل آزاد چھوڑ دیا تھا کیونکہ اب انجام صاف اور واضح ہو کر اس کے سامنے آ گیا تھا اور وہ جانتی تھی محبت کرنے والے ہمیشہ خوشی سے دور تنہائی میں زندگی گزارتے ہیں اور وہ اس تنہائی کی عادی ہو چکی تھی۔ بس ایک امید تھی جو ختم ہو گئی تھی۔

فوزیہ کی نفرت شدید سے شدید تر ہو گئی تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ رضوان جب بھی کوئی چیز اس کے لیے لے کر آتے تھے۔ ساتھ میں صباء کے لیے بھی ضرور لاتے تھے۔ یہ دیکھ کر صباء نے خود ہی بڑی منت سماجت کے بعد بھائی کو منع کر دیا۔ اور یوں فوزیہ کی روح کو تھوڑا سا سکون ملا تھا۔

ثناء کے آنے سے گھر میں ایک رونق سی آ گئی تھی مگر ایک بات تھی۔ ثناء یوں تو گھر کے ہر فرد کے پاس جاتی تھی مگر جب کبھی صباء اس کو لینا چاہتی تو وہ چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیتی۔ اس وقت فوزیہ بھاگ کر آتی اور کہتی۔ "بھئی صباء اگر بچی تم سے ڈرتی ہے، تمہارے پاس نہیں آنا چاہتی تو مت اٹھایا کرو۔"

صباء نے حیران ہو کر فوزیہ کو دیکھا جیسے کہنا چاہتی۔ "بھابی میں بھوت تو نہیں۔" مگر وہ چپ ہی رہی اور پھر بہت جلد یہ بات اس پر کھل گئی کہ بچی اسے دیکھ کر ڈر کیوں جاتی ہے۔

کچھ دنوں سے صباء کی طبیعت خراب تھی۔ صباء دو تین دن اپنے کمرے سے باہر نہ آئی۔ دوپہر میں وہ کچھ طبیعت بہتر محسوس کر کے کمرے سے باہر آئی تو ثناء نہ جانے کس بات پر ضد کر رہی تھی کہ اچانک فوزیہ بولی۔ "ثناء چپ ہو جاؤ ورنہ جادوگرنی کو بلاؤں گی۔" اور ثناء جو کہ بالکل سامنے تھی اچانک اس کی نظر صباء پر پڑ گئی اور وہ چیخی۔ "ممی...... جا...... جادوگرنی" فوزیہ جلدی سے باہر آئی تو صباء نے شکوے بھری نظروں سے اسے دیکھا مگر اس کو کیا پرواہ ہو سکتی تھی۔ شانے اچکا کر ثناء کو اٹھایا اور اندر چلی گئی اور یوں صباء نے خود ہی ثناء کو لینا چھوڑ دیا۔

گھر کی فضا تقریباً ٹھیک ٹھاک ہی تھی خرابی تھی تو صرف صباء کے اپنے مقدر میں اور پھر انہی دنوں فری اور راہی کے لیے بہت اچھے رشتے آئے۔ لڑکے لاس اینجلس میں مقیم

تھے اور دونوں سگے بھائی تھے اور آج کل چھٹی پر پاکستان آئے ہوئے تھے۔ پھر چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ ہوا اور گھر فری اور راہی کے وجود سے خالی ہو گیا۔

ان کے جانے پر فوزیہ نے ضرور اطمینان کی سانس لی ہو گی۔ اسی عرصے میں وہ ایک لڑکے کی ماں بھی بن چکی تھی اور بچوں کی وجہ سے ہل کر پانی بھی نہ پیتی تھی۔ اب سارے گھر کا کام صباء کی ذمہ داری تھی اور وہ سارا دن بیٹھی حکم چلاتی مگر صباء کو ان سب سے کوئی شکوہ نہ تھا۔ اس زندگی کا انتخاب اس نے خود کیا تھا اور اپنے حال پر وہ خوش تھی نہ کہیں آنا نہ جانا۔ سارا دن کام اور صرف کام اور جب کبھی فرصت ملتی تو آفاق کی یاد زندگی میں اب یہی کچھ باقی بچا تھا۔

دوپہر میں حسب معمول صباء کھانا بنا رہی تھی کہ فوزیہ نے آواز دی۔ ''صباء! فومی کے لیے فیڈر بنا کر دے جاؤ اور ثنا کے لیے فیریکس۔''

''جی اچھا بھابی!'' صباء نے اونچی آواز میں کہا اور گوشت میں گھی ڈال کر بھوننے لگی کیونکہ پانی بالکل خشک ہو چکا تھا اور جل جانے کا خطرہ تھا۔ اس نے جلدی جلدی گوشت بھون کر سبزی ڈالی اور اتنے میں ہی فوزیہ شور کرنے لگی۔

''صباء! کبھی تو کوئی کام وقت پر کر دیا کرو۔ جب کام بتاؤ دس گھنٹے لگا دیتی ہو۔ بچے چاہے بھوک سے رو رو کر مر جائیں مگر تمہیں کیا، تمہارے بچے تھوڑی ہیں۔'' ان کی صلواتیں سن کر صباء جلدی سے ڈھکنا رکھ کر اٹھی اور اتنے میں عرفان غصے سے بھرا ہوا کچن میں داخل ہوا۔

''صباء! بھابی نے تمہیں کیا کہا تھا؟'' وہ اسے گھورنے لگا اگرچہ وہ صباء سے چھوٹا تھا مگر نام ہی لیتا تھا اور آج کل بھابی کی ہمدردی میں اکثر صباء سے لڑتا جھگڑتا تھا۔ فوزیہ نے اسے اپنا خوب طرفدار بنا رکھا تھا۔

''میں گوشت بھون رہی تھی۔'' صباء نے وضاحت کی اور جلدی سے فیڈر میں دودھ ڈالنے لگی۔

''بھون رہی تھیں یا کھا رہی تھیں۔'' عرفان نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''بکواس مت کرو۔'' صباء کو بھی غصہ آ گیا۔

''تم بھی بکواس کر رہی ہو۔'' عرفان بدتمیزی کی آخری حدوں کو چھو گیا۔

''تمیز سے بات کرو، دن بدن بے ہودہ ہوتے جا رہے ہو۔'' صباء نے نفرت سے

کہا۔ وہ بھی اس کی روز، روز کی بدتمیزیوں سے تنگ آ چکی تھی۔ مگر اس کا اتنا کہنا ہی غضب ہو گیا۔ ماں غصے سے بھری اس کے پاس آئی۔

''بے غیرت، بے حیا، بھائیوں کے در پر ساری زندگی گزارنی ہے اور بھائی سے ہی بکواس کر رہی ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں۔ ایسی حرکتیں کرتے ہوئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تو آخر گئی کس پر ہے۔ ارے فساد کی جڑ تو آخر مر کیوں نہیں جاتی۔'' ماں اس پر غصہ نکال رہی تھی۔ اور فوزیہ چپ چاپ کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔

''امی! آپ بھی مجھے ہی غلط کہتی ہیں۔ میں کیا کروں، کہاں جاؤں؟'' صباء رو دینے کے قریب تھی۔ عرفان تلخی سے بولا۔

''امی! اس کو بھی یہاں سے دفعہ کیجیے۔ خواہ مخواہ کی بے سکونی پھیلا رکھی ہے۔''

ماں کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اچانک رضوان کچن میں داخل ہوئے ایک نظر ماں اور بھائی پر ڈالی پھر صباء سے مخاطب ہوئے۔

''ارے بھئی صباء تمہاری دوست روحی آئی ہے۔ جاؤ اس کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔''

''مگر بھائی جان کھانا۔'' صباء نے کہنا چاہا۔

''تم جاؤ۔'' رضوان نے اس کی بھیگی آنکھیں دیکھ کر کہا۔ ''کھانا امی یا تمہاری بھابی دیکھ لیں گی۔''

''جی بہتر بھائی جان!'' صباء باہر آئی تو روحی برآمدے میں کھڑی تھی۔ صباء اس کو ساتھ لیے اپنے کمرے میں آئی اور شکوے بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ آج میری یاد کیسے آ گئی؟''

''جب تم کو نہ آئی تو مجھے آ گئی۔'' روحی نے آہستہ سے کہا۔

''چلو اچھا ہوا۔'' صباء مسکرائی۔ ''تم سے ملنے کو بہت دل چاہتا تھا مگر فرصت ہی نہیں ملتی جو تمہاری طرف آ سکتی۔''

''ہاں دیکھا بھی ہے اور سنا بھی ہے کہ تمہیں فرصت کیوں نہیں ملتی۔ میں تو کافی دیر سے کھڑی سب کچھ سن رہی تھی کہ اچانک رضوان بھائی آ گئے۔''

''اچھا......'' صباء کی سمجھ میں نہ آیا اس موقع پر کیا کہے۔

''بیمار ہو کیا؟'' روحی نے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں تو بیمار کیوں ہوتی بھلا۔'' صباء نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا......" کہتے ہوئے روحی نے اس کا ہاتھ پکڑا پھر چونک کر بولی۔ "صباء کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہیں بخار ہو رہا ہے۔"

"ہاں یونہی معمولی سا۔" صباء کے ہونٹوں پر ابھی تک مسکراہٹ تھی۔ "یہ پریشانی کی بات تو نہیں۔"

"ہاں یہ پریشانی کی بات تو نہیں۔ یہ بخار تو تھکن کا ہے سارے گھر کا کام تم اکیلی کرتی ہو نا۔"

"ارے کام کون سا ہے۔" صباء اسی لہجے میں بولی۔ "کھانا بنانا اور فرش صاف کرنا باقی رہے کپڑے تو وہ مشین دھوتی ہے اور برتن ملازمہ صاف کرتی ہے۔"

"گویا کھانا بنانا کوئی کام ہی نہیں اور کپڑے صرف مشین میں ڈالنے ہوتے ہیں۔ باقی سب کام بھی مشین خود انجام دیتی ہو گی۔ صباء پلیز۔" روحی پوری سنجیدگی سے بولی۔ "ابھی وقت ہے خود کو یہ اذیت، یہ سزا مت دو۔ مجھ سے کچھ چھپاؤ مت۔ اب بھی وقت ہے۔ آفاق صرف تمہاری ہاں کا تمہارے ان لفظوں کا منتظر ہے کہ "آفاق اب لوٹ آؤ۔"

"یہ ممکن ہوتا روحی تو میں اس کو جانے نہ دیتی۔ یہ فیصلہ جو میری پوری زندگی کا فیصلہ تھا تمہارے خیال میں میں نے یونہی کر لیا۔ نہیں ڈیئر بہت سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر خیر اب ان باتوں کو دوہرانے کا فائدہ۔ اب تو سب کچھ بیکار ہے۔ اب روحی کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا۔" روحی اس کو گھورتے ہوئے بولی۔ "اب تو فری، راہی کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ اب بھی وقت ہے صباء پلیز خدا کے لیے خود کو ضائع مت کرو، یہ سب ایثار، محبت، یہ اس زمانے کی باتیں نہیں ہیں، ہر کسی کو اپنی خوشیوں سے غرض ہے پھر تم کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہو۔ خدا کے لیے انسان بن جاؤ۔"

"ارے چھوڑو ڈیئر! تم اتنے عرصہ بعد آئی ہو اور بیکار کی باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔"

"یہ بے کار کی باتیں ہیں؟" روحی نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا۔

"بے کار نہیں مگر بے وقت کی ضرور ہیں۔" صباء نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"خیر دفعہ کرو اپنی سناؤ کیسی گزری ہے۔ باقی سب گھر والے تو خیریت سے ہیں نا؟"

"بالکل خیریت سے ہیں۔ تمہیں اپنی شادی کا کارڈ دینے آئی تھی۔"

"ارے کیا واقعی یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"ہاں صباء، شادی عورت کی زندگی کا لازمی جزو ہے۔ پتہ نہیں تم کیسی عورت ہو۔"

"چھوڑو بھی اس بات کو، کوئی اچھی سی بات کرو۔"

"سوری صباء! مجھے جلدی ہے۔ تم ضرور آنا میری شادی پر۔ آؤ گی نا؟"

"ارے جناب! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آپ کی شادی ہو اور ہم نہ آئیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"اچھا تو پھر ٹھیک ہے۔ میں چلتی ہوں۔" روحی اٹھتی ہوئی بولی۔

"مگر ڈیئر کچھ پی کر جانا، ایسے تم نہیں جا سکتیں۔" صباء بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"نہیں صباء! یہ تمہارا گھر نہیں۔ ممکن ہے تم میرے لیے کچھ لے کر آؤ اور تمہاری بھابی چھین لیں۔ یہ بہتر نہ ہو گا۔ میں یونہی چلی جاؤں گی۔" صباء گم صم کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ ایک لفظ بھی تو منہ سے نہ بولی تھی۔

"ارے ہاں۔" چلتے چلتے روحی خود ہی رک گئی۔ پرس کھول کر چھوٹا سا کیمرہ نکالا اور صباء کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

"تمہاری ایک تصویر کی مجھے شدید ضرورت ہے اجازت ہو تو لے لوں۔"

"مگر کیوں؟" صباء نے اپنے میلے کچیلے کپڑے اور خراب بالوں کا خیال کرتے ہی حیران ہو کر پوچھا۔ مگر اسی اثناء میں روحی پھرتی کا مظاہرہ کرتی ہوئی اس کی تصویر لے چکی تھی۔

"میں تمہارا مطلب خوب سمجھتی ہوں روحی۔" صباء نے احتجاج کیا۔ "میرا حلیہ دیکھا ہے تم نے۔"

"تم کبھی کچھ نہیں سمجھیں صباء! اگر سمجھتیں تو یوں خود کو برباد نہ کرتیں۔ یقین کرو آفاق بھائی تو میری شادی پر بھی نہیں آ رہے۔ وجہ ظاہر ہے تم ہی ہو۔ صباء پلیز کبھی تم بھی بیتے دنوں کو یاد کرنے کی کوشش کرو، وہ دن جو تم سے اور آفاق بھائی سے وابستہ تھے۔"

روحی تو چلی گئی اور صباء وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ وہ خوبصورت دن یاد بن کر آنکھوں میں اتر آئے اور وہ بیڈ سے ٹیک لگائے حسین یادوں میں کھو گئی۔



میٹرک کے بعد گھر والوں نے اسے پڑھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ صباء کو بھی بی۔

اے کرنے کا کوئی شوق نہ تھا۔ مگر روحی کا ساتھ چھوٹنے کا بے حد دکھ تھا۔ روحی جو اس کی اکلوتی اور پُرخلوص دوست تھی یہی وجہ تھی سکول چھوڑنے کے بعد بھی صباء اس کو بھول نہ سکی تھی جب کبھی اسے تھوڑا سا بھی وقت ملتا تو وہ روحی سے ملنے ضرور جاتی۔

اس دن بھی وہ روحی سے ملنے آئی تو روحی اخبار ہاتھ میں لیے ریحان بھائی سے جھگڑا کر رہی تھی۔

''بھائی جان! خواہ کچھ بھی ہو جائے یہ تصویروں کی نمائش تو آپ کو مجھے ہر حال میں دکھانی ہے۔''

''اچھی بہن! تم سمجھتی کیوں نہیں۔ میرے پاس وقت نہیں۔'' ریحان پیچھا چھڑانے کی کوشش میں تھے۔

''تو پھر میں کس کے ساتھ جاؤں؟'' روحی نے بگڑ کر پوچھا۔

ریحان بھائی کچھ کہنا چاہتے تھے کہ صباء پر نظر پڑ گئی اور وہ ایک دم خوشی سے چلائے۔

''دیکھو روحی! صباء آئی ہے اب تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو۔'' ریحان بھائی اپنی جان چھڑا کر باہر بھاگ گئے اور روحی، صباء کو دیکھنے لگی۔

''روحی! سکول کیا چھوٹا کہ تم دوستی بھول گئیں۔'' صباء نے شکوہ کیا۔ ''جب بھی مجھے وقت ملتا ہے میں تم سے ملنے چلی آتی ہوں مگر تم ایک بار بھی میرے گھر نہیں آئیں۔ کیوں؟''

''ارے میری جان! تمہاری دوستی کون کافر بھول سکتا ہے لیکن تمہیں پتہ ہونا چاہیے۔ میں کالج میں ایڈمیشن لے چکی ہوں اور تم گھر میں فارغ ہوتی ہو۔ تم ہی آ جایا کرو روز اسی طرح۔''

''جنابہ! گھر میں ایک سو ایک کام ہوتے ہیں۔'' صباء نے مسکرا کر کہا تو روحی ہنس کر بولی۔

''چلو پھر گنواؤ۔'' پھر اچانک کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''چلو صباء آرٹ گیلری چلتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے نوجوان مصور وسیم احمد کی تصاویر کی نمائش لگی ہوئی ہے۔ چلو دیکھنے چلتے ہیں۔''

''ہم دونوں؟'' صباء نے ایک نظر اس پر اور دوسری خود پر ڈالی۔

''اور کیا میں دیواروں سے کہہ رہی ہوں۔'' روحی نے گھور کر اسے دیکھا۔

''تم میرا مطلب نہیں سمجھیں روحی! یہ کام تو بڑے لوگوں کے ہیں۔''

''یار گولی مارو بڑے لوگوں کو۔ جب دوسرے لوگ دیکھ سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں دیکھ سکتے۔ پلیز چلو نا۔''

اگرچہ صباء کو بھی ایسی باتیں اچھی لگتی تھیں مگر وہ محض اسی وجہ سے انکار کر رہی تھی کہ اگر وقت زیادہ ہو گیا تو گھر پہ ڈانٹ پڑے گی۔ تاہم روحی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی اور اسے ہار ماننا پڑی۔ روحی نے جلدی سے لباس تبدیل کیا پھر بالوں میں برش کرتی ہوئی بولی۔ ''چلو اب چلتے ہیں۔''

''مگر روحی؟'' اچانک اس کی بھابی چلی آئیں۔ ''کیا تم پاگل ہو، صباء کو کچھ پینے کو دیا نہیں اور ساتھ لے جا رہی ہو۔ پہلے اسے کچھ کھلا پلا لو۔ کیا سوچے گی وہ تمہارے بارے میں؟''

''اچھی بھابی! آپ پانچ روپے دے دیں۔ ہم راستے میں سے سموسے کھا لیں گے۔'' بھابی نے پانچ روپے دیئے تو وہ دونوں مسکراتی ہوئی باہر نکل آئیں۔

آرٹ گیلری میں زیادہ رش نہیں تھا۔ وہ دونوں بڑے غور سے تصویروں کو دیکھتی ہوئی تفصیل سے ان پر تبصرہ بھی کیے جا رہی تھیں حالانکہ پینٹنگ کی الف، ب بھی انہیں نہ آتی تھی۔ اس کے باوجود ایک ایک تصویر بغور دیکھ رہی تھیں اور صباء گھبراہٹ میں سر سے ڈھلک جانے والے پلو کو بار بار پکڑ کر سر پر جمانے کی ناکام کوشش میں لگی ہوئی تھی۔ تب اچانک ہی دونوں ایک تصویر کے سامنے رک گئیں۔

''ہائے روحی! کتنی پیاری پینٹنگ ہے۔'' صباء نے بے ساختہ کہا۔

''واقعی۔'' روحی نے بھی تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''پتہ نہیں کتنے کی ہو گی؟'' صباء نے کچھ سوچتے ہوئے روحی کو دیکھا۔

''یہ کون سی مشکل بات ہے، چلو ابھی معلوم کرتے ہیں۔'' روحی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دونوں اِدھر اُدھر دیکھنے لگیں۔ پھر ایک کونے میں کھڑے مصور اور منیجر نظر آ گئے۔

''آؤ، مصور سے پوچھتے ہیں۔'' روحی آگے بڑھی تو صباء آنکھیں نکالتی ہوئی بولی۔

''میں یہیں کھڑی رہوں گی تم خود ہی پوچھ آؤ۔''

''ارے واہ، یہ اچھی زیادتی ہے۔ تصویر تم نے پسند کی ہے اور پوچھنے میں جاؤں، چلو تم بھی۔'' روحی اس کا ہاتھ پکڑ کر وسیم کے پاس جا پہنچی اور صباء دانت پیس کر اسے دیکھتی رہ گئی۔

''سنیے۔'' روحی نے صباء کے گھبرائے ہوئے چہرے کو ایک نظر دیکھ کر مصور کو مخاطب کیا۔

''کہیے۔ میں یہاں کھڑا ہی باتیں سننے کے لیے ہوں۔'' وسیم شرارت سے مسکراتے ہوئے پوری طرح ان کی طرف جھک آیا وہ دونوں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔

"فرمائیے، کیا کہنا چاہتی تھیں آپ؟" اب کے وسیم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"یہ سامنے والی تصویر کتنے کی ہے؟" روحی نے اطمینان کی ایک سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"کون سی۔" وسیم پھر ان کی طرف جھکا مگر اگلے ہی لمحے چونک کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "وہ پانچ ہزار کی ہے۔ ساتھ قیمت بھی لکھی ہوئی ہے۔ خاتون! کیا آپ ان پڑھ ہیں یا آپ نے دیکھا نہیں۔"

اس کی بے تکلفی پر صباء نے گھور کر روحی کو دیکھا۔ ایک بات کرتی تھیں تو جواب میں دس سننی پڑتی تھیں۔ اس پر ستم یہ کہ انہیں خاتون کہہ کر مخاطب کیا۔ غصہ تو روحی کو بھی آیا تھا اس کی باتوں پر۔ مگر وہ تو تصویر کی قیمت سن کر بے ہوش ہوتے ہوتے بچی تھی۔

"کیا اتنی زیادہ قیمت؟" روحی نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ "آخر اس تصویر میں ہے ہی کیا۔ ایک تنہا لڑکی اور ایک درخت۔"

"آپ کے خیال میں کتنے کی ہونی چاہیے تھی؟" وسیم نے اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"یہی کوئی پانچ...... سوا پانچ سو روپے کی۔" روحی نے ہنستے ہوئے کہا۔ صباء تو چپ چاپ ان کی بات چیت سن رہی تھی۔

"آپ کو خریدنے کا مشورہ کس نے دیا۔ آپ صرف دیکھتی رہیں۔" وسیم نے ہنس کر کہا۔

"میں تو صرف دیکھ رہی تھی یہ صباء کی بچی ہے نا۔ یہ ذرا لالچ میں آ گئی۔ اس نے کہا اچھی ہے چلو خرید لیں۔ بہر حال شکریہ۔" روحی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خیر...... خیر شکریہ کی کوئی بات نہیں۔" وسیم پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا مگر اچانک مسکرا کر چپ ہو گیا۔ اور صباء دانت پیستی ہوئی آہستہ سے بولی۔

"خواہ مخواہ ذلیل ہو گئے اس کی نظر میں۔"

"ارے چھوڑو یہ تو کوئی بات ہی نہیں۔ یہاں سب لوگ کوئی خریدنے تھوڑا آتے ہیں اور پھر ان میں تو وہ لوگ بھی ہوں گے جن کو پینٹنگ کی الف، ب کا بھی پتہ نہیں۔ ویسے بھابی کے پانچ روپے میرے پاس جوں کے توں پڑے ہیں۔ اگر یہ تصویر پانچ روپے کی ہوتی تو میں خرید کر تمہیں پریذنٹ کر دیتی۔ مگر مجبوری ہے۔" روحی نے کہا تو وہ دونوں ہنس پڑیں۔

"کیا خیال ہے اب واپس نہ چلا جائے اور اگلے ہی لمحے وہ دونوں ہال سے باہر چلی آئیں لیکن ابھی چند قدم ہی چلی تھیں کہ پیچھے سے ایک آدمی بھاگتا ہوا آیا۔

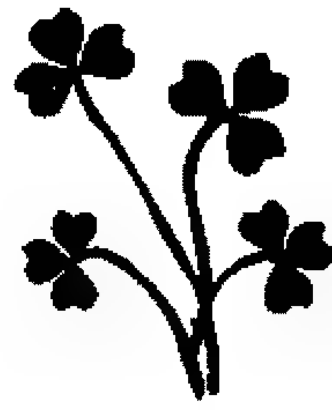
"بی بی جی! بی بی جی! یہ آپ کی تصویر۔"

"کیا......؟" صباء نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا۔ "کس نے کہا کہ یہ ہماری تصویر ہے۔"

"جی اس کا تو مجھے بھی پتہ نہیں بہر حال یہ تصویر آپ ہی کے لیے تھی۔" وہ تصویر چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ روحی کچھ دیر صباء کی طرف دیکھتی رہی پھر پینٹنگ اٹھاتی ہوئی بولی۔

"اس مصور کے بچے کی ایسی کی تیسی، آخر کیا سمجھ کر اس نے یہ پینٹنگ بھیجی ہے۔ اس کی جرأت کیسے ہوئی ہمیں پینٹنگ بھیجنے کی۔ چلو ذرا چل کر پوچھیں، اس مہربانی کا مطلب کیا ہے۔"

دونوں تیز تیز قدم بڑھاتی اور غصے سے کھولتی ہوئی ایک بار پھر ہال کا رخ کر چکی تھیں۔



وہ غصے سے بھری ہوئی وسیم کے قریب جا کر رکیں اور اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''یہ کیا مذاق ہے؟''

''جی میں سمجھا نہیں۔'' وسیم نے کمال معصومیت سے باری باری دونوں کو دیکھا۔

اس کی بے خبری پر روحی کی جان چلی گئی۔ اس نے دانت پیستے ہوئے وسیم کو دیکھا اور کوئی سخت بات کہنا ہی چاہتی تھی کہ صباء نے اسے اشارے سے روک دیا اور خود نرم لہجے میں پوچھا۔ ''کیا یہ تصویر آپ نے بھیجی ہے؟''

''میں نے؟'' وسیم نے خود پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''بننے کی کوشش مت کیجیے۔'' روحی آنکھیں نکالتی ہوئی بولی۔ ''آخر کیا سمجھ کر آپ نے یہ جرأت کی، آپ کی ہمت کیسے ہوئی ایسی حرکت کرنے کی۔ کیا ہم شکلوں سے ایسی ویسی لڑکیاں نظر آتی ہیں؟''

''محترمہ! کیسا بننا اور کیسی جرأت۔'' وسیم نرم لہجے میں بولا۔ ''میں ایک قلاش قسم کا مصور ہوں۔ میرے حالات اب اتنے اچھے بھی نہیں ہیں کہ میں راہ چلتی لڑکیوں کو پانچ پانچ ہزار کی پینٹنگ پریذنٹ کرتا پھروں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میرے بارے میں، باقی رہی آپ کی ایسی ویسی نظر آنے کی بات تو آپ تو شکلوں سے بڑی بے ضرر سی لڑکیاں نظر آتی ہیں بلکہ خاصی بے وقوف قسم کی۔''

''کیا......؟'' روحی نے جل بھن کر اسے دیکھا۔ خدانخواستہ وہ بے وقوف تو ہرگز نہ لگتی تھی البتہ صباء تھوڑی تھوڑی سی تھی۔ اس نے پاس کھڑی صباء کو غور سے دیکھا اور پھر اپنی سوچ پر لعنت بھیج کر ہنس پڑی۔

''اگر آپ نے نہیں بھیجی تو پھر یہ ہمارے پاس کیسے پہنچ گئی؟'' صباء نے روحی کی حرکتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کے پاس......'' وسیم نے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچنے کی اداکاری کی۔ ''ارے ہاں'' وہ اچانک چونک کر بولا۔ ''ابھی ابھی ایک صاحب نے قیمت ادا کر کے اسے لیا تھا مگر اب یہ...... اب یہ آپ کے پاس ہے میں نہیں جانتا ایسا کیسے ہوا، ہوسکتا ہے......'' خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا پھر دفعتاً چونک کر بولا۔ ''ارے کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے یہ پینٹنگ خریدی ہی آپ کے لیے ہو۔ میرا مطلب ہے انہی صاحب نے آپ کے لیے بھیجی ہوگی۔''

''مگر وہ صاحب ہیں کون؟'' صباء نے پوچھا۔

''وہ صاحب یہیں تھے آپ ان سے مل لیجیے۔'' وسیم نے کہا اور پھر حیرت سے چاروں طرف دیکھ کر بولا۔ ''کمال ہے ابھی تو یہیں پر تھے مگر اب......''

''اب کیا جہنم میں چلے گئے ہیں؟'' روحی غرائی۔

''جی مجھے معلوم نہیں۔'' وسیم نے سر ہلاتے ہوئے معصومیت سے کہا اور صباء کی ہنسی نکل گئی۔

''اچھی بات ہے۔'' روحی ہار مان کر بولی۔ ''چلو صباء اب چلتے ہیں، فضول میں وقت ضائع کرنے کا فائدہ۔''

''مگر روحی، یہ تصویر؟'' صباء کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

''ارے بابا یہ تصویر ہے کوئی جن بھوت نہیں جو ہمیں کھا جائے گا۔ دیکھو اب اگر کسی نے یہ نیکی کر دی ہے تو ساتھ لے جاتے ہیں۔'' پھر صباء اگر مگر کرتی رہ گئی اور روحی اسے نظر انداز کرتی ہوئی وسیم سے مخاطب ہوئی۔ ''مسٹر مصور! اگر وہ صاحب اتفاق سے آپ کو پھر نظر آجائیں تو ہماری طرف سے سر جھکا کر شکریہ ادا کر دیجیے گا۔ اوکے۔'' وہ مسکرائی۔

''جی بہت بہتر۔'' وسیم نے جلدی سے کہا اور جیسے ہی وہ دونوں باہر نکلیں وسیم اونچی آواز میں بولا۔ ''آجاؤ یار، بلائیں ٹل گئیں۔ جو پیسے دے کر تم نے مول لی تھیں۔'' اور آفاق جو ایک پورٹریٹ کے پیچھے کھڑے ہنستے ہوئے باہر آگئے۔

''توبہ یار! وہ لڑکیاں تو اس طرح جرح کر رہی تھیں کہ کیا بتاؤں۔'' وسیم نے کہا تو

آفاق قہقہہ لگاتے ہوئے بولے۔

''بتانے کی ضرورت نہیں میں سب کچھ سن چکا ہوں۔'' پھر سنجیدگی سے بولے۔ ''یار! یہ غربت بھی کیا چیز ہے۔ انسان اپنی کسی خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتا، بھلا سسک سسک کر جینا بھی کوئی زندگی ہے۔ بے چاری، نہ جانے اس کا کتنا دل چاہ رہا تھا اس پینٹنگ کو خریدنے کو مگر محض پیسے نہ ہونے کی وجہ سے حسرت سے اسے دیکھتی ہوئی واپس جارہی تھی۔ میں نے سوچا کسی کا دل خوش کرنا بھی تو نیکی ہے۔'' آفاق نے وضاحت کی۔

''ہاں، ہاں کیوں نہیں۔'' وسیم نے ہنس کر اسے دیکھا۔ ''نہ ماں، نہ باپ، یہ زمینیں اور بینک بیلنس تمہارا ہی تو ہے۔ خوب خرچ کیا کرو، ایسے نیک کاموں پر۔ ثواب ملے نہ ملے دل کو سکون ضرور ملتا ہے۔'' وسیم نے شرارت سے مسکراتے ہوئے چوٹ کی اور آفاق سنجیدہ ہوگئے۔

''سنو یار! اصل بات تو یہ ہے کہ وہ لڑکی...... کیا نام لیا تھا دوسری لڑکی نے اس کا؟ ہاں یاد آیا۔ صباء۔ یار کتنی معصوم تھی۔ بس وہ میرے دل میں کھب گئی ہے۔ میرا مطلب ہے، آنکھوں کے راستے سیدھی دل میں اتر گئی۔ آفاق آنکھوں کو جنبش دے کر مسکرائے۔

''سچ کہہ رہے ہو؟'' وسیم نے شک سے اسے دیکھا۔

''نوے فیصد سچ کہہ رہا ہوں اور اگر قسمت سے وہ دوبارہ مل گئی تو پھر سو فیصد سچ۔''

''اگر ایسی ہی بات تھی تو تمہیں، مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔ میں ان سے بات کر لیتا۔''

''اور جوتے کھا لیتا۔'' آفاق نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''دیکھو اگر وہ میری قسمت میں ہے تو دوبارہ مجھ سے ضرور ٹکرائے گی۔ خیر اب میں چلتا ہوں میرا ایک اپائنٹمنٹ ہے۔'' آفاق تیز قدموں سے چلتے ہوئے باہر آئے اور پھر ان کو وہاں موجود دیکھ کر مسکرا دیئے۔ وہ دونوں پینٹنگ پکڑے، بجائے خوش ہونے کے پریشان سی کھڑی تھیں۔ قریب سے گزرتے ہوئے وہ یونہی ذرا سا رکے اور پھر ان کی بات سن کر دل میں ہنس دیئے۔

''دیکھو صباء! اس قیمتی پینٹنگ کو تم ہی سجاؤ۔ میں اس کے بارے میں گھر جا کر کیا کہوں گی کہ کس نے دی ہے۔'' روحی نے پریشانی سے کہا۔

''اور میں کیا کہوں گی؟'' صباء نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ ''روحی! پلیز تم ہی لے جاؤ نا۔''

''ارے بھئی آپ کہہ دیجیے گا راستے میں پڑی ہوئی مل گئی تھی۔'' آفاق کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

''مگر راستے میں کوئی اتنی بڑی چیز نہیں پھینک سکتا اور وہ بھی بالکل نئی۔'' روحی نے جواب دیا اور پھر چونک کر آفاق کو گھورنے لگی۔ ''آپ...... آپ...... آپ کون ہوتے ہیں مشورہ دینے والے؟''

''جی میں......'' آفاق نے گھبرانے کی اداکاری کی۔ میں نے کون سے مشورے کے پیسے لیے ہیں۔ آپ پریشان تھیں سو مفت مشورہ دیا۔ پسند آیا؟'' آفاق نے مسکرا کر پوچھا۔

''آپ جا سکتے ہیں۔'' روحی نے گھورتے ہوئے کہا۔

''جی بہتر۔'' آفاق نے سر ہلایا۔ ''ویسے میرے پاس گاڑی بھی ہے۔''

''اور میرے پاؤں میں جوتا بھی ہے۔'' روحی نے ہنس کر کہا۔

''اچھا......'' آفاق نے حیرت سے اس کے پاؤں دیکھے۔ ''ویسے اس ہتھیار کے بارے میں میں نہیں جانتا تھا۔'' وہ شرارت سے ہنستے ہوئے چلے گئے اور صباء، روحی کو گھورنے لگی۔

''یہاں اس طرح کھڑے ہو کر تماشہ بننے سے بہتر ہے کہ چل دیں۔'' روحی نے کچھ سوچ کر کہا۔

''مگر روحی، اس پینٹنگ کے ساتھ۔'' صباء نے الجھ کر کہا۔

''اس کو یہیں کسی کونے میں چھوڑ دیتے ہیں۔ پتہ نہیں کس کمبخت نے یہ دشمنی کی ہے۔ یہاں آنے کی ساری خوشی غارت ہوگئی۔ الٹی یہ پریشانی گلے پڑ گئی۔''

''ایسی باتیں مت کہو روحی! وہ جو کوئی بھی ہے ایک اچھا اور عظیم انسان ہے۔ اس نے یقیناً ہماری حسرت بھری باتیں سن کر ہی یہ سب کیا ہوگا اور ایک تم ہو کہ مسلسل اس کو برا بھلا کہے جا رہی ہو۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔ ہاں بھئی ٹھیک ہے یہ تھی بھی تمہارے لیے، اب اگر اتفاق سے وہ صاحب مل گئے تو کیا ہمیں باقاعدہ شکریہ ادا کرنا ہوگا؟'' روحی نے شوخی سے پوچھا۔

''تمہیں تو بکواس کرنے کی عادت ہے۔ لاؤ میں لے جاتی ہوں۔'' صباء نے پینٹنگ پکڑ لی۔ مگر روحی کہاں پیچھا چھوڑنے والی تھی۔

''ہاں بھئی کیوں نہ لے جاؤ گی۔ تمہارے ہی لیے تھی۔'' اس نے کہا تو صباء چپ ہی

رہی اور پھر دونوں شاپ کی طرف چل پڑیں۔ ابھی تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ اچانک آفاق گاڑی لے کر سامنے آ گئے۔

''اگر آپ یہ تحفہ قبول کر چکی ہیں تو آیئے میں آپ کو ڈراپ بھی کر دوں۔'' آفاق نے کھڑکی میں سے سر نکالتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا...... یہ آپ نے؟'' روحی نے دانت پیس کر اسے دیکھا۔

''جی ہاں میں نے۔'' آفاق مسکرائے۔

''تم نے دیکھی اس کی ہٹ دھرمی۔'' صباء کچھ کہنے کی بجائے مسکرا دی۔

''تم مسکرا رہی ہو؟'' روحی نے جل کر پوچھا۔

''اچھا مسکراؤں نہیں تو اور کیا کروں؟'' صباء نے سادگی سے پوچھا۔

''مسکراؤ، ضرور مسکراؤ۔ اگر ایسی ہی تحفے کی خوشی تھی تو شکریہ کہا ہوتا بلکہ ادھر سے تو لفٹ کی پیشکش ہوئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھ گئی ہوتی۔'' روحی نے بھنا کر کہا۔

''میں نے انکار کب کیا تھا۔ تم ہی غصے سے پاگل ہوئی جا رہی تھیں۔'' صباء نے شرارت سے کہا تو روحی کو بھی ہنسی آ گئی۔

پینٹنگ صباء ہی اپنے ساتھ لائی تھی۔ نہ صرف پینٹنگ بلکہ آفاق کا تصور بھی ہمراہ تھا۔ شاید دل نے بھی جگہ دے دی تھی۔

اگرچہ صباء جانتی تھی کہ اب کبھی دوبارہ ان کی ملاقات نہیں ہوگی مگر اس کے باوجود وہ اسے بھول نہ سکی تھی۔ بھولتی بھی کیسے یہ اس کے دل کی پہلی تبدیلی تھی۔ اس نے خود تو براہ راست کوئی بات نہ کی تھی مگر وہ جو تھوڑی باتیں کر گیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے وہی ذہن میں گونجتی رہتی تھیں اور وہ بے اختیار مسکرا پڑتی تھی۔

روحی اب اکثر اس کے ہاں آنے لگی تھی۔ وہ جب بھی آتی پینٹنگ کے حوالے سے اسے مذاق کا نشانہ بناتی مگر صباء برا ماننے کی بجائے ہنس دیتی تو روحی معنی خیز انداز میں گردن ہلا کر کہتی۔ ''اے کاش یہ تحفہ تمہاری بجائے میرے لیے ہوتا۔ ذرا سوچو صباء جو بندہ ایک نظر دیکھ کر اتنا قیمتی تحفہ دے سکتا ہے وہ دوستی کے بعد کتنے قیمتی قیمتی تحفے دیتا اور شادی کے بعد تو بالکل ہی۔'' وہ بھنویں اچکا کر صباء کو دیکھتی اور صباء کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتی۔

انہی دنوں سب کچھ باپ کی عیاشی کی نظر ہو جانے کی وجہ سے گھر میں جھگڑے جنم

لے رہے تھے۔ دن رات کا سکون غارت ہو چکا تھا۔ کبھی باپ دھاڑتا ہوتا اور کبھی ماں چیخ چیخ کر بول رہی ہوتی۔ باپ تو کبھی کبھار چپ ہو جاتا مگر ماں اٹھتے بیٹھتے اندر باہر پھرتی اور بولے جاتی۔ انہی جھگڑوں کی وجہ سے صباء تقریباً پانچ ماہ روحی کے گھر نہ جا سکی۔ جھگڑے تو خیر ہمیشہ کے لیے شروع ہوئے تھے مگر اب ان میں پہلے والی شدت نہ تھی۔ پھر ایک دن ماحول جب پُرسکون تھا صباء نے ماں اور باجی دونوں سے اجازت لی اور روحی کے گھر چل دی۔

اتنے عرصہ بعد اسے اپنے گھر دیکھ کر روحی بہت خوش ہوئی اور پھر دونوں نے مل کر پینٹنگ والے واقعے کو یاد کیا اور خوب قہقہے لگائے۔ روحی کی امی اور بھابی گھر پر نہیں تھیں وہ دونوں باتیں کرتی رہیں اور ہنستی رہیں کہ اچانک روحی کے بھائی ریحان اندر چلے آئے۔ صباء نے انہیں سلام کیا تو وہ اسے دعا دیتے ہوئے روحی سے بولے۔

''اٹھو بھئی، جلدی سے اچھی سی چائے بنا دو میرے ایک دوست آئے ہیں۔''

روحی نے ایک نظر بھائی کو دیکھا اور بے زاری سے بولی۔ ''بھائی جان! فریج میں سے بوتل نکال کر دے دیجیے۔ میرا اٹھنے کا موڈ بالکل نہیں۔''

''پاگل ہو، دسمبر کی اس ٹھٹھرتی سردی میں کوک پلا کر مجھے اس کی قلفی نہیں جمانی۔''

''بھائی جان! میں بنا دوں۔'' صباء نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' ریحان ایک دم خوش ہو گئے۔ ''صباء تم بہت اچھی ہو مگر تمہاری یہ دوست روحی ایک دم کاہل، نکمی اور کام چور ہے۔'' ریحان نے اسے چھیڑا۔

''کیا کیا......'' روحی نے آنکھیں نکال کر بھائی کو دیکھا اور ریحان ہنستے ہوئے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

چائے بنا کر اندر بھیجنے کے بعد وہ دونوں خود بھی پینے لگی تھیں کہ روحی کی امی اور بھابی واپس آ گئیں۔ ''ارے صباء بیٹی کیسی ہو؟'' روحی کی امی نے اسے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''ایک دم اچھی خالہ جان!'' صباء نے مسکرا کر کہا۔

''اس بار بہت دنوں بعد آئی ہو۔'' روحی کی امی برقعہ رکھتی ہوئی بولیں۔ ''گھر میں تو سب خیریت ہے نا۔''

''امی جان! دنوں بعد نہیں، مہینوں بعد کہیے۔'' روحی کی بھابی نے مسکرا کر تصحیح کی۔

''میرے خیال میں تقریباً پورے پانچ ماہ بعد صباء آئی ہے اتنا عرصہ نہ آنے کی وجہ بتانا پسند

کرو گی؟"

"وجہ کیا ہو سکتی ہے بھابی جان! بس یونہی وقت نہ ملا۔" اب صباء انہیں اپنے گھر میں ہونے والی تیسری جنگ عظیم کے بارے میں کیا بتاتی۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد صباء اجازت لے کر جانے کے لیے اٹھی۔ روحی اسے دروازے تک چھوڑنے آئی اور پھر باہر کھڑی گاڑی دیکھ کر چونک پڑی۔

"ارے صباء یہ تو وہی گاڑی ہے۔" روحی نے گاڑی پر نظریں دوڑاتے ہوئے اسے دیکھا۔

صباء کا دل ایک انجانی خوشی سے دھڑک اٹھا۔ مگر اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیا اور بولی۔ "ہو سکتا ہے وہی ہو، یا پھر کوئی اور بھی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے اس رنگ کی یہی ایک گاڑی تو نہ ہو گی۔"

"نہیں۔" روحی انکار میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔ "مجھے سو فیصد یقین ہے یہ وہی گاڑی ہے کیونکہ گاڑی کے اندر وہی......" بات پوری کرنے سے پہلے ہی وہ چپ ہو گئی۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور ریحان کے ساتھ آفاق باہر آئے۔ روحی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں صباء کو اشارے کیے جنہیں نظر انداز کرتے ہوئے صباء نے خواہ مخواہ دوسری جانب دیکھنا شروع کر دیا۔ دل سینے کے اندر یوں تیزی سے دھڑک رہا تھا گویا چند لمحوں بعد سینہ پھاڑ کر باہر نکل آئے گا۔ صباء کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ نہ ہی اندر واپس جا سکتی تھی اور نہ ہی آگے بڑھ سکتی تھی۔ وہ جو صرف ایک بار اور آفاق کے ملنے کی دعا مانگا کرتی تھی اب اچانک اسے سامنے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

"کیوں بھئی صبا ، جا رہی ہو؟" ریحان نے اسے دروازے میں کھڑے دیکھ کر پوچھا جبکہ آفاق ایک طرف کھڑے بغور اس کا معائنہ کر رہے تھے۔

"نہیں تو...... ہاں! جی ہاں، جی ہاں۔" صباء نے بوکھلا کر جواب دیا تو نہ صرف روحی بلکہ آفاق بھی مسکرا دیئے۔ صباء نے انہیں دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"ریحان! کیا خیال ہے میں ان کو ڈ پ کر دوں؟" آفاق نے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔ اتنے عرصے بعد ملے ہوئے اس قیمتی موقعے کو وہ ہرگز ضائع کرنے کے موڈ میں نہ تھے۔

"خیال تو اچھا ہے۔" ریحان نے صباء کو دیکھا۔ "صباء! یہ تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔"

"نہیں بھائی جان! میں......" صباء ایک دم گھبرا گئی۔

"ارے صباء! گھبراؤ نہیں، یہ بھائی جان کے بہت اچھے اور بہت گہرے دوست ہیں۔ یہ تمہیں ڈراپ کر دیں گے۔" روحی نے جلدی سے کہا۔ کیونکہ وہ صباء کے دل کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ حالانکہ آفاق کو ریحان کے دوست کی حیثیت سے اس نے پہلی بار اور ابھی ابھی ہی دیکھا تھا۔ پھر صباء نہ...... نہ کرتی رہ گئی مگر اسے بیٹھنا پڑا۔ تاہم وہ فرنٹ سیٹ کے بجائے پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی پھر آفاق نے ان لوگوں کو خدا حافظ کہتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی۔ مگر صباء نے تو مارے غصے کے روحی کو خدا حافظ بھی نہیں کہا تھا۔

گاڑی جیسے ہی تھوڑی آگے بڑھی آفاق نے بات چیت کا آغاز کر دیا۔

"آپ تو اس دن کے بعد نظر ہی نہیں آئیں۔" اور وہ جو پہلے ہی بگڑی بگڑی بیٹھی تھی، تلخی سے بولی۔

"کیا میں نے دوبارہ نظر آنے کا وعدہ کیا تھا۔" دل ہی دل میں وہ روحی اور ریحان کو کوس رہی تھی۔ بھلا یہ بھی کوئی تک تھی بالکل غیر اور ایک اجنبی کے ساتھ اسے بھیج دیا۔ مرد کا کیا بھروسہ، یہی وجہ تھی اس نے آفاق کو سخت جواب دیا تھا۔

"ارے نہیں۔" آفاق ایک دم شرمندہ سے ہو گئے۔ "آپ نے تو وعدہ نہیں کیا تھا مگر نہ جانے کیوں میں کسی ایسی ہی ناگہانی ملاقات کا منتظر تھا۔"

صباء کا دل ایک دم دھڑک اٹھا۔ اس کے جی میں آیا کہے۔ میں بھی کسی ایسے ہی معجزے کی منتظر تھی۔ مگر وہ چپ ہی رہی اور آفاق نے پھر کہا۔ "آپ کو بھی خیال آیا تھا؟"

"کس کا؟" صباء نے چونک کر پوچھا۔

"میرا......" کہتے ہوئے آفاق نے آئینے میں اسے دیکھا۔ وہ ڈری سہمی سی سیٹ سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

"جی؟......" صباء کی سمجھ میں نہ آیا کہ کہے تو کیا کہے۔

"آپ نے جواب نہیں دیا؟" آفاق نے پھر پوچھا۔

"کیا جواب دوں؟" صباء نے حیرت سے پوچھا تو آفاق نے مسکراتے ہوئے گاڑی روک دی۔

"کچھ بھی کہیے۔"

"مثلاً......" صباء نے آفاق کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی......" صباء نے ایک نظر اسے دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"تو گویا یہ طے ہے کہ آپ کو بھی میرا خیال آیا تھا۔" وہ کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر مسکرا کر بولے۔ "چلیے یہ بات تو ختم ہوئی خیال کے آنے یا جانے کی، تاہم میں آپ کو یہ بتا دوں۔ آپ کو تو صرف خیال آیا تھا جبکہ میں آپ کے خیال میں ہی گم رہا۔" وہ سیدھا ہو کر پھر ڈرائیو کرتے ہوئے بولا۔

صباء نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ وہ اس کی بے تکلف باتوں سے گھبرا گئی تھی۔ اس نے سوچا ابھی اس نے اتنی باتیں کی ہیں۔ آگے چل کر نہ جانے اور کتنی باتیں کرے گا۔ یہی سوچ کر وہ بولی۔ "پلیز یہیں گاڑی روک دیجیے۔"

"کیوں......؟" آفاق نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ "آپ نے تو کہا تھا آپ کا گھر۔"

"پلیز......" صباء نے خاموش نظروں سے التجا کی۔ وہ کسی انجانے خوف سے ہولے ہولے لرز رہی تھی۔

"اچھا، اچھا......" کہتے ہوئے آفاق نے گاڑی روک دی اور ہاتھ بڑھا کر جیسے ہی دروازہ کھولا تو صباء جلدی سے باہر نکل آئی۔ صباء نے جانے کے لیے قدم بڑھایا تو وہ جیسے ہوش میں آ گئے۔ "کم از کم شکریہ تو ادا کر دیجیے۔" آفاق نے اسے جاتے دیکھ کر کہا۔ پھر وہ شکریہ کہتی ہوئی جلدی سے گھبرا کر پلٹ گئی۔ آفاق کی آنکھوں میں چاہت کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ آفاق کھڑکی پر سر ٹکائے محویت سے اسے جاتے دیکھتے رہے اور جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئی گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ صباء سے کچھ کہنا بے کار ہو گا کیونکہ وہ بہت سادہ اور شرمیلی لڑکی تھی۔ انہوں نے سوچ لیا وہ صباء کی بجائے براہ راست اس کے ماں، باپ سے بات کریں گے اور اپنے اس فیصلے پر وہ مطمئن اور مسرور تھے۔

یہ تھی ان کی دوسری ملاقات، جس میں آفاق نے تو جو محسوس کیا تھا سو کیا تھا، خود صباء نے بھی محسوس کیا تھا کہ وہ آفاق کو پسند کرنے لگی ہے۔ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ آفاق کا اور اس کا میل اگر ہوا تو ایک معجزہ ہی ہو گا اور وہ خدا سے اس معجزے کے لیے دعائیں کرنے لگی کیونکہ اس کے دل میں آفاق بس گیا تھا۔ وہ بڑی شدت سے آفاق سے محبت کرنے لگی تھی۔

"محبت" یہ ایک لفظ جیسے سوچتے ہی ایک عجیب سا سکون اس کے اندر باہر پھیل جاتا۔

"صباء صباء...... ارے کمبخت کیا سوچ رہی ہے جو میری آواز سنائی نہیں دی۔" ماں کی تلخ آواز سن کر وہ خیالات کی دنیا سے باہر نکل آئی۔ "تمہاری سہیلی تو کب کی چلی گئی مگر تم ابھی تک یہیں چپکی بیٹھی ہو کن خیالوں میں رہنے لگی ہو؟ تمہیں کچھ کام کا بھی ہوش ہے، سب لوگ کھانا کھا چکے ہیں۔ آج برتن صاف کرنے والی نہیں آئی۔ چل کر پہلے کھانا کھا لے اور پھر برتن صاف کر لے۔ جوں کے توں میز پر پڑے ہیں۔ یہ کمبخت نوکرانی بھی اب ہر دوسرے تیسرے روز چھٹی کرنے لگی ہے۔ مہینے میں جب دس دن کام خود ہی کرنا ہے تو اس کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب آئی تو صاف جواب دے دوں گی۔ ہمارے پیسے کوئی فالتو تھوڑی ہیں۔" وہ بڑبڑائے جا رہی تھیں۔ صباء نے سوچا جب ایک نوکر گھر میں موجود ہے تو دوسری کو رکھنے کا فائدہ؟ مگر وہ سب ماں سے نہ کہہ سکی کہا تو صرف اتنا۔

"امی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ خود ہی کھانا کھا لیں اور خود ہی برتن صاف کر لیں۔ میں آرام کروں گی۔"

"کیا......؟" ماں نے الجھ کر اسے دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کھانا رکھ دیں اور برتن خود صاف کر لیں۔" صباء نے کہا تو ماں بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔ ہنہ مجھے تو جیسے نوکر سمجھ رکھا ہے۔ میں ہرگز ہرگز برتن صاف نہیں کروں گی۔ پہلے کام کچھ کم تو نہیں جو برتنوں کا اور اضافہ کر لوں۔ میں مر جاؤں یا زندہ رہوں، اس بات سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں، ان کو صرف اپنے کام سے دلچسپی ہے۔ اس نے سر جھٹکا اور پھر خیالات کی اسی حسین دنیا میں کھو گئی۔ جسے آج وہ مدتوں بعد یاد کر رہی تھی۔

ایک ہفتہ بمشکل گزرا ہو گا کہ روحی ہانپتی کانپتی آ پہنچی۔

"ارے، ارے یہ تجھے ہوا کیا؟ ہانپ کیوں رہی ہے؟ خیریت تو ہے؟" صباء مسکرائی۔

"اللہ، صباء! میں تمہیں کیا بتاؤں۔" روحی اس پر تقریباً گرتے ہوئے بولی۔ "وہ آفاق بھائی ہیں نا وہ جو......" روحی نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اچھا تو تمہارا نام آفاق ہے۔" صباء نے دل میں سوچا مگر بظاہر انجان بن کر بولی۔

"آفاق...... آفاق؟ کون آفاق؟" روحی نے شرارت سے اسے دیکھا اور ہنس کر بولی۔

"اب اتنی بھی بھولی مت بنو بنّو! میں سب سمجھتی ہوں۔ ارے بھئی وہی آفاق۔" وہ مسکرانے لگی۔ صباء نے شرارت سے نفی میں سر ہلایا تو وہ آنکھیں نکال کر بولی۔ "وہی آفاق!

جس نے تمہیں پانچ ہزار کا پہلا تحفہ دیا تھا کیا بھول گئیں۔"

"اچھا وہ آفاق....." صباء جو بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کر رہی تھی۔ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور روحی ناراض ہوگئی۔

"مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا کہ تم سب کچھ جانتی ہو۔ اس دن گاڑی میں اس کے ساتھ ہی تو آئی تھی۔ خوب باتیں ہوئی ہوں گی۔ صرف مجھے نہیں بتانا چاہتی۔" روحی کا منہ پھول گیا۔ اسے ناراض دیکھ کر صباء ساری شرارت بھول گئی۔ جلدی سے بولی۔

"تمہارے سر کی قسم روحی! گاڑی میں اس دن انہوں نے دو چار باتیں کی تھیں۔ میں تو صرف ہوں۔ ہاں ہی کرتی رہی۔ تم ایک ہی تو میری دوست ہو۔ کیا میں تم سے کوئی بات چھپا سکتی ہوں؟" صباء چپ ہو کر اس کے غصیلے چہرے کو دیکھنے لگی۔ روحی کچھ دیر یونہی منہ بنا کر بیٹھی رہی اور پھر جو ہنسنا شروع کیا تو ہنستی چلی گئی۔ صباء حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی کہ کہیں اس کا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ اچانک اس کی ہنسی کو بریک لگی اور وہ چہک کر بولی۔

"دیکھا کیسا منٹوں میں تمہاری شرارت کا بدلہ لیا۔ صباء! مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی نہیں جانتا۔ میں نہ تمہارے بارے میں کوئی غلط بات سوچ سکتی ہوں اور نہ ہی سمجھ سکتی ہوں۔" اس کی بات سنتے ہی صباء کا منہ بن گیا۔

"تم بہت خراب ہو روحی!"

"جی نہیں میں بہت اچھی ہوں۔" روحی نے اٹھلا کر کہا۔

"واقعی؟" صباء زور سے ہنس پڑی کیونکہ مزید ناراض ہو کر وہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جبکہ روحی آئی ہی آفاق کی بات کرنے تھی۔ اور وہ جلد از جلد آفاق کی باتیں سننا چاہتی تھی۔

"سنو صباء! آفاق نے تمہاری رائے معلوم کی ہے۔" اب روحی بھی سنجیدہ ہوگئی تھی۔

"کس کے بارے میں؟" صباء نے انجان بن کر پوچھا۔

"اپنے بارے میں جناب اور کس کے بارے میں۔" روحی نے اسے آنکھیں دکھائیں۔

"ہوں۔" صباء کچھ سوچنے لگی۔

"یار بور مت کرو میں جانتی ہوں تمہاری رائے۔ بس یہ سمجھو، دولہا راجا آئیں گے اور تم کو لے جائیں گے۔" روحی کی نظروں میں شوخی ہی شوخی تھی۔

"کیا انہوں نے خود تم سے کچھ کہا ہے؟" صباء نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں کہا تو انہوں نے بہت کچھ ہے۔" روحی ہنس کر بولی۔ "پہلی بات تو یہ کہ انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا۔ بقول ان کے میرے کہنے پر ہی تم ان کی گاڑی میں بیٹھی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ تم بہت بے وقوف ہو، میرا مطلب ہے انہوں نے کہا تھا کہ بہت سادہ ہو۔ کیونکہ تم نے ان کی کسی بھی بات کا جواب نہیں دیا۔ شاید اسی لیے انہوں نے اب میری خدمات حاصل کی ہیں اور تمہاری رائے تو اب مجھے معلوم ہو ہی گئی ہے۔ دراصل وہ بہت بے تاب ہیں اور تمہارے ماں، باپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا بک رہی ہو؟" صباء کی سمجھ میں اس کی کوئی بات نہ آ رہی تھی۔

"جناب بک نہیں رہی، فرما رہی ہوں۔ یعنی امی اور ریحان بھائی، آفاق کا پرپوزل لے کر تمہارے گھر آئیں گے اور....."

"پلیز روحی.....!" صباء نے اسے روک دیا۔ "تم نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنی جگہ درست سہی، مگر ہمارے گھر کے حالات سے تم بخوبی واقف ہو ابھی تو باجی۔"

"ارے تم فکر کیوں کرتی ہو۔ تمہارے آفاق کو دولت کا کوئی لالچ نہیں ان کے پاس بہت مال ہے۔ اگر نہیں ہے تو صرف ایک بیوی۔" اس کا لہجہ پھر شرارتی ہوگیا۔

"پھر بھی روحی!" صباء نے کچھ کہنا چاہا۔

"ارے چھوڑو کہا نا انہیں صرف تمہاری ضرورت ہے۔"

"میں جانتی ہوں انہیں کسی چیز کا لالچ نہیں مگر....."

"اچھا یہاں تک معلومات ہیں۔" روحی نے ہنس کر کہا تو صباء بھی ہنس پڑی۔

"مگر یہ بھی تو دیکھو روحی! اگلے ماہ باجی کی شادی ہو رہی ہے۔ ان کی شادی کے بعد ماں، باپ میرے بارے میں سوچیں گے۔ تم آفاق سے کہنا وہ ابھی رک جائیں، تھوڑا انتظار کر لیں۔"

"آخر کیوں انتظار کریں، یہ اچھا نہیں کہ باجی کے ساتھ ہی تمہاری رخصتی بھی ہو جائے۔"

"تم میری امی کو اچھی طرح جانتی ہو پھر بھی ایسی بات کہتی ہو۔ منظوری تو بعد کی بات ہے۔ آفاق کا رشتہ آنا ہی شاید انہیں ناگوار گزرے کیونکہ آج کل ہمارے مالی حالات بہت خراب ہیں اور ایسے میں کوئی بات بھی امی کو اچھی نہیں لگتی۔ وہ ہر بات میں سو سو کیڑے

نکالتی ہیں۔ اگر انہوں نے آفاق کے لیے انکار کر دیا تو ہم کیا کر لیں گے ان کا؟'' صباء نے اسے سمجھایا۔

''او۔ کے۔ جیسے تمہاری مرضی!'' روحی نے بات ختم کی اور چلی گئی اور صباء، آفاق کے بارے میں سوچنے لگی۔ سڑک پر چلتے چلتے یہ کیسا اتفاق ہوا تھا۔ وہ آپس میں ٹکرائے اور محبت کے بندھن میں بندھ گئے۔ یعنی محبت کی جتنی شدت اِدھر تھی اتنی ہی اُدھر بھی تھی۔ بے شک اس نے پاکیزہ راستے کا انتخاب کیا تھا اور صباء کو محبت کے ساتھ ساتھ اس پر فخر بھی تھا۔

گھر میں زاہدہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں اور صباء اپنے ہی حسین تصورات میں کھوئی ہوئی ہر بات نظر انداز کر کے خوشی خوشی کام میں مگن تھی۔ گھر کے سب لوگ اس کی اس کیفیت سے بے خبر تھے اور وہ دن رات ہنستے مسکراتے آنے والے حسین دنوں کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔ عمر بھی تو یہی تھی اس کی سپنے سجانے کی۔ پھر زاہدہ کی شادی ہو گئی اور گھر میں وہی پرانے لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے۔ مگر صباء اپنے آپ میں ہی مگن رہی، اب کوئی بھی پریشانی دل میں نہ اترتی تھی دل میں تو وہ براجمان ہو گیا تھا۔

برسات کے دن تھے، موسم بہت خوبصورت ہو رہا تھا۔ گھومنے کے لیے صباء کا دل مچل اٹھا۔ اس نے ماں سے اجازت لی اور روحی سے ملنے چلی آئی۔ آفاق سے تو اس کے بعد پھر ملاقات ہی نہ ہوئی تھی۔ اب جو آئی تو شاید روحی نے اسے فون کر دیا تھا کیونکہ کچھ دیر بعد ہی وہ بھی آ پہنچا۔ وہ سب لوگ باہر لان میں بیٹھے تھے۔ وہ بھی وہیں آ کر بیٹھ گیا اور باتوں میں شامل ہو گیا۔ باتیں کرتے کرتے وہ ایک اچٹتی سی نظر صباء پر بھی ڈال لیتا جو اس کے آنے سے خواہ مخواہ نروس ہو رہی تھی۔ اتنے میں روحی چائے اور پکوڑے بنا کر لے آئی اور شرارت سے چائے کا کپ صباء کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''صباء یہ ذرا آفاق بھائی جان کو تو پکڑا دو۔'' صباء نے گھور کر روحی کو دیکھا مگر چائے کا کپ لینا ہی پڑا اور کپ پکڑتے ہوئے آفاق اس کی کیفیت سمجھ کر مسکرا دیئے۔ پھر روحی بھی گفتگو میں شامل ہو گئی۔ باتیں کرتے کرتے وہ کوئی ذومعنی جملہ صباء کی طرف اچھال دیتی۔ کچھ دیر تو صباء برداشت کرتی رہی مگر جب حالات اس کی برداشت سے باہر ہونے لگے تو وہ اجازت لے کر کھڑی ہو گئی۔ ظاہر ہے وہ تو روحی سے ملنے آئی تھی مگر یہاں تو اب کچھ اور ہی معاملہ ہو گیا تھا۔

''اچھا امی جان اب میں بھی چلتا ہوں۔'' اس کے اٹھتے ہی آفاق بھی اٹھا تو روحی نے پوچھا۔

''کیا بات ہے بھائی جان! آپ ابھی آئے اور ابھی جا رہے ہیں؟'' اس کی آنکھوں میں شرارت ہی شرارت تھی۔ آفاق نے بہ مشکل ہنسی دبائی اور سنجیدگی سے کہا۔

''دراصل مجھے ایک دوست سے ملنا ہے۔'' انہیں اٹھتا دیکھ کر صباء عجیب شش و پنج میں کھڑی رہ گئی اور آفاق جاتے جاتے رک گئے۔

''ارے ہاں امی جان! اگر آپ کہیں تو آپ کی مہمان کو ڈراپ کرتا جاؤں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' انہوں نے فوراً کہا۔ ''جاؤ صباء! آفاق تمہیں چھوڑ دے گا۔'' صباء جانتی تھی انکار کرنا فضول ہو گا۔ چپ چاپ خدا حافظ کہتی ہوئی آفاق کے ساتھ باہر آ گئی۔

''آفاق بھائی میرا شکریہ تو ادا کرتے جایئے۔'' روحی نے پیچھے سے ہنس کر کہا۔ آفاق سر کو خم دے کر مسکرایا اور صباء، روحی کے گھورنے کی وجہ سے جلدی سے اندر چلی آئی۔ آفاق نے صباء کو دیکھا اور فرنٹ ڈور کھول دیا۔

''دیکھیے میں.....'' صباء انکار کرنا چاہتی تھی۔

''آؤ بیٹھو صباء! میں تمہیں کھا نہیں جاؤں گا۔'' آفاق نے نرم لہجے میں کہا اور صباء ہچکچاتی ہوئی بیٹھ گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی آفاق نے گاڑی کا رخ شہر سے باہر کی جانب موڑ دیا۔ صباء نے سب کچھ دیکھا مگر چپ رہی۔ اچھی سی جگہ دیکھ کر آفاق نے گاڑی روک دی اور گود میں ہاتھ رکھے گم صم سی بیٹھی صباء سے مخاطب ہوئے۔

''کیا خیال ہے یہیں باتیں کر لوں یا گاڑی سے باہر چلو گی؟''

''جو کہنا ہو کہہ لیجیے۔ میں باہر نہیں جاؤں گی۔'' صباء نے بے ساختہ کہا اور آفاق زور سے ہنس دیئے۔

''صباء آج پورے چھ ماہ بعد تمہیں دیکھا ہے۔ کیا میں بتاؤں کہ یہ عرصہ کس تڑپ، خلش اور بے چینی کی نذر ہوا۔'' صباء نے نظر اٹھا کر دیکھا وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ صباء نے نظریں چرا لیں۔ ''کیا تم آج بھی چپ رہو گی آج تو کچھ بولو۔'' اب کے صباء نے نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا وہ جانتی تھی وہ پھر اسی کو دیکھ رہا ہو گا۔ آفاق کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار

کرتے رہے پھر کہا۔

''روحی نے تمہارے خیالات مجھ تک پہنچائے تھے.....'' اور صباء گھبرا گئی۔ اس نے تو روحی سے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ یہ روحی بھی پوری گدھی ہے۔ اس نے دل میں سوچا اس نے ضرور اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر بہت کچھ کہا ہو گا اور آفاق پتہ نہیں کیا سمجھے ہوں گے۔ آفاق کچھ دیر گاڑی سے باہر دیکھتے رہے پھر صباء کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔

''صباء! تم گم صم ہو یا میرے سامنے بولنا اچھا نہیں لگتا۔'' صباء نے ایک نظر اسے دیکھا، کچھ کہنا چاہا مگر پھر ہونٹ بھینچ لیے۔

''کچھ بولو گی یا نہیں؟'' آفاق نے بھرپور سنجیدگی سے سوال کیا۔ صباء پھر بھی چپ رہی۔ آفاق کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر رخ موڑتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے میں تمہیں سخت ناپسند ہوں۔ اگر یہ بات تھی تو تمہیں روحی کو کہہ دینا چاہیے تھا۔''

''جی دراصل میں نے روحی سے۔'' صباء کچھ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اپنی صفائی کس طرح پیش کرے۔ پھر اس نے سوچا چلو اچھا ہی ہے جو میں نہیں کہہ سکی وہ روحی نے کہہ دیا۔ اس نے آفاق کی جانب دیکھا۔ وہ ابھی تک ناراض، ناراض سا کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ دراز قد، خوبرو آفاق، ایسا ہی تو سپنا میں نے دیکھا تھا۔ ایک ایسا شخص جو بہت منفرد، بہت اعلیٰ، بہت عظیم اور بہت امیر ہو اور اب وہ ملا تھا تو وہ زمین سے خود کو اوپر اڑتا ہوا محسوس کرتی تھی۔ اب وہی شخص اس سے ناراض ہو کر بیٹھا تھا محض اس لیے کہ وہ اس کی محبت کا اقرار زبان سے نہیں کر رہی تھی۔

صباء نے سوچا یہ کتنا احمق ہے میری آنکھوں، میرے ہونٹوں بلکہ میرے روئیں روئیں سے اس کی محبت کا اظہار ہو رہا ہے اور یہ صرف میری زبان سے سننا چاہتا ہے۔ میں اسے اپنی محبت کی شدتوں کے بارے میں کیا بتاؤں اور کیسے سمجھاؤں۔ محبت لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ محبت سننے کی نہیں، سمجھنے کی چیز ہے مگر وہ کچھ نہ بولی۔ سڑک ویران ہی تھی اور اکا دکا جو گاڑیاں قریب سے گزر رہی تھیں۔ ان میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے نظر بھر کر انہیں دیکھا تھا۔ کچھ دیر گزر گئی اور آخر صباء کو اس کی جانب جھکنا پڑا۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولی مگر اپنا نرم و نازک ہاتھ اٹھا کر آفاق کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ آفاق نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اسی کو دیکھ رہی تھی اور پھر آفاق نے اس کا وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اگر چہ وہ

بولی نہیں تھی مگر اس کی خاموشی میں وہ اس کے اقرار کو سمجھ چکے تھے۔ ان کا چہرہ ایک دم خوشی سے کھل اٹھا۔

''صباء جانتی ہو میں اس دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ امی تو بچپن میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں اور دو سال قبل بابا بھی چل بسے، تب سے اب تک بالکل اکیلا ہوں۔'' صباء نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔ ''جانتی ہو صباء! سیالکوٹ میں ہماری بہت سی زمینیں ہیں مگر بابا کو وہ زندگی پسند نہ تھی۔ وہ شروع ہی سے شہر میں آ بسے تھے۔ یہیں میری تعلیم و تربیت ہوئی اور ابھی تک یہیں ہوں۔ یوں تو ابھی میرا گھر بسانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا مگر اس روز اچانک تمہیں دیکھا تھا تو.....'' وہ کچھ سوچ کر مسکرائے پھر بغور اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اس دن آرٹ گیلری میں جب تم بار، بار سر سے سرکنے والی چادر کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں تو میں تمہیں دیکھتا رہا۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا۔ تمہارا ایسا کرنا۔ تمہاری وہ ادا.....'' اور صباء مسکرا دی۔

''چلو شکر ہے تم مسکرائیں تو، مجھے تو یہاں بیٹھے بیٹھے ڈر لگنے لگا تھا۔'' اس کی بات پر صباء بے ساختہ ہنس پڑی.....اور آفاق مسکرا کر بولے۔

''ویسے صباء میں کافی عرصہ سے ٹرائی کر رہا تھا۔''

''کس بات کی؟'' صباء نے حیرانی سے پوچھا۔

''ارے بھئی قسمت آزمانے کی۔''

''یعنی آپ کی بہت ساری لڑکیوں.....'' صباء نے دکھ سے کہا۔

''ارے بابا پہلے پوری بات تو سن لو۔ دیکھو نا امی، بابا تو تھے نہیں مجھے خود ہی دیکھ بھال کر کے لڑکی کا انتخاب کرنا تھا اور میرا خیال ہے میں نے جس لڑکی کا انتخاب کیا ہے وہ یقیناً ایک اچھی اور منفرد لڑکی ہے اور بس اب یہ ٹرائی ختم، کیونکہ جس لڑکی کا انتخاب میں نے لیا ہے۔ اس کے بعد کسی اور کو خوش آمدید کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔''

''اچھا اب مجھے ڈراپ کر دیجیے۔'' صباء نے موضوع بدلنا چاہا۔

''ارے مگر اتنی جلدی؟'' آفاق نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''تم نے تو ابھی کوئی بات ہی نہیں کی۔ کچھ اپنے بارے میں بتاؤ اور کچھ اپنے گھر والوں کے بارے میں بتاؤ نا۔''

''گویا تفتیش کرنا چاہتے ہیں میری؟'' صباء نے شوخی سے پوچھا۔

"ارے نہیں۔" آفاق ہنس دیئے اور صباء نے مسکراتے ہوئے تمام تفصیلات اس کو بتا دیں، یہ بھی کہ آج کل ان کے مالی حالات بہت خراب ہیں۔ البتہ تیسری جنگ عظیم جو ان کے گھر میں چوبیس گھنٹے جاری رہتی تھی۔ اس کے بارے میں سب کچھ چھپا گئی۔

"اچھا صباء کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارے گھر آؤں۔ میرا مطلب ہے امی سے ملنے۔"

"میں منع نہیں کروں گی۔ تاہم اس کے بعد پیدا ہونے والے تمام حالات کی ذمے داری آپ پر عائد ہو گی۔"

"کمال ہے؟ تم تو ابھی سے ڈرانے لگی ہو۔" آفاق نے خوفزدہ ہونے کی ایکٹنگ کی۔ "اچھا خیر اسے چھوڑو میں......" وہ آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے۔

"اب اور کچھ نہیں۔ اگر میں کچھ دیر اور رکی تو مجھے دیر ہو جائے گی۔ بس جلدی سے مجھے ڈراپ کر دیں۔"

"ہوں......" آفاق نے مسکرا کر اسے دیکھا اور صباء ہنس دی۔

"چلو تمہاری اسی ہنسی کی وجہ سے واپس چلتے ہیں مگر ایک وعدہ۔"

"کیسا وعدہ؟" صباء نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھئی وہی جو ہمیشہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے۔ یعنی پھر کب ملاقات ہو گی؟" آفاق نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔ "چھ ماہ بعد یا چھ سال بعد؟" وہ شرارت سے ہنس رہے تھے۔

"جب آپ کہیں۔" صباء نے فوراً کہا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ، چلو کل ہی لارنس گارڈن آ جانا۔"

"کل......نہیں نہیں۔ اتنی جلدی میں گھر سے نہیں نکل سکتی۔"

"اچھا ٹھیک ہے صباء میں انتظار کروں گا۔ جب وقت ملے، روحی سے کہہ دینا۔" پھر اپنا وزٹنگ کارڈ دیتے ہوئے بولا۔

"اس پر میرے گھر اور آفس کا فون نمبر ہے۔" صباء نے کارڈ اس کے ہاتھ سے لیا تو وہ بولا۔ "ویسے اگر تم اس بندے کو کسی قابل سمجھو تو اپنا نمبر بھی دے دو۔" اور صباء نے اپنا نمبر بتا دیا۔ آفاق نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب تم فون کرو یا نہ کرو میں باقاعدگی سے کرتا رہوں گا۔"

"جی نہیں۔ گھر والوں سے جوتے کھلوایئے گا۔" صباء نے خفگی سے کہا۔

"جوتوں کی فکر مت کرو۔ تمہاری آواز سن کر ہی کچھ کہا کروں گا اور کسی دوسرے کی آواز سن کر فون بند کر دیا کروں گا۔" آفاق نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" صباء نے مسکرا کر کہا۔ "اب واپس چلیے۔"

"ضرور۔" آفاق مسکرایا اور اسے ڈراپ کر گیا۔



فون نمبر تو صباء نے دے دیا تھا مگر اب پریشان تھی۔ آفاق ہر دوسرے تیسرے دن باقاعدگی سے فون کرتا اور پوچھتا۔ "کیوں بھئی ملنے کا پروگرام بنا ہے کہ نہیں۔" اور صباء غصے میں "نہیں" کہہ کر فوراً ریسیور رکھ دیتی۔ محض اس کی وجہ سے وہ فون کے آس پاس رہنے لگی تھی۔

دونوں کی تیسری ملاقات لارنس گارڈن کے خوبصورت مگر پُرسکون گوشے میں ہوئی تھی اور اس ملاقات میں آفاق کی بے تابیاں عروج پر تھیں۔ بیٹھتے ہی بغیر بات کیے اس نے جیب سے ایک مخملیں ڈبیہ نکالی اور جب کھولی تو صباء ڈائمنڈ کی انگوٹھی دیکھ کر چونک پڑی۔ آفاق پُرشوق نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہاتھ لاؤ بھئی سوچ کیا رہی ہو۔" آفاق نے والہانہ انداز میں کہا۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" صباء نے بگڑ کر کہا۔ آفاق نے شرارت سے اسے دیکھا اور شوخی سے بولا۔

"تمہیں اگر میری ضروریات کا احساس نہیں تو اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں بھی تمہاری ضروریات کا خیال کرنا چھوڑ دوں۔"

"آپ کی ضروریات کیا؟ آپ کو بھی کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"جی جناب!" آفاق مسکرایا۔ "لیکن اگر میں نے بتایا تو محترمہ ناراض ہو جائیں گی۔" اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے آفاق نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا پھر انگلی میں انگوٹھی ڈالتے ہوئے بولا۔

"شاید دنیا کا ہر مرد میری طرح اس موقع پر یہی کہتا ہو صباء کہ تمہارے اور میرے درمیان یہ ایک تعلق ہی نہیں ایک بھرپور رشتہ پیدا ہو چکا ہے اور اسی رشتے کے ناطے میں یہ

انگوٹھی تمہاری نذر کرتا ہوں۔ میری خواہش ہے تم اسے کبھی خود سے جدا نہ کرنا۔ بے شک میں جدا ہو جاؤں۔''

''خدا نہ کرے۔'' صباء نے تڑپ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور سسکتے ہوئے بولی۔ ''جس طرح کے ہمارے گھر کے حالات ہیں انہیں دیکھ کر میں نے سپنے دیکھنے چھوڑ دیئے تھے مگر جب آپ ملے تو میں نے پلکوں پر پھر وہی خواب سجا لیے اور آپ کہتے ہیں کہ اگر میں جدا ہو گیا۔''

''اوہ صباء! تم کتنی اچھی ہو۔ میری سوچوں سے بھی بڑھ کر۔'' پھر نہ جانے آفاق کیا کچھ کہتا رہا اور صباء اس کی محبت میں مدہوش سی سنتی رہی اور مسکراتی رہی۔ وہ جو اس کو اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا۔ راستہ زیست کا کہتے ہیں کہ ہموار نہیں، کا مفہوم سمجھا رہا تھا اور صباء سوچ رہی تھی کہ اس کا آرٹ گیلری جانا ایک حادثہ ہو گیا اگر وہ نہ جاتی تو اس کی زندگی کے یہ دن اتنے حسین کیسے ہوتے دفعتاً گھڑی دیکھ کر وہ چونک پڑی۔

''ارے اتنا زیادہ ٹائم ہو گیا؟''

''واقعی......'' آفاق نے بھی چونک کر اسے دیکھا اور پھر دونوں ایک دوسرے کا سہارا لیتے ہوئے اٹھ گئے اور ہمیشہ کی طرح آفاق اسے ڈراپ کر گیا۔

اس کے بعد صباء کتنی بار لارنس گارڈن کے اس پُرسکون گوشے میں آفاق سے ملی اسے خود بھی یاد نہ رہا اسی دوران رضوان بھی ملک سے باہر چلا گیا۔ گھر کے حالات بھی بہتر ہو گئے۔ صباء کو یقین تھا اب کوئی رکاوٹ اس کے راستے میں نہیں آئے گی آفاق اور اپنی محبت پر اسے فخر تھا مگر وقت نے بڑا ظالم کردار ادا کیا تھا۔ وہ جو کبھی کبھی یہ سوچ کر پریشان ہو جاتی تھی کہ کہیں کوئی ان کے بیچ آ کر انہیں ایک دوسرے سے جدا نہ کر دے کوئی اور تو کیا آتا اسے خود ہی آفاق کو ٹھکرانا پڑا۔ یہ حقیقت اگرچہ بڑی تلخ تھی مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے تسلیم کرنا تھا کہ ٹھکرا چکی تھی اور اب دربدر خاک بسر ہو رہی تھی۔ دائمی جدائی ان کا مقدر بن چکی تھی اور دور دیس میں آفاق نہ جانے کس حال میں تھا۔ اس کی بے وفائی کے بعد وہ ایک بار بھی پلٹ کر نہ آیا تھا اور صباء خود بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ اب کبھی یہاں نہ آئے یہی وجہ تھی کہ اس نے آفاق کے خط کا جواب تک نہیں دیا تھا۔ اس کے شادی سے انکار کرنے پر زاہدہ آپا نے اسے کتنا سمجھایا تھا اور کہا تھا۔

''یاد رکھو صباء! ایک دن تم پچھتاؤ گی ایک عرصہ بعد تمہیں پتہ چلے گا۔ تمہیں محسوس ہو گا کہ تمہارا یہ فیصلہ غلط تھا۔ تب یقین جانو کفارے کی کوئی صورت نہ ہو گی صرف سزا ہو گی۔''

ان کی بات سن کر صباء نے دل میں کہا تھا۔ ''آپا ڈیئر یہ میرا فیصلہ کب ہے یہ فیصلہ تو ایک مجبوری ہے کسی کی امانت سنبھال کر رکھنے کے لیے۔ آپ کہتی ہیں۔ میں ایک عرصہ بعد پچھتاؤں گی۔ میں تو اب بھی پچھتا رہی ہوں۔ کیونکہ یہ فیصلہ میں نے خود نہیں کیا، مجھے کرنا پڑا ہے اور اس فیصلے کا انجام تو مجھے ابھی سے معلوم ہے پھر آپ کیوں ڈراتی ہیں۔'' مگر وہ چپ رہی تھی۔

''آپی آپ رو رہی ہیں۔'' اپنے بہت قریب فری کی آواز سن کر صباء اس طلسماتی دنیا سے باہر نکل آئی۔ پھر سامنے کھڑی فری کو دیکھ کر چونک کر سیدھی ہوتی ہوئی بولی۔

''فری! کب آئے تم لوگ پاکستان؟''

''کل رات۔'' فری کی بجائے شیراز نے جواب دیا اور صباء اٹھ کر اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔ ''راہی اور فراز نہیں آئے؟''

''ان کا پروگرام اگلے ماہ آنے کا ہے۔'' فری نے جواب دیا پھر آہستہ سے پوچھا۔

''آپ رو کیوں رہی تھیں؟''

''یونہی......'' صباء پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ ''جب بچھڑنے والوں کا خیال آتا ہے تو آنکھیں خودبخود بھر آتی ہیں۔''

''کون بچھڑ گیا آپ سے؟'' شیراز نے دلچسپی سے پوچھا۔

''میں فری اور راہی کی بات کر رہی ہوں۔ اتنی دور تو لے گئے ہو تم دونوں بھائی ان کو۔''

''ویسے آپی اگر آپ پسند کریں تو آپ بھی وہاں ہمارے پاس آ جائیں۔'' شیراز نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

''ہاں، ہاں۔'' فری نے بھی شوہر کی تائید کی۔ ''فراز بھائی بھی یہی بات کہہ رہے تھے۔ آپی چلیں گی نا آپ؟''

''لو بھئی یہ اچھی کہی۔ یعنی تم دونوں کے لیے باقی سارے لوگوں سے جدا ہو جاؤں۔'' صباء نے ہنسی میں بات ختم کر دی۔

رات کو وہ لوگ واپس چلے گئے اور صباء ایک بار پھر اداس ہو گئی۔ یونہی جب کبھی کوئی

بہن آتی تھی تو اس کا وقت اچھا گزر جاتا تھا کیونکہ ساری بہنیں بجائے بھابی کے اسی کے پاس وقت گزارتی تھیں۔ خاص کر جب گرمیوں کا موسم ہوتا تو عمر فاروق بھی سکول میں تعطیلات شروع ہوتے ہی پروین کے ساتھ آ جاتا۔ پھر پروین تو کچھ دن رہ کر چلی جاتی مگر عمر فاروق ساری چھٹیاں ختم ہونے پر ہی جاتا۔ اس دوران وہ نہ صرف صباء کا دل بہلاتا بلکہ کام کرنے میں بھی مدد دیتا اور جب کام ہو جاتا تو باقاعدہ صباء سے پوچھتا۔

''آنٹی! ہم اچھے ہیں نا؟'' اور وہ اس کو بے تحاشہ پیار کرتے ہوئے رو پڑتی۔

''آنٹی آپ روتی کیوں ہیں؟'' وہ اس کے آنسو پونچھتے ہوئے اداس ہو کر پوچھتا۔

''کچھ نہیں بیٹا!'' صباء اسے بہلا کر کپڑے دھونے کے لیے مشین لگاتی تو عمر ایک ایک کپڑا خود اس کو پکڑاتا۔

یہ تین ماہ اس لیے بھی خوشگوار گزرتے کہ فوزیہ زیادہ تر اپنے میکے والوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کبھی کشمیر اور کبھی سوات چلی جاتی۔ گرمیوں میں پہاڑ پر جانا اسی کی پرانی عادت تھی۔ تاہم جب سے نومی ہوا تھا فوزیہ نے خود جانا چھوڑ دیا تھا۔ البتہ ثناء اور نومی سکول میں تعطیلات ہوتے ہی بوریہ بستر باندھ کر نانی کے ہاں پہنچ جاتے جبکہ عمر اِدھر آ جاتا۔

کوشش کے باوجود صباء، روحی کی شادی میں نہ جا سکی تھی بلکہ گفٹ تک بھی نہ بھیج سکی۔ وجہ صرف ثناء کی بیماری تھی۔ جس کی طبیعت اس دن صبح سے ہی خراب تھی۔ صباء نے ماں سے اجازت چاہی تو وہ بگڑ کر بولیں۔

''تمہیں معلوم نہیں ثناء کو بخار ہے اور تمہیں شادی میں جانے کی پڑی ہے۔''

''امی، روحی میری ایک ہی دوست ہے۔'' صباء نے احتجاج کیا۔

''ایک ہے تو ایک ہی سہی۔ کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت جانے کی، رضوان آ گیا تو کیا کہے گا میری بچی بیمار ہے اور ان کو۔''

''بچی فوت نہیں ہو جائے گی۔'' صباء نے تلخی سے کہا۔ ''اور بھائی جان بھی کچھ نہیں کہیں گے آپ جانے دیں مجھے۔ نہیں تو روحی ناراض ہو جائے گی۔''

'امی اس کو کب اس گھر کی پرواہ ہے۔'' عرفان نفرت سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''کان کھول کر سن لو صباء تم نہیں جاؤ گی۔'' اتنے میں رضوان بھی آ گئے۔ ثناء کا سنا تو پریشانی سے بولے۔

''صباء تم جلدی سے برف لاؤ اور ٹھنڈی پٹیاں بنا کر ماتھے پر رکھتی جاؤ۔'' اور صباء خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی کوشش کے باوجود کہہ نہ سکی کہ بھائی جان مجھے روحی کی شادی پر جانا ہے رات گئے ثناء کی طبیعت سنبھل گئی اور صباء اپنی بے بسی پر دکھی ہوتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔

روحی کی شادی کے تین دن بعد اچانک اسے آفاق کا دوسرا خط ملا تھا۔ ہاتھ میں لیے کتنی دیر وہ دھڑکتے دل کی دھڑکن سنتی رہی اور جب خط چاک کیا تو بغیر پڑھے ہی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ خط کا آغاز اس نے ایک خوبصورت قطعے سے کیا تھا۔

جنوں پسند ہے دل اور تجھ تک آنے میں
بدن کو ناؤ لہو کو چناب کر دے گا
میری طرح بھی کوئی ہے جو زندگی اپنی
تمہاری یادوں کے نام انتساب کر دے گا

ڈیئر صباء آداب!

آج پانچ سال بعد تم سے پھر مخاطب ہو رہا ہوں۔ صباء حقیقت تو یہ ہے تمہارا انکار سن کر مجھے غصہ ضرور آیا تھا مگر میں تمہیں بے وفا ہرگز نہیں سمجھا تھا بلکہ خیال تھا وہ مجبوری یقیناً بہت بڑی ہو گی جس کے لیے تم نے مجھے ٹھکرانا پسند کیا۔ میں نے اگرچہ تمہاری روح میں سما کر تمہیں چاہا تھا تمہیں سمجھا تھا مگر اس کے باوجود یہ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ میں تمہاری مجبوری نہ سمجھ سکا۔ تم پر غصہ بھی آتا تھا اور پیار بھی مگر تمہاری مجبوری کیا تھی یہ نہ جان سکا۔ تم اگر دل سے بے وفائی کرتیں تو میں وہ شہر، وہ ملک کبھی نہ چھوڑتا مگر یہ سوچ کر شہر چھوڑ دیا کہ جب میں تمہارے پاس رہ کر تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا تو مجھے اس شہر میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ تم سوچ رہی ہو گی یہ آج میں کیسی باتیں کر رہا ہوں۔ اچھا تو سنو آج روحی کا خط ملا ہے اور ساتھ میں تمہاری تصویر بھی۔ تصویر دیکھ کر اور حالات پڑھ کر دل بے قرار پر جو گزری کیا میں تحریر کروں یا اپنے پیار کے سہارے تم سمجھ جاؤ گی۔ ہاں صباء! تم سمجھ جاؤ گی میری تڑپ کو، صباء! کیا تم بتا سکتی ہو کس جرم کی

سزا مجھے اور خود کو دے رہی ہو؟ میں نے تو کبھی تم سے کوئی ناجائز تمنا نہ کی تھی پھر تم نے یہ سب کیوں کیا؟ صباء میں تمہیں کیسے سمجھاؤں، دیکھو اب بھی وقت ہے سوچو اور فیصلہ کرو تم میرے پاس آؤ گی یا میں لوٹ آؤں۔ جواب ضرور لکھنا۔ میں تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔ دل بے سکون کو اس وقت تک سکون نہیں ملے گا۔ جب تک تم خود مجھے خط نہیں لکھو گی۔ اب اجازت۔ والسلام۔

تمہارا آفاق!''

''آفاق میری زندگی! میں تمہیں اپنے دکھ اپنی مجبوریاں کیسے بتاؤں۔ وہ بتانے والی ہیں بھی نہیں۔'

پھر کتنے دن اسی کشمکش میں گزر گئے کہ خط کا جواب لکھوں یا نہ لکھوں کچھ سمجھ میں نہ آیا تو وہ چند دن کے لیے زاہدہ آپا کے گھر چلی گئی اور جب وہاں بھی سکون نہ ملا تو واپس گھر آ گئی اور بالآخر اس نے آفاق کے خط کا جواب دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کاغذ قلم ہاتھ میں لیے وہ سوچ رہی تھی۔ مخاطب کرے تو کس انداز میں۔ بہت سوچ کر اس نے لکھا۔

''محترم آفاق صاحب! آداب

طویل عرصہ بعد آپ کا ارسال کردہ خلوص نامہ ملا۔ ایک طویل عرصہ سے دل بے چین آپ کی خیریت جاننے کے لیے بے تاب تھا۔ خط پا کر پُرسکون ہو گیا۔ آپ نے مجھ سے جرم پوچھا ہے۔ حقیقت یہ ہے آفاق! میں اپنے گھر والوں سے بغاوت کر کے ساری عمر کنواری تو بیٹھ سکتی ہوں لیکن اگر آپ کا بتا دیا تو پھر ہو سکتا ہے یہ زندگی اور بھی اذیت ناک ہو جائے کیونکہ شادی کی اجازت وہ لوگ ہرگز نہیں دیں گے۔ آپ نے پوچھا ہے کہ میں کیسی ہوں۔ کیا بتاؤں آپ کو زندہ رہنے کے لیے یہ بات بہت سکون دیتی ہے کہ میں اب بھی آپ کی ہوں اور یہ آپ کی یاد ہی تو ہے جس نے اب تک مجھے زندہ رکھا ہے ورنہ زندگی میں اب کوئی کشش نہیں۔ آپ کی جدائی نے ہی مجھے مار دیا اور آپ ہی کے عشق نے زندہ بھی رکھا۔ کتنی عجیب بات ہے ایک ہی چیز میرے مرنے اور زندہ رہنے دونوں کا باعث ہے لیکن اب

میں تھک چکی ہوں۔ ہاں آفاق میں بہت تھک گئی ہوں۔ آپ ہی بتائیں میں کیا کروں۔ میری اپنی تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ کو تفصیل سے تمام حالات لکھ رہی ہوں۔ اس کے بعد جو کہیں گے وہی کروں گی۔ خط کا جواب جلدی دیجیے گا۔ میں انتظار کروں گی۔ اچھا خدا حافظ۔ والسلام

آپ کی صباء!''

خط پوسٹ کرنے صباء خود گئی تھی اور جب خط پوسٹ کر دیا تو ہلکی پھلکی ہو گئی۔ یوں جیسے کوئی بڑا بوجھ دل سے اتر گیا ہو اب وہ دن رات آفاق کے خط کے انتظار میں گم رہتی۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ ہمیشہ کی طرح باپ کو اخبار سنا رہی تھی کہ اچانک روحی آ گئی۔ صباء اسے دیکھ کر ایک دم خوش ہو گئی۔ اخبار وہیں رکھ کر وہ روحی کو اپنے کمرے میں لائی اور پھر معذرت کرنا چاہتی ہی تھی کہ روحی بولی۔

''خدا کے لیے صباء کسی جھوٹ کا سہارا لے کر مجھے بہلانے کی کوشش مت کرنا۔ تمہیں کوئی بہانہ بنانے کی ضرورت نہیں۔ میری شادی میں تم کیوں نہ آئیں میں سب سمجھتی ہوں سب جانتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے تم کچھ سننا نہیں چاہتیں تو نہ سہی مگر بیٹھو تو سہی۔'' صباء نے اس کا بازو پکڑا۔

''بیٹھنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں صباء! آج میں ان کے ساتھ پشاور جا رہی تھی۔ سوچا جانے سے پہلے تم سے ملتی جاؤں۔ تم تو مجبور ہو میں تو مجبور نہیں۔'' روحی نے چپ ہو کر صباء کو دیکھا جو آنسو پینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''مت ضبط کرو صباء! اتنا کہ جان ہی نکل جائے۔'' اس کی آواز بھیگ گئی اور اب مزید برداشت کرنا صباء کے بس سے باہر تھا۔ روحی کے کاندھے سے لگ کر وہ سسک پڑی تو روحی کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔

''سنو صباء میں نے آفاق بھائی کو تمہارے تمام حالات لکھ دیئے ہیں۔ اب اگر ان کا خط آئے تو انکار مت کرنا۔ زندگی خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اسے ضائع مت کرو مجھے یقین ہے تمہارے اقرار کرتے ہی آفاق بھائی آ جائیں گے۔'' اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔

''او۔ کے اب میں چلتی ہوں تمہیں خط لکھا کروں گی۔ جواب دو گی نا؟ بولو۔''

''ہاں بھئی جواب ضرور لکھوں گی۔'' صباء نے کہا اور روحی چلی گئی اور صباء اسے یہ بھی

نہ بتا سکی کہ آفاق کا خط آ چکا ہے بلکہ وہ جواب بھی لکھ چکی ہے۔



گرمیوں کی تعطیلات ہو چکی تھیں عمر کے آنے کے دن تھے لیکن اب کے پروین ساتھ نہیں آ رہی تھی۔ اس نے فون کیا تھا کہ اس بار وہ نہیں آ سکے گی تاہم عمر ضد کر رہا ہے اس لیے اسے جہاز میں بھیج رہے ہیں۔ آپ میں سے کوئی اسے ریسیو کر لے۔

''بہتر پروین تم گھبراؤ نہیں۔'' رضوان نے سامنے کھڑی صباء کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں خود جا کر عمر کو لے آؤں گا۔ باقی گھر میں سب خیریت ہے تم سناؤ انوار کیسے ہیں۔'' کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کیا اور صباء سے کہا۔

''لو بھئی تیار ہو جاؤ اس بار عمر اکیلا ہی آ رہا ہے تم ہی نے اس کو سنبھالنا ہے۔ آج تین بجے کی فلائٹ سے وہ یہاں پہنچ جائے گا۔''

''لیکن جب پروین خود نہیں آ رہی ہے تو بچے کو کیوں بھیج رہی ہے؟ اب اگر وہ راستے میں گم ہو گیا تو......؟'' ماں کا اتنا کہنا تھا کہ رضوان ہنستے ہوئے بولے۔

''امی جان! وہ جہاز میں آ رہا ہے وین یا ٹرین میں نہیں۔ جہاز میں تو انسان سیف ہوتا ہے۔ آپ فکر مت کریں جا کر اسے میں لے آؤں گا۔'' فوزیہ ان سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی یہ سب باتیں سن رہی تھی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ پروین کیوں نہیں آ رہی ہے؟ ناگواری اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ خود بھی ثناء اور نومی کی پیکنگ کر رہی تھی۔ مری جانے کے لیے مگر عمر کی آمد اسے ہمیشہ ناگوار گزرتی تھی۔

''چلیے ڈیڈی!'' ثناء نے آ کر رضوان کا ہاتھ پکڑا تو وہ چونک پڑے۔

''اچھا بیٹے چلو چلتے ہیں۔'' پھر وہ دونوں بچوں کو لیے گاڑی میں آ بیٹھے۔ اور واپسی پر وہ عمر کو ساتھ لیتے ہوئے آئے تھے۔

''آنٹی جان!'' عمر اندر داخل ہوتے ہی خوشی سے چیخا تھا۔ صباء تو پہلے ہی اس کے انتظار میں اونچے برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ پلٹ کر دیکھا۔ رضوان نے اس کے کپڑوں کا بیگ اٹھا رکھا تھا اور وہ خود بھاگتا ہوا صباء کی طرف آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر وہ رکا اور صباء نے آگے بڑھ کر اسے بے تحاشہ پیار کر ڈالا۔

''آپ کیسی ہیں آنٹی جان؟'' اس نے صباء کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''ایک دم ٹھیک ٹھاک۔'' صباء نے ہنس کر کہا۔

''اچھا......'' اس نے ذرا دور ہٹ کر صباء کو ایڑی سے لے کر سر تک دیکھا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' صباء نے اپنی ہنسی دباتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کی صحت دیکھ رہا ہوں کچھ کمزور سی ہو رہی ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک رہتی ہے۔''

''ارے تم آئے بڑے ڈاکٹر کہیں کے۔ چلو اِدھر آؤ۔'' صباء نے اس کا ہاتھ پکڑا اور آہستہ سے کہا۔ ''جب ممی نہیں آئیں تو آپ کیوں آئے ہیں۔ ممی کے پاس رہنا تھا بیٹے۔''

''عادت جو پڑی ہے گھوم پھر کر لوگوں کے گھروں سے کھانے کی، بھلا کبھی عادت بھی انسان کا پیچھا چھوڑتی ہے۔'' فوزیہ نے نہ جانے کیسے اس کی بات سن لی اور اب منہ بگاڑے کہہ رہی تھی۔

''آنٹی یہ ممانی ہمیشہ یوں بولتی ہیں گویا سولی پر لٹک رہی ہوں۔'' عمر نے مدھم لہجے میں کہا اور صباء اس کے اتنی گہری اور بڑی بات کہنے پر ہنس پڑی۔

''ارے واہ تم تو ابھی سے بڑے سمجھدار ہو۔''

''بس آنٹی! یہ سب آپ کا اثر ہے۔'' عمر نے بھی جواباً ہنس کر کہا۔

''کیا کہہ رہا ہے۔'' فوزیہ نے اسے ہنستے دیکھ کر سخت ناگواری سے پوچھا۔

''کچھ نہیں بھابی جان!'' صباء نے عمر کو دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا اور فوزیہ اور بھی چڑ گئی۔

''کچھ تو ضرور کہہ رہا تھا۔'' اس نے تقریباً آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ قبل اس کے کہ صباء جواب دیتی عمر خود ہی فوزیہ کو آداب کرتے ہوئے بولا۔

''ممانی جان! اگر میں نے وہ بات آپ کو بتا دی تو آپ ناراض ہو جائیں گی۔'' فوزیہ نے منہ بنا کر اسے دیکھا اور بغیر جواب دیئے اندر چلی گئی۔

''ارے عمر! تم آ گئے؟'' صباء کی امی نے اپنے کمرے سے نکلتے ہوئے اسے دیکھ کر پوچھا۔

''جی نانی اماں......!'' عمر نے آداب کرتے ہوئے کہا۔ عرفان تو گھر پر نہیں تھا پھر وہ نانا ابو کو آداب کر کے صباء کے پاس واپس آیا اور صباء اس کو جلدی سے اپنے کمرے میں لے آئی۔ جہاں اس نے عمر کے لیے ڈھیروں کھانے کی چیزیں تیار کر کے رکھی ہوئی تھیں۔ عمر

کمرے میں آتے ہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''آنٹی جان! کیا بات ہے؟ آج ان کی پاگل صاحبزادی نظر ہی نہیں آئیں۔''

''چنداوہ اپنی نانی امی کے گھر گئی ہے۔'' صباء نے اس کے لیے کیک کاٹتے ہوئے کہا۔

''اور نومی؟'' عمر نے مزید پوچھا۔

''وہ بھی ثناء کے ساتھ گیا ہے۔'' صباء نے بتایا۔

''اچھا خیر دفعہ کریں آپ ان سب کو، یہ بتائیں آپ کو کوئی کام تو نہیں۔''

''کیا مطلب؟'' صباء نے چونک کر پوچھا۔

''بھئی میں آپ کی مدد کروں گا اور کیا مطلب۔'' عمر نے وضاحت کی اور صباء نے بے ساختہ اسے چوم لیا۔

''کیا تم اسی لیے آئے ہو؟''

''بس آنٹی! آپ کو پتہ ہے سارا سال میں سوچتا رہتا ہوں اب آنٹی اکیلی کام کر رہی ہوں گی۔ اب آنٹی یہ کر رہی ہوں گی۔ اب آنٹی وہ کر رہی ہوں گی اور اب شاید آنٹی تھک بھی گئی ہوں گی۔ اللہ میاں جلدی جلدی تعطیلات کر دے۔''

''واقعی ایسا سوچتے ہو تم؟'' صباء نے اسے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی آنٹی! یہی تو سوچتا ہوں۔ جب بھی فارغ ہوتا ہوں۔'' عمر نے آہستہ سے کہا۔

دن ایک بار پھر خوبصورت ہو گئے تھے۔ صباء سارا وقت عمر کے ساتھ باتوں میں مصروف رہتی۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ آفاق کے خط کی بھی منتظر تھی۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ ایک ماہ ہو گیا تھا لیکن ابھی تک خط کا جواب نہیں آیا تھا جبکہ صباء کو لمحہ لمحہ اس کا انتظار تھا۔ اچانک اس روز زاہدہ اور نسرین اتفاق سے ایک ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ فوزیہ تو ان کو دیکھتے ہی سر درد کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ دونوں بہنیں کچھ دیر تو ماں کے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہیں پھر صباء کے کمرے میں چلی گئیں۔ جہاں عمر، نسرین کی بیٹی عائشہ کے ساتھ کھیل رہا تھا اور صباء ان کے قریب ہی بیٹھی ان کو دیکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے آپ اِدھر آ گئیں۔ بھابی، امی کہاں ہیں؟'' صباء نے پوچھا۔

''بھابی کو کسی سے بات کرنے کی فرصت کہاں ہے۔ سر درد کا بہانہ کر کے نوابزادی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میرا خیال ہے اب ہم بھی چلیں۔'' زاہدہ نے کچھ سوچ کر کہا۔

''نہیں...... نہیں...... آپ ابھی نہیں جا سکتیں۔ آپ یہاں میرے پاس بیٹھیں۔ میں آپ کو رات کا کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گی۔'' صباء نے انہیں روکنے کی کوشش کی۔

''دوپہر کا کھا لیا یہی کافی ہے۔'' نسرین نے تلخی سے کہا۔

پھر صباء روکتی رہ گئی مگر وہ دونوں اسی وقت چلی گئیں۔ ان کے ساتھ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ وہ جب بھی آتی تھیں ایک ساتھ آتیں یا الگ الگ۔ انہیں دیکھتے ہی فوزیہ کے سر میں درد ہونے لگتا تھا۔ اس دن وہ کھانا بھی اپنے کمرے میں کھاتی تھی۔ مقصد صرف یہ ہوتا کہ آج آئی ہیں تو پھر کبھی نہ آئیں مگر وہ بھی مجبور تھیں۔ صباء سے ملنے چلی آتیں اور اگر نہ آتیں تو سسرال والے کیا کہتے۔ نہ جانے کیا بات ہے جو یہ کبھی اپنے میکے نہیں جاتیں، ان کی زبان کون روک سکتا تھا یہی سوچ کر بے چاری کبھی کبھی آ جاتی تھیں۔

آنٹی! آپ کیا سوچ رہی ہیں؟'' عمر نے انہیں سر جھکائے دیکھ کر پوچھا۔

''آں...... ہاں! کچھ نہیں۔'' صباء نے چونک کر جواب دیا۔

''آنٹی......'' عمر پھر اس کا بازو ہلانے لگا۔

''کیا ہے بھئی؟'' صباء نے اکتا کر پوچھا۔ بہنوں کے جانے سے اس کا دل ہمیشہ بجھ جاتا تھا۔

''آنٹی آپ عاشی کو ہی روک لیتیں پھر ہم تینوں مل کر کھیلتے۔'' عمر دل کی خواہش زبان پر لے آیا۔

''تمہارا دل چاہتا تھا تو بتا دیتے، میں اسے روک لیتی۔''

''ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ خیر میں تو آپ کے ساتھ بھی کھیل لوں گا۔'' عمر نے کہا تو صباء باہر چلی آئی۔

اسی وقت پوسٹ مین نے بیل کی۔ صباء گئی اور آفاق کا خط دیکھ کر خوش ہو گئی۔ خط لے کر وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آئی ہی تھی کہ فوزیہ نے آواز دی۔ اس کی کچھ ملنے والیاں آئی تھیں اور اب اس کے سر کا درد بھی ختم ہو گیا تھا۔ صباء خط کو اسی طرح تکیے کے نیچے رکھ کر آ گئی پھر کام میں کچھ ایسی الجھی کہ خط پڑھنے کا وقت ہی نہ ملا۔ رات کو جا کر کہیں فارغ ہوئی تو اپنے کمرے میں آنا نصیب ہوا۔ کمرے میں آتے ہی وہ بے تابی سے خط نکال کر پڑھنے لگی۔ خط کا آغاز آفاق نے ہمیشہ کی طرح ایک خوبصورت شعر سے کیا تھا۔

"تو کہیں میں کہیں کوئی منزل نہیں زندگی کے لیے
جب اندھیرا ہوا دل جلانا پڑا روشنی کے لیے

ڈیئر صباء! آداب

تمہارا ارسال کردہ محبت نامہ ایک طویل مدت بعد ملا پڑھ کر جو حالت اور خوشی ہوئی بیان نہیں کر سکتا۔ سنو صباء! کیا یہ خط تم ہی نے لکھا ہے؟ ہاں، تم ہی نے لکھا ہو گا مگر اتنی باتیں۔ میں پڑھتا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ ارے یہ وہی صباء ہے جو گنتی کے چند لفظ میرے سامنے بولتی تھی۔ یہ خط اسی صباء نے لکھا ہے جو میری بہت ساری باتوں پر صرف ہوں، ہاں کر کے رہ جاتی تھی۔ چلو اچھا ہوا میں پاس نہیں تھا۔ تم نے اپنی سب باتوں کو تحریر کی شکل تو دی۔ خط کی اہم بات تم نے اس مسئلے کا حل پوچھا ہے۔ حل تو پہلے بھی یہی تھا اور اب بھی یہی ہے کہ تم خود امی، ابو سے براہ راست بات کرو، یا پھر مجھے اجازت دو میں خود ان سے بات کرلوں۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ مجھے انکار نہیں کریں گے۔ حقیقت تو یہ ہے دنیا کے کوئی بھی ماں، باپ اپنی اولاد کو دکھی دیکھنا نہیں چاہتے۔ اب دیر مت کرنا۔ تمہارے خط نے زندگی کی جو نئی امید دی ہے کہیں وہ پھر سے اندھیروں میں گم نہ ہو جائے۔ فی الفور خوشخبری سنانا۔ اب میں صرف اور صرف تمہارے خط کے جواب تک یہاں رکوں گا۔ خط ملتے ہی میں پاکستان آ جاؤں گا اور سنو اپنا خیال رکھنا میری فکر مت کرنا۔ میں ایک دم فرسٹ کلاس ہوں۔ خط کا جواب جلدی دینا۔ مجھے یقین ہے اب بہت جلد تم سے ملاقات ہو گی۔ اس امید کے ساتھ کہ تم فوراً جواب لکھو گی۔ اجازت۔ والسلام

تمہارا آفاق!"

"آنٹی جانی! کس کا خط ہے؟" عمر جو کافی دیر سے اسے خط پڑھتے دیکھ رہا تھا۔ پوچھ بیٹھا۔ صباء ایک دم چونک پڑی۔ پھر مسکرا کر بولی۔

"عمر یہ خط آپ کے انکل کا ہے۔"

"کون سے انکل کا؟" عمر نے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی خوشی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"بس ہیں ایک۔" صباء مسکرائی۔

"ہوں۔" عمر سر ہلانے لگا۔

"ہوں۔" صباء نے ہنس کر اس کی نقل اتاری۔

"کہاں رہتے ہیں ہمارے یہ انکل؟" عمر نے بھی ہنس کر پوچھا۔

"بہت دور۔" اچانک صباء کی آواز بھیگ گئی۔ اور عمر بہت غور سے اسے دیکھنے لگا بہت چھوٹی عمر میں وہ بہت زیادہ سمجھدار بچہ تھا۔ صباء نے اسے اپنے ساتھ لٹا لیا اور خود بھی لیٹ گئی۔ مگر نیند بہت دور تھی تکیے کے نیچے آفاق کا خط تھا اور دماغ میں سوچیں۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بجائے اس کے کہ وہ اس گھر میں صفر کی حیثیت سے زندگی بسر کرے وہ ماں سے بات کرے گی اور ہر حال میں ان کا فیصلہ آفاق کے حق میں کروائے گی۔

اگرچہ دل میں اس نے یہ فیصلہ کرلیا تھا مگر جب بھی ماں کے پاس بیٹھتی بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔ اسی کشمکش میں کئی دن گزر گئے۔ کوشش کے باوجود وہ ماں سے بات نہ کر سکی تاہم دل کی تسلی کے لیے وہ روزانہ آفاق کا خط پڑھتی رہی۔ جب بہت سارے دن گزر گئے تو اس نے سوچا، دن تو یونہی گزرتے رہیں گے۔ جب مجھے بات کرنی ہی ہے تو دیر کرنے کا فائدہ؟ بالآخر اس نے خود کو اس بات کے لیے تیار کرلیا۔ گھر کے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد وہ بجائے اپنے کمرے میں جانے کے ماں کے پاس آ بیٹھی۔ ماں نے نظر بھر کے اسے دیکھا کیونکہ یہ حرکت خلاف معمول تھی۔

"اچھا ہوا تم خود ہی آ گئیں۔ میں تمہیں آواز دینے ہی والی تھی۔"

"دراصل امی! مجھے آپ سے چند ضروری باتیں کرنی تھیں۔" صباء نے آغاز کیا۔

"اس وقت ضروری باتوں کو چھوڑو اور جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ مہمان آنے والے ہیں۔" ماں نے جلدی سے کہا۔

"کون سے مہمان آنے والے ہیں۔" صباء نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھئی تمہاری سب بہنیں، فوزیہ کے میکے والے اور کچھ خاص ملنے ملانے والے لوگ آ رہے ہیں تم......"

"مگر یہ سب کیوں آ رہے ہیں، خیریت تو ہے؟" صباء نے حیرانی سے ان کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"ہاں خیریت ہی خیریت ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کیا؟" ماں نے انجان بن کر کہا۔

"مجھے معلوم ہوتا تو آپ سے کیوں پوچھتی۔" صباء کو اب غصہ آنے لگا تھا۔

"بھئی تمہاری بھابی نے عرفان کے لیے لڑکی پسند کی ہے۔" ماں نے لاپرواہی سے بتایا۔

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" صباء نے خوش ہو کر کہا۔

"وہی تو کہہ رہی ہوں آج منگنی ہے۔" ماں نے کہا اور ایک دم خوش ہو گئی۔

"منگنی....." صباء نے حیرانی سے انہیں دیکھا۔ "مگر مجھے تو آپ نے پہلے کچھ نہیں بتایا۔"

"بھئی اس میں بتانے والی کیا بات تھی۔ پہلے فوزیہ نے لڑکی دیکھی پھر مجھے دکھائی بنا کچھ کہے اور بنا کچھ لیے بات پکی ہو گئی اور پھر تمہیں بتانے یا نہ بتانے سے کیا ہوتا تم نے جوڑے تھوڑی ٹانکنے تھے۔"

"آپ درست کہتی ہیں امی!" صباء نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بتانے یا نہ بتانے میں کوئی فرق نہیں بھلا مجھے بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اس گھر کا فرد کب ہوں۔ میری اتنی حیثیت کب ہے۔ بس ایک مجبوری ہے، ایک زبردستی کا نباہ ہے جو میں خود نباہ رہی ہوں ورنہ آپ لوگوں کو میری پرواہ کب ہے۔ میں زندہ رہوں یا مر جاؤں۔ آپ کے لیے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" ماں نے ڈانٹا۔ "فوزیہ نے سنا تو برا منائے گی۔" پھر کچھ سوچ کر بولیں۔ "یہ آخری ایک فرض رہ گیا تھا چلو اچھا ہے اب یہ بھی پورا ہو جائے گا۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہارے بھائی کا گھر آباد ہو رہا ہے۔ بہنیں تو خوشیاں مناتی ہیں بھائیوں کی شادی کی۔" وہ اٹھ کر اندر چلی گئیں اور صباء سوچوں میں گم وہیں بیٹھی رہی۔ سمجھ میں نہ آیا اب کرے تو کیا کرے۔ اب آفاق کے بارے میں بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ بالفرض وہ بات کرتی بھی تو ماں سمجھتی بھائی کی منگنی کا سن کر اپنا خیال آ گیا ہے۔ بات کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا سو اس نے چپ رہنے کا فیصلہ کیا۔ "شاید قسمت کو ہمارا ملاپ منظور نہیں۔" اس نے دکھ سے سوچا مجھے افسوس ہے آفاق! میں ایک بار پھر تمہیں زندگی کی امید دلا کر دور ہٹ رہی ہوں۔ مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں کہ تمہارے خط کا جواب دوں آج سے تم مجھے بھول جانا۔ کیونکہ منزل اب ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں کھو گئی ہے۔ اس کی تلاش وقت ضائع کرنے کے مترادف ہو گی۔ صباء کو محسوس بھی نہ ہوا کب اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

"آنٹی جان کیا بات ہے؟" عمر نے اسے روتے دیکھ کر پوچھا۔

"وہ عمر! پتہ ہے۔" صباء کی سمجھ میں نہ آیا۔ اسے کیا کہے کچھ اور نہ سوجھا تو بولی۔ "عمر آج کام بہت زیادہ کرنا پڑے گا۔ آج مہمان آئیں گے نا گھر میں آج تمہارے چھوٹے ماموں کی منگنی ہے۔"

"کیا اس لیے آپ روئی ہیں؟"

"ہاں شاید یہی بات تھی۔" صباء نے آنکھیں پونچھ ڈالیں۔

"یہی بات تھی یا کچھ اور....." عمر نے شک سے اسے دیکھا۔

"یہی بات تھی چندا اور کیا بات ہو سکتی ہے۔" صباء نے بے ساختہ اس کا منہ چوم لیا۔

"اگر یہ بات ہے تو آپ کو گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں جو یہاں موجود ہوں کام کے واسطے۔" عمر نے تسلی دی۔ اتنے میں فوزیہ آ گئی تو صباء اٹھ کر اس کا راستہ روکتے ہوئے بولی۔ "کیا بات ہے بھابی آپ نے اکیلے ہی اکیلے لڑکی دیکھ کر پسند کر لی اور مجھے بتانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی۔"

"بھئی لڑکی ہی تو دیکھنا ہے جب چاہے جا کر دیکھ لینا۔ باقی رہی تمہیں نہ بتانے کی بات تو بی بی! جس کا کام اسی کو ساجھے۔ دراصل یہ ذمے داری تو اب میری تھی سو میں نے پوری کر دی۔" پتہ نہیں کیا وجہ تھی فوزیہ کا لہجہ نرم تھا۔ اچانک ثناء اور نومی اپنے ماموں کے ساتھ آ گئے گویا ان کو بھی یہ اطلاع پہلے ہی سے تھی۔ صباء مارے غصے کے کھول کر رہ گئی مگر کیا کر سکتی تھی، جب ماں اسے اہمیت نہیں دیتی تھی تو بھابی سے کیا شکوہ کرتی۔

"بھابی نہیں آئیں کیا؟" فوزیہ نے نومی کو پیار کرتے ہوئے پوچھا۔ صباء کو اس نے بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

"امی جان کے ساتھ آ رہی ہیں۔" فیاض نے جواب دیا اور ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ ثناء اور نومی مل کر شور کرنے لگے تو فوزیہ، نومی کو صباء کو دیتے ہوئے بولی۔

"پلیز صباء تم اس کو رکھ لو ورنہ یہ مجھے بہت تنگ کرے گا۔"

"مگر بھابی میں تو خود۔" صباء نے کہنا چاہا مگر فوزیہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔

"پلیز صباء! تم پھر کسی دن میرے ساتھ جا کر لڑکی دیکھ آنا۔" اس نے نومی کو صباء کی گود میں ڈال دیا۔ پھر ثناء اور نومی کو ساتھ لے کر تیار ہونے چلی گئی کچھ دیر بعد ہی سب

مہمان بھی آ گئے۔ خاص کر صباء کی بہنیں بھی۔

"یہ خوب رہی صباء! ابھی تک نہ خود تیار ہوئی اور نہ عمر کو کیا ہے۔" نسرین نے آتے ہی کہا۔

"بھئی میرا تو موڈ نہیں۔ تم عمر کو تیار کر کے ساتھ لے جاؤ۔" صباء نے بے زاری سے کہا۔

"لیکن تمہارا موڈ کیوں نہیں؟" زاہدہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"بس یونہی۔" صباء نے کہا اور نومی کو لے کر اٹھ گئی اور جب سب لوگ جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ رضوان صباء کو گھر کے کپڑوں میں دیکھ کر بولے۔

"تم کیوں نہیں جا رہی؟"

"بھائی جان! میرا موڈ نہیں۔" صباء نے ان کو بھی وہی جواب دیا اور جب موڈ صباء کا نہ تھا تو عمر کا کیسے ہو سکتا تھا۔ اس نے بھی جانے سے انکار کر دیا۔ پھر سب لوگ چلے گئے اور صباء نومی کو لیے برآمدے میں ہی بیٹھ گئی۔ یہ گول مٹول سا نومی اس کو بہت پیارا لگتا تھا۔ فوزیہ کی وجہ سے وہ کبھی اس کو جی بھر کے پیار نہ کر سکی تھی۔ مگر آج تو فوزیہ خود جاتے ہوئے اسے دے گئی تھی۔ اور صباء اس معصوم کو ہنستے ہوئے دیکھ رہی تھی جبکہ عمر خود بھی صباء کے پاس بیٹھا تالی بجا بجا کر اس کو بہلا رہا تھا۔

"آنٹی جان یہ نومی کتنا اچھا ہے۔" عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ بہت اچھا ہے۔" صباء نے بھی مسکرا کر کہا۔

"مگر آنٹی!" عمر برا سا منہ بنا کر بولا۔ "یہ ثناء اور فومی بہت بدتمیز بچے ہیں آپ کو پتہ ہے اگر میں کبھی ان سے بات کرنے کی کوشش کروں تو وہ لوگ جواب ہی نہیں دیتے بلکہ الٹا مجھے دیکھ کر ہنسنا شروع کر دیتے۔ اب میں بھی ان کو نہیں بلاتا۔"

"چھوڑو بیٹا! چھوٹی چھوٹی باتوں سے دل برا نہیں کرتے۔ ان کو تو کچھ سمجھ نہیں مگر میرا بیٹا تو بہت اچھا اور سمجھدار ہے۔" صباء نے کہا تو عمر مسکرا دیا۔

منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ پہلے یہ لوگ گئے تھے بعد میں لڑکی والے آئے تھے۔ پھر منگنی کی یہ تقریب ختم ہوئی تو سب مہمان بھی رخصت ہو گئے تھے۔ ان مہمانوں میں عمر بھی تھا۔ صباء ایک بار پھر اکیلی تھی۔ گھر میں ایک بار پھر شادی کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ فوزیہ نے بڑی چالاکی سے عرفان کا رشتہ طے کیا تھا۔ جہیز میں نہ صرف

ضروریات زندگی کی ہر چیز شامل تھی بلکہ ایک خوبصورت مکان بھی۔ یوں بغیر کسی پریشانی کے شادی کے بعد عرفان اپنی بیوی کے ساتھ نئے گھر میں شفٹ ہو گیا اور اس گھر میں فوزیہ کی حکمرانی قائم ہو گئی۔

اگرچہ صباء خود سے سمجھوتہ کر چکی تھی کہ وہ اب آفاق کو یاد نہیں کرے گی مگر خالی گھر میں وہ تھی یا پھر اس کی یادیں۔ انہی دنوں جب رضوان فیکٹری کے سامان کی خریداری کے لیے جاپان گئے ہوئے تھے، صباء نے اپنی وحشتوں سے تنگ آ کر جاب کرنے کا فیصلہ کر لیا پھر اخبار میں اس نے اشتہار دیکھ کر انٹرویو دیا اور اس کو سلیکٹ بھی کر لیا گیا۔ مگر ابھی اسے ڈیوٹی جوائن کیے دو دن ہی گزرے تھے کہ رضوان واپس آ گئے۔ صباء کی جاب کا سنا تو بہت ناراض ہوئے۔

"صباء اگر پیسوں کی ضرورت تھی تو مجھ سے کہا ہوتا۔"

"نہیں بھائی! پیسے کی مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے تو یونہی مشغلے کے طور پر جاب کی تھی۔"

"مگر مجھے پسند نہیں۔ جب گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں تو پھر باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم جاب نہیں کرو گی یہ میرا فیصلہ ہے۔" رضوان کا لہجہ سخت تھا۔

"جی بہتر بھائی جان!" صباء نے آہستہ سے کہا اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسی شام زاہدہ آئی تو وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ کچھ عرصہ وہاں رہ کر وہاں سے سیدھی نسرین کے ہاں چلی گئی اور جب چھ ماہ بعد وہ گھر آئی تو دل کی بے قراریاں کچھ تھم سی گئی تھیں۔ انہی دنوں عرفان کی بیوی کو نہ جانے کیسے صباء کا خیال آ گیا۔ عرفان کو ساتھ لیے وہ صباء کو لینے آئی۔

"کیوں بھئی خیریت تو ہے یہ اچانک صباء کا خیال کیسے آ گیا۔" رضوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھئی یہ خیال تو صباء کی بھابی کو آیا ہے۔" عرفان نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھئی کیا عرفان صحیح کہہ رہا ہے۔" فوزیہ نے مشکوک نظروں سے دیورانی کو دیکھا۔

"جی بھابی یہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ آخر ہمارا بھی تو حق ہے صباء پر بہت عرصہ آپ کے گھر رہی ہے اب یہ ہمارے گھر رہے گی۔"

"جیسے تمہاری خوشی۔" فوزیہ نے فوراً اجازت دے دی۔ مگر رضوان بولے۔

"سچی بات یہ ہے بھائی کہ میں مستقل صباء کو کسی کے پاس بھیج نہیں سکتا۔ ہاں کچھ عرصہ کے لیے اگر صباء پسند کرے تو تمہارے گھر جا سکتی ہے کیوں صباء؟" رضوان نے اسی سے پوچھ لیا۔

"اس میں بھلا صباء کی پسند یا ناپسند کی کیا بات ہے۔" ماں جو خاموش بیٹھی نومی کو پیار کر رہی تھی بول پڑی۔ "جب بھائی اتنے پیار سے لینے آیا ہے تو صباء کیسے نہ جائے گی۔"

یوں صباء خاموشی سے عرفان اور نازیہ کے ساتھ ان کے گھر چلی آئی تھی۔ نازیہ کی ڈلیوری کے دن قریب تھے اور اسی لیے وہ صباء کو گھر لائی تھی۔ گھر آتے ہی اس نے سارا کام صباء کے سپرد کر دیا۔

عرفان کے ہاں پہلا بیٹا ہوا تھا۔ بچے کو دیکھنے نہ صرف رضوان، فوزیہ بلکہ سب بہنیں بھی آئی تھیں اور بچے کو دیکھ کر واپس چلی گئیں۔ نازیہ، صباء پر خاصی مہربان تھی اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر باہر کی کوئی ملازمہ رکھتی تو اسے تنخواہ بھی دینی پڑتی اور چوری چکاری کا خطرہ بھی لگا رہتا۔ اب صباء کے آنے سے وہ مطمئن تھی ہر مہینے تنخواہ کا حساب لگا کر وہ صباء کے لیے ایک بہترین سوٹ لے آتی، اس کا ارادہ مستقل صباء کو اپنے پاس رکھنے کا تھا۔ مگر اچانک ایک دوپہر دونوں میں لڑائی ہو گئی۔ صباء کھانا کھا رہی تھی کہ بچے نے کپڑے خراب کر دیئے۔ نازیہ نے صباء کو آواز دی تو صباء بولی۔

"بھابی میں کھانا کھا رہی ہوں۔"

"کیا کھانا چھوڑ کر نہیں آ سکتیں۔" نازیہ نے تیز لہجے میں کہا تو صباء کو بھی غصہ آ گیا۔

"آپ کو پتہ نہیں میں کھانا کھا رہی ہوں۔ آپ کے بچے کا گند ہے خود ہی سمیٹیں میں نہیں سمیٹ سکتی۔" صباء نے خشک لہجے میں کہا۔

ہاں، ہاں تمہیں بچے کا احساس کیسے ہو گا۔ تُو تو خود ایک بانجھ عورت ہے تُو خود ماں ہوتی تو تجھے پتہ ہوتا کہ بچے کے لیے کھانا تو کیا اگر دنیا بھی چھوڑنی پڑے تو ماں چھوڑ دیتی ہے۔" صباء گم صم اس کی باتیں سن رہی تھی کہ عرفان آ گیا۔

"کیوں بھئی کس پر خفا ہو رہی ہو۔"

"آپ کی بہن پر اور کس پر کام وام کوئی کرتی نہیں۔ اگر کبھی بھولے سے کوئی ایک بات کہہ دو تو جواب میں دس سناتی ہے۔"

"کیوں صباء! تمہاری بکواس کرنے کی عادت ابھی تک نہیں چھوٹی۔" عرفان نے غصے میں آگے بڑھ کر اسے تھپڑ مار دیا۔ صباء مارے صدمے کے اپنی جگہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ایک لفظ بھی تو نہ بول سکی۔ اور جب ہوش میں آئی تو غصے سے چیخ پڑی۔

"ذلیل انسان تمہیں یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں تم سے بڑی ہوں، تمہیں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ میں تم لوگوں کی نوکر نہیں کہ تم لوگوں کے حکم بجا لاتی رہوں۔ کبھی بڑے بھائی کے گھر، کبھی چھوٹے بھائی کے گھر۔ اگر کام کر کے ہی مجھے تم لوگوں کے گھر رہنا ہے تو میں باہر کسی کے گھر کام کر لوں گی۔ مگر یاد رکھو تم لوگوں کے گھر اب ہرگز نہیں رہوں گی۔" وہ غصے سے کھڑی ہو گئی۔

رضوان جو اکثر صباء سے ملنے عرفان کے گھر آتے تھے۔ اتفاق سے یہ منظر دیکھ بیٹھے اور فوراً صباء کو اپنے ساتھ گھر لے آئے۔ چونکہ وہ صباء کی تمام باتیں سن چکے تھے۔ اس لیے اگلے ہی روز انہوں نے ملازمہ رکھی اور سارے گھر کا کام اس کے سپرد کر دیا۔ تاہم کچن اب بھی صرف صباء کے سپرد تھا۔ البتہ اب اور کوئی کام اس کی ذمے داری نہ تھی۔ فوزیہ دل ہی دل میں کڑھتی بلکہ اکثر صباء کو بے بھاؤ سنا بھی ڈالتی مگر رضوان سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ اگر کبھی کوئی شکایت کرتی بھی تو وہ صرف ایک نظر اٹھا کر فوزیہ کو دیکھتے مگر منہ سے کچھ نہ کہتے، جیسے سمجھانا چاہتے ہوں کہ تمہاری حقیقت میں جانتا ہوں اور ایسے میں فوزیہ بپھر جاتی۔ خواہ مخواہ چیزیں اٹھا کر اِدھر اُدھر پٹخنے لگتی اور شاید یہی نفرت کی شدت تھی۔ جس کی وجہ سے فوزیہ نے اپنے بچوں کے دل میں بھی صباء کے لیے نفرت ہی نفرت بھر دی تھی۔ تاہم نومی، صباء کی ہر بات مانتا تھا۔ فوزیہ کے ڈانٹنے پر وہ ڈر ضرور جاتا۔ مگر جب فوزیہ نہ ہوتی تو وہ صباء کے پاس ہی رہتا۔ عرفان کے گھر سے واپس آ کر صباء نے خود کو ہنگاموں سے دور کر لیا تھا۔ وہ تھی، کچن تھا۔ یا پھر اس کا کمرہ۔

ایسے میں ایک دن آفاق کا خط ملا خط دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئی۔ اس نے تو آفاق کے خط کا جواب بھی نہیں دیا تھا پھر یہ خط وہ سوچتی رہی پھر خط کھول کر دیکھا۔ خط کا آغاز اس نے اپنے مخصوص انداز میں کیا تھا۔

بے خطا تو نے مجھ سے خوشی چھین لی
زندہ رکھا مگر زندگی چھین لی

ڈیئر صباء! آداب

تمہارے جواب کا انتظار کرتے کرتے دو سال کا طویل عرصہ بیت گیا مگر خط نہ آیا۔ صباء کیا میں پوچھ سکتا ہوں۔ تم نے جواب کیوں نہ لکھا۔ امی، ابو نے اگر انکار بھی کیا تھا تو کیا یہ تمہاری ذمے داری نہ تھی کہ مجھے اطلاع کرتیں۔ چھ ماہ کے لیے میں کینیڈا گیا ہوا تھا۔ آج واپسی پر روحی کا ایک پرانا خط ملا جس میں اس نے لکھا ہے۔ وہ تمہارے گھر گئی تھی مگر تم سے ملاقات نہ ہوسکی۔ بقول تمہاری بھابی کے تم نے جاب کر لی ہے۔ صباء ہر عورت کی طرح ہر مرد کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا ایک گھر ہو۔ بیوی ہو، بچے ہوں، جہاں دن بھر کا تھکا ہوا وہ آئے تو بیوی اگر اس کا مسکرا کر استقبال کرے تو بچے اپنی پیاری پیاری باتوں سے دل بہلائیں۔ مگر شاید یہ سب کچھ میری قسمت میں نہ تھا۔ شاید اس لیے کہ میں نے اپنی قسمت تم سے وابستہ کر لی تھی۔ صباء تم اس اذیت کا اندازہ نہیں کر سکتیں جو ہر لمحہ مجھے ہوتی ہے۔ ہاں صباء! جن ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تم نے جاب کی ہے وہ دولت ہی تو اذیت دیتی ہے۔ کیونکہ اسے استعمال کرنے والا کوئی نہیں۔ صباء جب تمہاری زندگی خود تمہارے اختیار میں نہ تھی تو تم نے مجھ سے محبت کیوں کی۔ تمہاری اس محبت نے مجھ سے میری زندگی اور خوشی چھین لی۔ تم نے خط لکھ کر مجھے نئی امید کیوں دلائی کہ میں زندہ لاش بن کر رہ گیا۔ ان سب باتوں کا ذمے دار کون ہے؟ صرف تم، ہاں صباء صرف تم ہو، تم مجرم ہو، میرے گھر کی، میرے بچوں کی اور میری خوشیوں کی۔ میں اب بھی تمہیں خط نہیں لکھوں گا بلکہ پوری شدت سے تمہارے پرانے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ مگر میری روح میں پیوست تمہاری محبت شاید مجھے ایسا نہ کرنے دے۔ خیر یہ بعد کی بات ہے اس وقت اہم بات یہ ہے کہ اس خط کے ساتھ تمہارے لیے ایک چیک بھیج رہا ہوں۔ خود پر اگر میرا کوئی حق سمجھتی ہو تو اسے قبول کر لو اور جاب چھوڑ دو۔ مجھے دکھ ہوتا ہے یہ سوچ کر کہ میں یہاں دولت میں کھیلوں اور تم وہاں پیسوں کے لیے بھٹکتی رہو۔ والسلام"

آگے نام نہیں لکھا تھا۔ صباء کچھ دیر خط کو دیکھتی رہی پھر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رات کا سناٹا اس کے اندر عجیب سے احساسات پیدا کر رہا تھا۔ ایک تڑپ، ایک خلش، ہائے آفاق۔ میرا گھر اور میرے ان دیکھے بچے! تم کیا جانو آفاق! میں اپنے ان ان دیکھے بچوں کو اپنے بہت قریب محسوس کرتی ہوں۔ آفاق میں ان کے ننھے منے ہاتھ پاؤں کا لمس اور نرم وجود کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کرتی ہوں مگر، ہاں مگر میں ان کو چھو نہیں سکتی۔ کیونکہ میں مجبور ہوں ورنہ دنیا کی کون سی عورت ایسی ہوگی جو یہ چاہے گی کہ کوئی اس کو ماں کہہ کر نہ پکارے۔ میرے بچے میرے اِن دیکھے بچو! آؤ اور مجھے ماں کہہ کر پکارو۔ مگر نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ آفاق میں تمہارے اور تمہارے گھر کے خواب سجا کر زندگی گزار دوں گی۔ یہ کم تو نہیں۔ وہ روتی رہی اور آنسو جب سوئے ہوئے عمر کے منہ پر گرے تو وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا اور روتی ہوئی صباء کو حیرت سے دیکھنے لگا پھر صباء کے ہاتھ میں خط دیکھ کر بولا۔

"کیا پھر انکل نے خط لکھا ہے؟" اس کی بات سن کر صباء چونک پڑی پھر جلدی سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"چلو عمر سو جاؤ۔"

"آنٹی! آپ روتی کیوں ہیں؟" عمر نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"یونہی بیٹا! کوئی خاص بات نہیں۔" صباء نے خط بند کر کے ڈائری میں رکھتے ہوئے کہا۔

"آنٹی آپ رویا مت کریں۔ آپ روتی ہیں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے میں بھی زور زور سے روؤں۔" اور عمر سچ مچ رونے لگا۔

"ارے عمر! یہ کیا کر رہے ہو بیٹا! مرد نہیں روتے۔ یہ رونا تو عورت کا مقدر ہے تم کبھی نہ رونا۔"

"تو آپ بھی وعدہ کریں آپ کبھی نہیں روئیں گی۔" عمر نے فوراً کہا۔

"میں کوشش کروں گی بیٹا! بس تم سو جاؤ۔" صباء نے کوشش کر کے اسے سلا دیا، مگر خود ساری رات جاگتی رہی آفاق کے خط نے زندہ رہنے کی امید چھین لی تھی۔

صبح اس کا ناشتہ کرنے کو بھی دل نہ چاہا۔ بے قراری سے وہ سارے گھر میں گھومتی رہی پھر لان میں آ کر کھڑی ہوگئی اور کتنی دیر خیالوں میں گم وہیں کھڑی رہی۔ چونکہ چھٹی کا

روز تھا اس لیے رضوان بھی گھر پہ تھے۔ کتنی دیر وہ اپنے کمرے کے دریچے میں کھڑے اس کی بے قراری کو دیکھتے رہے۔ وہ جو روز کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی چپ چپ تھی۔ ان کے دل کو کچھ ہونے لگا تو وہ باہر چلے آئے۔

"کیا بات ہے صباء! بہت چپ چاپ ہو۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"آں....." وہ چونک پڑی مگر بولی کچھ نہیں۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" رضوان نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" صباء طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"کچھ تو سوچ رہی تھیں۔ کیا اپنے بھائی جان کو نہیں بتاؤ گی۔" رضوان نے کچھ ایسے پیار سے پوچھا کہ صباء کو جھوٹ کا سہارا لے کر دل کی کیفیت کو چھپانا پڑا۔

"بھائی جان! میں سوچ رہی تھی اگر یہاں لان میں بیٹھنے والا جھولا بھی ہوتا تو کتنا اچھا لگتا۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔ شام تک جناب یہاں جھولا لگ چکا ہوگا۔" رضوان جب سے اسے عرفان کے گھر سے لائے تھے ہر ممکن طریقے سے اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

"ارے نہیں بھائی جان! رہنے دیجیے اگر جھولا لگ بھی گیا تو خواہ مخواہ لڑائی ہوگی۔ میں تو پھر بھی نہ بیٹھ سکوں گی۔ خواہ مخواہ پیسے ضائع کرنے کا فائدہ۔" صباء نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ مگر شام کو جب وہ اپنے کمرے سے باہر آئی تو جھولا سچ مچ لان میں موجود تھا وہ حیران سی کھڑی جھولے کو دیکھ رہی تھی اور رضوان اس کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"بھائی جان! واقعی یہ جھولا۔" صباء خوشی سے بھاگتی ہوئی آئی اور اسے خوش دیکھ کر رضوان خود بھی خوش ہو گئے۔ اتنے میں ثناء بھی بھاگتی ہوئی چلی آئی۔ وہ شاید ابھی سو کر اٹھی تھی۔

"پاپا یہ جھولا ہمارا ہے۔"

"نہیں....." رضوان نے ثناء کے پیچھے آتی ہوئی فوزیہ کو دیکھ کر کہا۔

"پھر کس کا ہے؟" اس نے رک کر شوہر کو گھورا۔

"یہ جھولا صباء کا ہے اور اگر میں نے کسی اور کو اس پر بیٹھتے ہوئے دیکھا تو....."

"تو کیا ہوگا۔" فوزیہ نے نفرت سے صباء کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تو بہت برا ہوگا۔ اس بیٹھنے والے کے حق میں۔" رضوان نے آخری بات پر زور دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا پھر صباء کو دیکھا۔ "تم تو بیٹھ جاؤ صباء! یہ صرف تمہارے لیے ہے۔" پہلی بار اپنی اہمیت پر صباء نے فخر سے بھابی کو دیکھا اور جھولے پر بیٹھ گئی۔ یوں جیسے تخت سلیمان پر بیٹھی ہو اور فوزیہ جل کر منہ بناتے ہوئے ثناء کی انگلی پکڑے چلی گئی۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی جا رہی تھی۔

"اچھا ہے؟" رضوان نے صباء کے چہرے پر خوشی دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں بھائی جان بہت اچھا ہے۔" صباء عرفان کا رویہ یاد کر کے رو دی۔

"روتے نہیں صباء تم خوش رہا کرو۔" رضوان نے کہا تو صباء خواہ مخواہ ہنس پڑی۔

"ماموں جان ہم بھی بیٹھ جائیں۔" عمر نے رضوان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی یہ تو آپ کی آنٹی پر منحصر ہے۔" رضوان نے ہنستے ہوئے کہا اور لان سے چلے گئے۔ آنٹی کی مرضی تو عمر اچھی طرح سمجھتا تھا۔ سو بھاگتا ہوا جھولے پر چڑھ گیا۔

سارا دن سوچ بچار کے بعد صباء نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اب آفاق کو خط نہیں لکھے گی تاہم آخری بار فون ضرور کرے گی۔ اس لیے رات کو جب وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آئی تو ٹیلیفون بھی سائیڈ میز پر لا کر رکھ دیا پھر وہ عمر کو سلانے لگی اور جب عمر سو گیا تو اس نے چپکے سے ڈائریکٹ نمبر ڈائل کیے اور ریسیور کان سے لگا لیا۔ چند سیکنڈ بعد دوسری بیل ہونے لگی پھر ریسیور اٹھا لیا گیا۔ اگلے ہی لمحے طویل مدت بعد آفاق کی آواز سن کر وہ یوں گم صم ہو گئی۔ گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو اور آفاق بنا اس کی آواز سنے بولتے رہے۔

"ہیلو ہیلو..... صباء کون۔ صباء یہ تم ہی ہو ناں۔ ہاں صباء مجھے تمہارے علاوہ کون فون کر سکتا ہے، بولو صباء کیسی ہو تم، مجھے یقین تھا تم مجھے فون کرو گی۔ ہاں صباء میں تمہارے فون کا منتظر تھا۔" وہ بولتا رہا اور صباء اس کی آواز سن کر روتی رہی۔

"صباء پلیز تم بولتیں کیوں نہیں۔ تم چپ کیوں ہو؟" آفاق بے تابی سے پوچھ رہے تھے۔

"کیسے ہیں آپ؟" صباء نے سسکیوں کے درمیان پوچھا۔

"کاش تمہیں الفاظ کی شکل میں اپنی روح میں پیوست تنہائیاں، وحشتیں اور ویرانیاں دکھا سکتا۔ کاش میں اپنے دکھوں کو الفاظ میں ڈھال کر تمہارے سامنے پیش کر سکتا۔ مگر صباء

مجھے تو ان میں سے کوئی ایک فن بھی نہیں آتا۔ اگر آتا تو میں تم سے دور رہنے پر مجبور نہ ہوتا۔ یہاں اکیلا پڑا زیست کی گھڑیاں نہ گنتا رہتا۔ تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ، کیسی ہو؟ کس طرح اور کس حال میں جی رہی ہو؟'' آفاق کی بات سن کر صباء کا جی چاہا۔ وہ چیخ چیخ کر روئے اونچی آواز میں۔ مگر وہ ضبط کر گئی۔ بمشکل اپنی سسکیاں روک کر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

''پہلے یہ بتائیں آپ نے چیک کیوں بھیجا ہے؟''

''اس کی وضاحت تو کر دی تھی خط میں۔''

''آفاق آپ نے یہ سب اچھا نہیں کیا۔ میں چیک واپس بھیج رہی ہوں۔''

''کیا فون یہی بتانے کے لیے کیا تھا؟'' آفاق نے خشک لہجے میں پوچھا۔

''ہاں آفاق! میں جو بھی ہوں۔ جیسی بھی ہوں بس ٹھیک ہوں، زندہ ہوں۔ کیا یہ بات آپ کے لیے کافی نہیں؟ ایک امید تھی پہلے، لیکن اب تو وہ بالکل ختم ہو گئی ہے۔ آپ سے پہلے بھی کہا تھا۔ اب بھی کہتی ہوں میرا خیال چھوڑ دیجیے آپ بجائے میری فکر کرنے کے شادی کر لیجیے۔''

''مت توہین کرو میری صبا! تم اگر مرہم نہیں رکھ سکتیں تو نمک پاشی بھی مت کرو۔ شادی محض دو انسانوں کے ملاپ کا نام نہیں۔ جب شادی کا مقصد فوت ہو جائے تو پھر، تو پھر شادی فضول چیز بن کر رہ جاتی ہے۔ میں تمہیں کیا کہوں۔ کاش تم میری زندگی میں نہ آئی ہوتیں۔ کاش میں نے تم سے محبت نہ کی ہوتی۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی آفاق کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''ہاں آفاق! اب میں بھی یہی سوچتی ہوں۔ مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میں نے آپ کو سوائے دکھوں کے کچھ نہیں دیا۔ آپ اکیلے ہیں اس لیے محسوس نہیں کر سکتے ایک خاندان میں جب بہت سارے لوگ رہتے ہیں تو ہر کسی کی اپنی کوئی نہ کوئی ذمے داری ہوتی ہے۔ مجھے بھی ایک ایسی ہی ذمے داری نبھانی تھی۔ بات جب ذمے داری اور فرض کی ہو تو پھر اپنے وجود کی خوشیوں کو نہیں دیکھا جاتا۔'' صباء رونے لگی۔ آفاق کا سخت لہجہ اسے دکھی کر گیا تھا۔

''صباء پلیز! اتنی دور بیٹھ کر مت رو۔ جہاں میں تمہارے آنسو بھی نہیں پونچھ سکتا۔'' آفاق تڑپ کر بولے۔ ''سنو تمہاری محبت، تمہاری یاد میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔ میں نہیں جانتا میں محبت میں اتنا ثابت قدم کیسے رہا۔ اب سوچتا ہوں، شاید محبت ہوتی ہی اتنی بلند چیز ہے کہ انسان چاہتے ہوئے بھی اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ کتنی عجیب اور حیران کن بات ہے۔

میں اتنے سال تم سے دور رہ کر بھی تم سے محبت کر رہا ہوں۔ شاید اس لیے کہ محبت کی معراج بھی ہے۔ صباء میں تم سے محبت کرتا رہوں گا۔ کیونکہ محبت لافانی ہے۔ اس کی جڑیں میرے تمام وجود میں پھیل چکی ہیں...... میں چاہوں بھی تو اس جذبے کو ختم نہیں کر پاؤں گا۔''

''ہاں آفاق! محبت اس دنیا کا سب سے زیادہ مقدس اور عظیم جذبہ ہے اگر ہم جیسے دیوانے محبت کے لیے اپنی زندگی ضائع نہ کریں۔ اگر ہم وصل کے لیے ہجر نہ کاٹیں تو پھر محبت باقی کیسے رہے۔ آفاق ہر دور، ہر زمانے میں کوئی نہ کوئی خود کو محبت کی بھینٹ چڑھاتا ہو گا۔ جب ہی تو آج تک محبت زندہ ہے اور ابد تک زندہ رہے گی۔ کیونکہ دیوانے یونہی بھینٹ چڑھتے رہیں گے۔ ہجر اور وصل کی یہ کہانی ہر زمانے میں دوہرائی جائے گی۔'' صباء آہستہ آہستہ بولتی رہی آفاق حیرت اور محویت سے سنتے رہے، پھر بولے۔

''صباء تم ٹھیک کہتی ہو۔ میں بھی زندگی کے بقایا دن اس محبت کے سہارے گزار لوں گا۔ یوں بھی اب یہ زندگی باقی بچی ہی کیا ہو گی۔''

''پلیز آفاق! ایسی باتیں مت کریں۔ آپ کی ایسی باتیں سن کر میرے اندر کچھ ہونے لگتا ہے۔ آپ کا احساس لیے ہی تو میں زندہ ہوں ورنہ یہ زندگی جینے کے قابل کب ہے۔''

''اوکے صباء! اگر میرے زندہ ہونے سے تمہیں سکون ملتا ہے تو میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی کوشش کروں گا۔ بے شک اس کے لیے مجھے مر مر کر جینا پڑے۔ کیونکہ صباء یہ تمہاری خواہش ہے اور تمہاری خواہش تو مجھے اپنی زندگی سے کہیں زیادہ......''

بات ختم ہونے سے پہلے ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو خدا حافظ بھی نہ کہہ سکے۔ صباء نے تو سلسلہ ختم ہونے کے باوجود ریسیور نہ رکھا تھا۔ ریسیور یونہی ہاتھ میں پکڑے وہ اس کے لفظوں کی بازگشت میں کھوئی رہی اور شاید مزید کھوئی رہتی کہ عمر بولا۔

''آنٹی! کس سے بات کر رہی تھیں آپ۔''

''آفاق......'' صباء نے بے ساختہ جواب دیا پھر چونک کر بولی۔ ''ارے تم کب جاگے۔''

''آنٹی انکل آفاق؟'' عمر نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے تصدیق چاہی۔

''ہاں بیٹا! تمہارے انکل آفاق۔'' صباء نے بتایا۔

''آنٹی وہ آپ کو خط بھی لکھتے ہیں۔ فون بھی کرتے ہیں مگر خود کیوں نہیں آتے۔''

''بیٹا وہ نہیں آسکتے اور اب تو شاید وہ خط بھی نہیں لکھیں گے اور نہ ہی فون کریں

گے۔شاید کبھی نہیں۔" صباء رو پڑی۔

"آنٹی آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ کبھی نہیں روئیں گی۔"

"سوری بیٹا! بھول گئی تھی۔

"آنٹی! آپ ایک کام کریں۔فون پر میری انکل آفاق سے بات کرائیں میں انہیں سمجھاؤں گا اور کہوں گا کہ ان کو اب آ جانا چاہیے۔ میں انہیں یہ بھی بتاؤں گا کہ آپ بہت روتی ہیں۔"

"تم سو جاؤ عمر! ان کو معلوم ہے میں کس وقت کیا کرتی ہوں اور پھر بیٹا اب تو سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔تم سو جاؤ۔ مجھے تو شاید ساری عمر جاگنا ہوگا۔" وہ دکھی لہجے میں بولی۔مگر عمر کے ضد کرنے پر اسے لیٹنا ہی پڑا تاہم یہ اور بات تھی کہ آنکھیں بند ہونے کے باوجود نیند سے خالی تھیں۔



پھر کتنے ماہ و سال گزرے صباء خود بھی اندازہ نہ کر سکی وہ زندگی کو نہیں گزار رہی تھی۔ زندگی اسے گزار رہی تھی۔ اسی دوران صباء کے والد فوت ہو گئے اور باقی سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں خوشگوار زندگی بسر کر رہے تھے۔ عمر تعلیم ختم کر کے آرمی جوائن کر چکا تھا۔ ثناء بھی اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ جوان ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی نفرت بھی شباب پر آ گئی تھی۔ اب فوزیہ کے ساتھ وہ بھی پیش پیش رہتی۔ صباء کے ذمے اب گھر کا کوئی ایک کام بھی نہیں تھا۔ جب سے بچے بڑے ہوئے تھے رضوان نے فوزیہ سے کہہ دیا تھا۔ "تمہارے بچے ہیں خود پکا کر انہیں کھلاؤ اور خود بھی کھاؤ۔ صباء نے عمر بھر پکانے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔" اس طرح کچن فوزیہ کے ذمے لگ گیا۔ رضوان اپنی طرف سے صباء کا ہر ممکن طریقے سے خیال رکھتے۔

لیکن ادھر ثناء جب سے کالج گئی تھی اس کی بدتمیزیاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھیں۔ کبھی ہونٹ سکیڑ کر، کبھی ناک چڑھا کر کبھی منہ بنا کر اور کبھی دانت پیس کر وہ صباء کو دیکھتی۔ خود سے تو اس نے کبھی صباء کو بلانے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ ہاں اگر صباء کبھی اسے بلانے کا جرم کر بیٹھتی تو وہ بڑے خشک لہجے میں جواب دیتی۔ ثناء کی نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ صباء کے پاس جو کمرہ تھا، ثناء اسے لینا چاہتی تھی کیونکہ ایک تو صباء کا کمرہ بڑا تھا۔ دوسرے اس

میں اٹیچ باتھ بھی تھا۔ پہلے ثناء نے فوزیہ سے کہا تو وہ بولی۔

"میں کیا کر سکتی ہوں۔ اپنے باپ سے کہہ کر دیکھو۔" ماں کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ثناء نے باپ سے بھی کہا مگر ظاہر ہے جواب انکار میں تھا اور تو اور لان میں لگے جھولے کو بھی وہ ہاتھ نہ لگا سکتی تھی اور اس جھولے کی وجہ سے اس نے لان میں جانا ہی چھوڑ دیا تھا۔ یہی وجہ تھی اس کی نفرت بجائے کم ہونے کے اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ صباء کو چوٹی سے پکڑ کر نکال باہر کرتی۔

مگر صباء! اب ان لوگوں کی کم ہی پرواہ کرتی تھی۔ بلکہ جب وہ جھولے پر بیٹھتی اور ثناء منہ بنا کر اسے دیکھتی۔ ایسے میں فوزیہ کوئی نہ کوئی دل جلانے والی بات کہتی تو صباء انہیں چڑانے کے لیے لاپرواہی سے مسکرا دیتی اور وہ دونوں اور بھی جل جاتیں۔ خاص کر تعطیلات میں جب عمر آتا تو فوزیہ کی نفرت عروج پر ہوتی۔ صباء کے ساتھ عمر کو بھی ان کی یہ باتیں سہنی پڑتیں مگر اس کے باوجود وہ آتا ضرور تھا...... فوزیہ ملازموں سے بھی برا سلوک اس کے ساتھ کرتی تھی۔ "چلو عمر بازار سے یہ لا دو، وہ لا دو، فلاں چیز یہاں رکھو، فلاں چیز وہاں رکھو، ہر بار منہ اٹھا کر چلے آتے ہو یہاں آنا ضروری ہوتا ہے کہیں اور نہیں جا سکتے۔ ہماری جان جلانے آتے ہو، کیسے ڈھیٹ ہو؟"

عمر سب کچھ سنتا مگر پرواہ نہ کرتا۔ آنٹی کی خاطر اسے سب کچھ گوارہ تھا۔ اِدھر ثناء اپنی تمام تر نفرتوں کے باوجود صباء کو عزیز تھی۔ وہ بہت خوبصورت اور پیاری تھی اور نہ جانے کیوں صباء کے دل میں یہ خواہش جاگی کہ وہ عمر کی دلہن بنے۔ اگرچہ دیکھا تو عمر بھی تھا ثناء کو مگر صرف کزن سمجھ کر۔ یوں بھی جب عمر آتا ثناء اپنے ماموں کے گھر جا چکی ہوتی۔ ان کے ساتھ ہی وہ تعطیلات کے تین ماہ گھوم پھر گزار دیتی۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ اس کا عمر سے سامنا ہوتا۔ جس طرح عمر ضرور آتا تھا اس طرح وہ بھی ضرور جاتی تھی بلکہ ساتھ فومی اور نومی کو بھی لے جاتی اکثر ایسا ہوتا وہ عمر کے آنے سے پہلے ہی چلی جاتی اور اگر عمر کی قسمت خراب ہوتی تو اس کا سامنا ہو جاتا پھر ماں تو جو باتیں کرتی سو کرتی وہ خود ایسی ایسی حرکتیں اور باتیں بناتی کہ عمر جل کر سوچتا کہ اگر کہیں وہ اکیلی مل جائے تو گلا گھونٹ کر مار دے گا مگر وہ ایسا صرف سوچ سکتا تھا عمل نہ کر سکتا تھا کیونکہ وہ چڑیل ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔ یوں بھی پچھلے تین چار سالوں سے یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس کی ثناء سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ پھر جیسے ہی اس کی

تعلیم ختم ہوئی وہ فوج میں چلا گیا کیونکہ یہ اس کے بابا کی شدید ترین خواہش تھی۔

اب جبکہ وہ آرمی جوائن کر چکا تھا مگر اس کے باوجود جب کالج اور یونیورسٹیوں میں موسم گرما کی تعطیلات کا اعلان ہوا تو وہ اس دن تیار ہو کر لاہور پہنچ گیا۔ باہر گیٹ پر ہی رضوان ماموں سے ملاقات ہوگئی وہ شاید کہیں جا رہے تھے عمر کو دیکھ کر نہ صرف رک گئے بلکہ مسکرائے۔

''آؤ بھئی برخوردار! میں تو سمجھا تھا اب تم ہمیں بھول جاؤ گے مگر مجھے خوشی ہے کہ تم پھر آئے ہو۔''

''شکریہ ماموں جان! یہ سب آپ کی محبت ہے اور آپ کی محبت میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ میں اس بار آنٹی جان کو لینے آیا ہوں۔'' اس نے مسکرا کر وضاحت کی۔

''خیریت تو ہے یہ تبدیلی کیسی؟'' رضوان نے حیرانگی سے پوچھا۔

''ماموں جان آپ تو جانتے ہیں۔ میں آرمی جوائن کر چکا ہوں اور ظاہر ہے آرمی میں زیادہ چھٹیاں نہیں کر سکتا یعنی تین ماہ کی اتنے سال گزر گئے ہیں۔ کچھ عادت سی پڑ گئی ہے موسم گرما کے یہ دن آنٹی کے ساتھ گزارنے کی۔ اب جبکہ میں خود نہیں آ سکتا تو سوچا آنٹی کو ہی اپنے ساتھ لے جاؤں۔ اگر آپ اجازت دیں تو......''

''میں تمہاری محبت کو سمجھتا ہوں۔'' رضوان مسکراتے ہوئے بولے۔ ''بے شک ہم سے زیادہ صباء پر تمہارا حق ہے مگر یاد رہے تین ماہ ختم ہوتے ہی تم اسے چھوڑ جاؤ گے۔''

''جی ضرور ماموں جان۔'' وہ انہیں سلام کر کے فوراً اندر آیا۔ سامنے ہی اونچے برآمدے میں بیٹھی ثناء اپنے ماموں زاد کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ قریب ہی فوزیہ سامان کی پیکنگ میں مصروف تھی۔ فومی کتاب پڑھ رہا تھا جبکہ نومی چیونگم چبا رہا تھا۔ عمر نے حیرت سے ثناء کو دیکھا۔ آج تقریباً چار سال بعد اس کا اور ثناء کا سامنا ہوا تھا۔ وہ واقعی بہت خوبصورت تھی۔ بلیک پینٹ اور سفید شرٹ پہنے وہ کچھ زیادہ ہی خوبصورت لگ رہی تھی۔ عمر پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر ناگواری ابھر آئی اس نے ہونٹوں کو دائرے کی شکل دیتے ہوئے کہا۔

''ممی آپ تو کہتی تھیں اب ڈیڈی کے یہ بھانجے فوج میں چلے گئے ہیں اب ان سے

ہماری جان چھوٹ گئی مگر یہ تو......'' ثناء کی بات پر فوزیہ اور سہیل نے بیک وقت پلٹ کر دیکھا۔ مارے مروت کے عمر نے جلدی سے سلام کیا مگر ان تینوں میں سے کسی نے بھی جواب نہ دیا۔ البتہ کچھ دیر بعد فوزیہ بولی۔

''جب تک صباء زندہ ہے، یہ لوگ پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔'' فوزیہ کی بات پر سہیل ہنس پڑا اور ثناء بولی۔

''مجھے تو اس کے ڈھیٹ پن سے حیرت ہوتی ہے۔''

''چھوڑو یار۔'' سہیل اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''چلو اٹھو، ورنہ دیر ہو جائے گی، ہمیں آج ہی مری جانا ہے۔'' اسی اثناء میں صباء بھی باہر آ گئی اور عمر بھاگ کر ان سے لپٹ گیا۔

''آنٹی جان! کیسی ہیں آپ؟''

''اچھی ہوں بیٹا۔'' صباء نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا پھر چونک کر بولی۔ ''ارے بیٹا کپڑے نہیں لائے کیا؟''

''جی نہیں آنٹی۔'' عمر نے شرارت سے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

''کیوں؟'' صباء نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اس لیے......'' ثناء، سہیل کا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے بولی۔ ''کہ اب کپڑے بھی ہمارے پہننے کا ارادہ ہو گا۔ ویسے ڈیڈی کے تو اس کو آئیں گے نہیں اور فومی، نومی ابھی چھوٹے ہیں ارے ہاں یاد آیا سہیل تمہارے پاس پرانے کپڑے تو ہوں گے، وہی اس کو دے دینا۔'' عمر نے غصے سے پلٹ کر ایک نظر اسے دیکھا اور نفرت بھری نگاہ ان دونوں پر ڈالتے ہوئے بولا۔

''چلیے آنٹی جان میں آپ کو لینے آیا ہوں۔'' پھر وہ آنٹی کا ہاتھ پکڑے ان کے کمرے میں چلا گیا تاہم اس کا خون کھول رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا سہیل اور ثناء کو اتنے ٹھڈے مارے کہ حلیہ بگڑ جائے مگر ضبط کرتے ہوئے وہ جلدی جلدی صباء کا سامان بیگ میں رکھنے لگا۔

''مگر بیٹا بھائی جان سے تو پوچھنا پڑے گا اور وہ اس وقت گھر میں نہیں ہیں۔''

''میں ماموں جان سے پوچھ کر ہی اندر آیا تھا۔ وہ دروازے پر ہی مجھے مل گئے تھے۔ بس آپ چلنے کی تیاری کیجیے۔'' عمر بیگ کاندھے پر ڈالتے ہوئے بولا۔

"تمہیں آخر جلدی کس بات کی ہے۔ نانی جان کو تو ابھی آپ نے سلام بھی نہیں کیا؟"

"ارے ہاں۔" وہ صباء کے ساتھ باہر آیا اور دل میں سوچا آپ کو کیا پتہ ان لوگوں کی شکلیں دیکھ کر میرا خون کھول کر رہ گیا ہے، پھر نانی جان کو سلام کر کے وہ باہر آ گیا۔ صباء نے چلتے ہوئے فوزیہ کو سلام کیا اور جب عمر کے ساتھ گیٹ پر آئی تو گیٹ کے سامنے فوجی جیپ کھڑی تھی۔

"اچھا تو میرا بیٹا جیپ میں آیا ہے۔"

"جی آنٹی۔" وہ بیگ رکھتے ہوئے ہنسا۔ "ویسے سچی بات ہے۔ یہ پاپا کی ہے میری نہیں۔"

"خیر خیر ایک روز تمہیں بھی تو ملے گی۔ ویسے کتنا اچھا ہوتا اگر تم یونیفارم میں آتے۔"

"ارے آنٹی جان میرے ساتھ ہی تو چل رہی ہیں۔ آپ وہاں روز دیکھ لیا کیجیے گا مجھے میری وردی میں۔" اس نے جیپ اسٹارٹ کر کے گیئر میں ڈال دی۔ پھر صباء گھر والوں کا پوچھتی رہی اور وہ جواب دیتا رہا یوں بھی لاہور سے اسلام آباد کا راستہ دونوں اطراف سر سبز اور شاداب درختوں سے اٹا پڑا تھا۔ صباء انہیں دیکھتی رہی اور وہ سارے راستے اپنی باتوں سے صباء کا دل بہلاتا رہا۔ اسی خوش کن گفتگو میں راستہ کٹ گیا۔ گھر پہنچی تو بہن، بہنوئی استقبال کے لیے موجود تھے۔ صباء بہت مدت بعد ایک عجیب سا سکون محسوس کرتی ہوئی باہر لان میں ہی بیٹھ گئی۔ بہن اور بہنوئی بھی اس کے پاس آ گئے۔ جبکہ عمر اس کا بیگ رکھنے اندر چلا گیا۔

"کیا بات ہے بہت کمزور سی لگ رہی ہو۔ بیمار تھیں کیا؟" انوار نے اپنائیت سے پوچھا۔

"نہیں تو بیمار بھلا کیوں ہوتی۔ گرمیوں میں تو ویسے ہی صحت کچھ ڈاؤن ہو ہی جاتی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک کہا تم نے اور لاہور کی گرمی توبہ!" پروین نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "اچھا یہ بتاؤ باقی گھر والے کیسے ہیں؟"

"سب لوگ خیریت سے ہیں، تم سناؤ تم کیسی ہو؟" صباء نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یوں تو میں ٹھیک ہی تھی۔ مگر دو تین دن سے تمہارے بیٹے نے مجھے تھکا مارا۔" پروین نے شکوہ کیا۔

"کیوں، کیا کیا ہے میرے بیٹے نے؟" صباء نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھئی یہ پوچھو کیا نہیں کیا؟" انوار نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ کچھ بتائیں گے تو پتہ بھی چلے گا۔" صباء نے کہا تو پروین بولی۔

"یہ بات تو طے تھی کہ گرمیوں کی تعطیلات میں وہ اس بار تمہیں لے کر آئے گا۔ مگر اس کے لیے وہ افراتفری مچائی کہ کیا بتاؤں۔ مجھ سے کہا گیا تمہارا کمرہ ملازمہ کی بجائے میں خود ڈیکورٹ کروں۔ میں نے ڈیکورٹ کیا تو اسے پسند نہ آیا پھر ان تین دنوں میں میں نے کتنی بار تمہارے کمرے کو سیٹ کر کے بگاڑا، مجھے خود یاد نہیں رہا مگر تمہارے بیٹے کو پھر بھی پسند نہیں آیا۔ آخر اس نے خود تمہارے کمرے کو سیٹ کیا اور بولا۔ "ممی آنٹی آپ کی بہن ہیں مگر آپ کو پتہ ہی نہیں وہ کس چیز کو کس انداز میں پسند کرتی ہیں۔ اب میں خود ہی ان کا کمرہ ڈیکوریٹ کروں گا اور یوں میری جان بچی۔" پروین نے ہنستے ہوئے تفصیل بیان کی۔

اتنے میں عمر بھی آ گیا ایک نظر سب پر ڈالی اور ہونٹ سکیڑ کر بولا۔

"ممی! آپ آنٹی کو صرف باتوں پر ہی ٹرخا رہی ہیں۔ چائے وغیرہ کا کوئی انتظام نہیں کیا اب تک آپ کو معلوم نہیں ہم لوگ اتنا لمبا راستہ طے کر کے آئے ہیں۔ کیوں آنٹی جان۔" وہ مسکرایا۔

"ارے ہاں۔" پروین نے فوراً ملازمہ کو آواز دی اور کرنل انوار ہنستے ہوئے بولے۔

"دیکھا تم نے۔" اور صباء مسکرا کر عمر کو دیکھنے لگی وہ جو پچھلی گرمیوں تک اس کے لیے بہت چھوٹا اور بچہ سا تھا اب ایک دم بہت بڑا اور جوان ہو گیا تھا بلکہ ایک ذمے دار افسر بھی بن گیا تھا۔

"ممی! چائے کے آنے تک میں آنٹی کو ان کا کمرہ نہ دکھا لاؤں۔ کیوں پاپا؟" اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ صباء کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا لے گیا۔

ایک ہفتہ یوں گزرا کہ صباء کو پتہ بھی نہ چل سکا۔ سارا دن وہ پروین سے باتیں کرتی لان میں ٹہلتی اور کبھی سوچوں میں گم ہو جاتی۔ حسب معمول دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ پروین کے ساتھ باہر لان میں بیٹھ گئی کیونکہ کئی دنوں سے موسم ابر آلود تھا۔ سارا دن بھیگی بھیگی ہوائیں چلتی رہتیں اور پروین کے گھر کا بڑا سا لان بڑا پیارا لگتا۔ وہ دونوں بہنیں بے تحاشہ باتیں کر رہی تھیں۔ ماضی، حال اور مستقبل کی باتوں ہی باتوں میں ثناء کا ذکر نکل آیا اور صباء مسکرا کر بولی۔

''پروین! تم نے دیکھا نہیں ثناء کو ماں سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی ہے۔''

''دفعہ کرو اس کی خوبصورتی کو۔'' پروین ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''ہے تو پوری اپنی ماں کی کاپی، بلکہ ماں سے بھی دو ہاتھ آگے۔ جب کبھی بھولے سے چلے جاؤ، اسے اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ سلام ہی کر لے۔ بدتمیزوں کی طرح یوں پاس سے گزر جاتی ہے جیسے سڑک پر راہگیر ایک دوسرے کو دیکھے بنا گزر جاتے ہیں۔ میں تو جب بھی جاتی ہوں ہمیشہ یہ سوچ کر آتی ہوں۔ اب کبھی یہاں نہیں آؤں گی مگر مجبوری ہے۔ بھائی کا گھر ہے کبھی نہ کبھی جانا پڑ ہی جاتا ہے۔ خیر......'' وہ پتہ نہیں کیا کہتے کہتے چپ ہو گئی۔

''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا ہے۔'' صباء کچھ سوچ کر ہنستے ہوئے بولی۔

''ایسی کیا بات ہے جو تم ڈر گئیں۔'' پروین نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''پروین میں عمر کے لیے ایک بات سوچ رہی تھی۔ لیکن اب لگتا ہے شاید تمہیں پسند نہ آئے کیونکہ اس بات کا تعلق ثناء سے ہی ہے۔''

''یہ کیسی بات کر رہی ہو صباء! عمر میرا بعد میں پہلے تمہارا بیٹا ہے۔ تم نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہے بلکہ جو بھی سوچا ہے اچھا ہی سوچا ہو گا تم کیا کہنا چاہتی ہو کہہ دو۔'' پروین نے اس کو حوصلہ دیا۔

صباء نے بہن کا چہرہ دیکھا اور طویل سانس لے کر بولی۔ ''اگرچہ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا مگر نہ جانے کیوں یہ سوچ میرے دماغ میں آئی۔ میں چاہتی ہوں ثناء کی شادی عمر سے ہو جائے تو یہ نہ صرف ایک اچھی بات ہو گی بلکہ دونوں کی جوڑی سجے گی بھی خوب۔'' پروین نے پہلے تو بہن کو کہہ دیا تھا۔ لیکن اب یہ بات سنی تو بولی۔

''چھوڑو صباء اس بات کو، عمر کے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں۔ باقی رہی خوبصورتی تو ثناء سے بھی زیادہ خوبصورت لڑکیاں اس دنیا میں موجود ہیں اور پھر ثناء ہی کیوں! عمر کی آنٹیوں کی بھی لڑکیاں ہیں۔ ان میں سے بھی کسی کا انتخاب ہو سکتا ہے۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے۔ مگر نہ جانے کیوں میرا دل چاہتا ہے عمر کی شادی ثناء ہی سے ہو۔'' صباء نے اپنی بات پر زور دیا۔

''ہاں بھئی، بھائی کے گھر رہتی ہو۔ اس لیے بھائی کا ہی سوچو گی۔'' پروین نے ہنس کر کہا۔

''تم کچھ بھی کہو پروین مگر یہ بھی تو سوچو اگر یہ رشتہ ہو جائے تو ساری عمر آنا جانا ہے

گا ورنہ فوزیہ کو تو تم جانتی ہو۔'' صباء نے اسے سمجھانا چاہا۔

''تمہاری بات ٹھیک ہے صباء! مگر یہ بھی تو سوچو میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ اگر ثناء اس کو لے کر الگ ہو گئی تو میں کیا کروں گی۔ جان بوجھ کر زہر نہیں کھا سکتی، ویسے بھی بہو کا انتخاب خوبصورتی کی بجائے سیرت اور خاندان دیکھ کر کرنا چاہیے۔ اگر لڑکی کی ماں اپنے سسرال والوں کو نہیں دیکھ سکتی تو لڑکی کیسے دیکھ لے گی۔ اگر ماں زبان دراز ہے تو بیٹی بھی زبان دراز ہی ہو گی۔ دیکھو صباء یہ زندگی بھر کے معاملات ہوتے ہیں۔ میں تو خوب سوچ سمجھ کر اپنی بہو کا انتخاب کروں گی۔ محض بھائی کے گھر آنے جانے کے لیے میں اپنی ساری پونجی داؤ پر نہیں لگا سکتی۔ بھائی اپنے گھر میں خوش رہے ہم سے نہیں ملتا تو نہ سہی مگر ثناء کا رشتہ؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یوں بھی مجھے یقین ہے فوزیہ اس رشتے کے لیے کبھی رضامند نہیں ہو گی پھر خواہ مخواہ بات ضائع کرنے کا فائدہ۔''

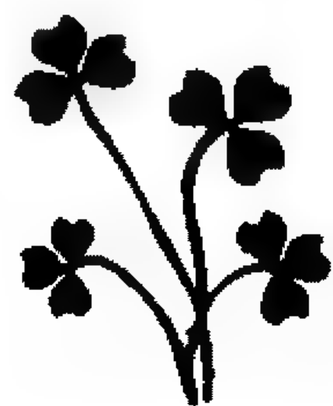
''یہ بات تو تم چھوڑ دو یعنی بھابی والی، جب میں خود بھائی سے بات کروں گی تو وہ انکار نہیں کریں گے۔ وہ میری کسی بات سے انکار کرتے ہی نہیں۔ باقی رہی عمر کے دور ہونے کی بات تو وہ بہت سمجھدار بچہ ہے، اسے اچھے برے کی تمیز ہے۔ اسے معلوم ہے کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں، مجھے یقین ہے وہ ثناء کو سدھار لے گا تم ایک بار ہاں تو کرو۔'' صباء نے بہن سے کہا۔

''کس سلسلے میں آنٹی جان؟'' عمر جو پیچھے کھڑا ان کی تمام تر گفتگو سن چکا تھا۔ بے ساختہ بول پڑا اور پھر صباء کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

''تمہاری شادی کے سلسلے میں۔'' پروین نے بیٹے کو محبت سے دیکھا۔

''میری شادی اور ثناء سے ہو، یہ مجھے پسند نہیں۔'' عمر نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور صباء کا ردعمل دیکھنے لگا۔

''کیوں، کیوں پسند نہیں؟'' صباء نے گھور کر عمر کو دیکھا۔ ''کیا کمی ہے ثناء میں، تم نے دیکھا نہیں وہ کتنی خوبصورت ہے۔ تمہاری اور اس کی جوڑی خوب سجے گی۔''



"مگر آنٹی جان! ایک بات۔" عمر شرارت سے ہنس کر بولا۔ "سنا ہے خوبصورت تو چڑیل بھی ہوتی ہے۔ میرا مطلب ہے چڑیل خوبصورت عورت کا روپ دھار کر مرد کو اپنے جال میں پھانستی ہے۔ مگر آپ کو پتہ ہے پھر وہ چڑیل، مرد کو کھا جاتی ہے۔" عمر نے معصوم بن کر کہا۔

"بکومت......" صباء کو ہنسی آ گئی۔

"سوچ لیجیے آنٹی! اگر وہ آپ کی ثناء چڑیل مجھے کھا گئی تو۔" عمر کی آنکھوں میں شرارت ہی شرارت تھی۔

"اس کا مطلب ہے وہ تمہیں پسند نہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے۔ یہ کوئی زبردستی والی بات تو ہے نہیں۔ بس یونہی میرا دل چاہا کہ وہ تیری دلہن بنتی مگر خیر۔" صباء کے لہجے میں افسردگی تھی۔ عمر تڑپ گیا۔

"ارے آنٹی جان! اگر وہ آپ کو پسند ہے تو میں کیسے ناپسند کر سکتا ہوں۔" عمر نے اسے افسردہ دیکھ کر کہا۔

"سچی......" صباء خوش ہو گئی اور عمر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ جبکہ پروین چپ چاپ بیٹھی دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ اچانک عمر بولا۔

"لیکن آنٹی جان! ابھی میرا شادی کا کوئی پروگرام نہیں۔ ویسے بھی آپ کی بجائے مجھے خود ٹرائی کرنی چاہیے کیونکہ ہو سکتا ہے آپ کی ثناء مجھے رد کر دے۔"

"کیا مطلب؟" صباء نے شک سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب چھوڑیئے آپ جو کہیں گی۔ میں وہی کروں گا۔ لیکن فی الحال شادی نہیں کر سکتا۔"

"میں کون سا تیرا سہرا لیے کھڑی ہوں۔" صباء نے ہنس کر کہا تو عمر بھی ہنس دیا۔ اسی وقت کرنل انوار آ گئے۔

"کیوں بھئی آج چائے کا پروگرام کینسل۔" انہوں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ارے......" پروین نے چونک کر شوہر کو دیکھا پھر جلدی سے ملازمہ کو آواز دی۔

"کیا بات ہے صاحبزادے آج آپ اور آپ کی آنٹی اس وقت گھر میں نظر آ رہے ہیں۔ آج کے لیے کوئی پروگرام نہیں تھا کیا؟" کرنل نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ کیونکہ جب سے صباء آئی تھی وہ تقریباً روزانہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوتے ہی اس کو گھمانے لے جاتا تھا۔

"پاپا! آج مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔ کل ان شاء اللہ جائیں گے۔" پھر چائے پیتے ہی وہ سب کو سلام کرتا ہوا اٹھ گیا۔

تیزی سے جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے سوائے کام کے اور کوئی خیال اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ کام اس کے آفیسر نے اس کے سپرد کیا تھا۔ مگر نہ جانے کیوں مری روڈ سے گزرتے ہوئے یکایک اس کے ذہن میں ثناء کا بھی خیال آ گیا اور عمر نے جیپ روک لی۔ اور دور پہاڑوں پر اترتے ہوئے سفید بادل دیکھنے لگا۔ جو اتنی دور ہونے کے باوجود مری تک اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے تھے۔ ہوا میں ٹھنڈک سی تھی۔ عمر نے جیپ کا رخ پہاڑوں کی جانب موڑتے موڑتے خود کو سرزنش کرتے ہوئے ارادہ بدل دیا، کام ضروری ہے مس رضوان! لیکن کام ختم ہونے کے بعد تمہیں دیکھ لوں گا۔ عمر نے دل میں سوچا اور پُرسکون ہو گیا۔ دراصل وہ چاہتا تھا براہِ راست ثناء سے بات کر کے دیکھ لے کیونکہ اگر ثناء رضامند ہو جاتی تو پھر فوزیہ کے کردار کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی۔ جب ثناء خود کہتی میں عمر سے شادی کروں گی، تو پھر فوزیہ انکار نہ کر سکتی تھی۔ مگر ثناء کا جھکاؤ سہیل کی جانب تھا۔ اس بات کو عمر نے اس دن چند لمحوں میں ہی محسوس کر لیا تھا۔ مگر محض آنٹی کی خواہش کی وجہ سے اس نے یہ زہر پینے کا ارادہ کر لیا تھا۔

واپسی رات گئے ہوئی تھی۔ جیپ لاک کر کے وہ سب سے پہلے آنٹی کے کمرے میں آیا تھا۔

"آنٹی جان! کیا آپ سو گئیں؟" عمر نے کھلے دروازے سے اندر داخل ہوتے

ہوئے پوچھا۔

صباء نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور بولیں۔ ''آؤ بیٹا بہت دیر کر دی تم نے۔''

''بس آنٹی جان! ضروری کام تھا اور کرنا بھی مجھے خود تھا۔ اس لیے دیر ہوگئی۔'' عمر نے وضاحت کی۔

''کھانا کھاؤ گے؟'' صباء نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں آنٹی! کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں البتہ کافی پینے کا موڈ ہے اور وہ میں خود ہی بنا لاتا ہوں۔'' وہ فوراً اٹھ کر چلا گیا۔ اور کچھ دیر بعد ہی دو کپ کافی لیے چلا آیا۔ پھر کافی پینے کے ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کرتا رہا اور کافی ختم ہوتے ہی صباء بولی۔

''اب جا کر سو جاؤ رات بہت ہوگئی ہے۔''

''واقعی رات تو بہت ہوگئی۔'' عمر نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مگر آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟''

''طبیعت کو کیا ہو سکتا ہے۔'' صباء مسکرائی۔ ''بس یونہی جاگ رہی تھی۔'' عمر کا جی چاہا کہہ دے آنٹی میں آپ کے رت جگوں سے واقف ہوں مگر وہ خاموشی سے اٹھ گیا۔

صبح ابھی صباء تلاوت سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ عمر آ گیا۔ ''چلیے آنٹی! جلدی سے تیار ہو جایئے۔'' اس نے آتے ہی کہا۔

''اتنی صبح تیار ہو جاؤں کس لیے؟'' صباء نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ''ایک تو پہلے ہی رات دیر سے آئے تھے اور اب اتنی جلدی اٹھ گئے ہو۔ آخر کیوں؟''

''آنٹی جان! پلیز سوال مت کیجیے۔ بس فٹا فٹ یعنی دس منٹ میں تیار ہو کر باہر آ جایئے۔'' وہ باہر نکل گیا اور جب کچھ دیر بعد صباء تیار ہو کر آئی تو وہ کھانے پینے کی چیزیں کسی سلیقہ مند عورت کی طرح خود پیک کر رہا تھا۔ قریب ہی پروین کھڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پھر صباء کو دیکھتے ہی بولی۔

''بھئی صباء! مجھ سے زیادہ خوش قسمت تم ہو، تمہیں تو خوب گھمایا پھرایا جا رہا ہے۔ مجھے تو کبھی لفٹ نہیں دی تمہارے اس بیٹے نے اور آج اگر میں نے یہ کہہ دیا کہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں تو اس نے صاف انکار کر دیا۔''

''واقعی......'' صباء نے گھور کر عمر کو دیکھا۔

''آنٹی جان! پلیز صبح صبح گھور کر مت دیکھیں آپ کو پتہ ہے ممی کو پاپا سب کچھ پہلے ہی دکھا چکے ہیں بلکہ بہت پہلے ہی دکھا چکے ہیں مگر آنٹی آپ تو......'' بات کرتے کرتے اس نے صباء کی طرف دیکھا جو ایک دم کہیں کھو گئی تھیں۔ ''یہ تم نے کیا کہہ دیا؟'' عمر نے آنٹی کو افسردہ دیکھ کر خود کو سرزنش کی پھر مسکرا کر بات بدلتے ہوئے بولا۔ ''دیکھیے نا آنٹی! ممی بعد سب آنٹیاں بھی یہاں آئیں اور خوب گھوم پھر کے گئیں مگر آپ کے پاس میں جاتا تھا۔ اس لیے آپ کبھی کچھ نہ دیکھ سکیں اور اب یہ میری ذمہ داری ہے نا کہ میں آپ کو خوب گھماؤں۔'' عمر نے صباء کو مزید افسردہ ہونے سے بچا لیا۔

''باتیں بنانی تو اسے خوب آتی ہیں۔'' پروین نے ہنس کر کہا۔

''او۔کے ممی۔'' وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا پھر صباء کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلا آیا۔

''بھئی، آخر مجھے بھی تو پتہ چلے کہ ہم کہاں چل رہے ہیں؟'' صباء نے جیپ میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ عمر نے برآمدے میں کھڑی ماں کی طرف ہاتھ ہلایا اور جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا۔

''اچھی آنٹی ہم لوگ ایوبیہ جا رہے ہیں۔''

''ایوبیہ؟'' صباء حیران ہو کر بولی۔

''کیوں، اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے؟'' عمر نے ہنس کر پوچھا۔

''میں وہاں نہیں جاؤں گی۔'' صباء نے فیصلہ سنا دیا۔

''مگر کیوں آنٹی جان؟'' عمر نے بڑے پیار سے پوچھا۔

''وہاں جانے والے راستے تو بہت خطرناک ہیں۔ اگر راستے میں کوئی حادثہ ہو گیا تو؟ جیپ واپس موڑ لو۔ مجھے ایسے راستوں سے بہت خوف آتا ہے۔''

عمر نے ایک نظر صباء پر ڈالی پھر آہستہ سے بولا۔ ''ایک بات تو بتائیں آنٹی جان! یہ لڑکیاں اس قدر بزدل کیوں ہوتی ہیں؟ راستے خطرناک دیکھ کر وہ منزل کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیتی ہیں۔ حالانکہ بے خطر کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا، پہلے زندگی ملتی ہے اور بعد میں موت آتی ہے۔ جب زندگی ہی نہ ہوگی تو پھر موت کیا لینے آئے گی۔ انسان اگر منزل کو پانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے اس کے اندر حوصلہ ہونا چاہیے اگر حوصلہ ہو تو پھر ان خطرناک راستوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔''

صباء نے غور سے عمر کو دیکھا۔ وہ جب سے بڑا ہوا تھا تب سے ایسی ذو معنی باتیں کرنے لگا تھا۔ مگر ہمیشہ بات ختم کر کے وہ یوں لاپرواہ بن جاتا جیسے محض یہ بات اتفاقیہ اس کے منہ سے نکل گئی ہو۔ اس وقت بھی بات ختم کر کے وہ بڑی لاپرواہی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ صباء کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔

''لڑکیاں بزدل اس لیے ہوتی ہیں عمر! کہ وہ لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ایثار ان کی زندگی کا لازمی جزو ہوتا ہے۔ کبھی خاندان کے لیے کبھی باپ کے لیے اور کبھی بھائیوں کے لیے۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔''

''مگر ان سب باتوں سے خود انہیں کیا حاصل ہوتا ہے؟'' عمر نے سامنے دیکھتے ہوئے ہی بات کی تھی۔

''حاصل تو سوائے کرب اور دکھوں کے کچھ نہیں ہوتا۔''

''تو پھر ایسی بے وقوفی کرنے کی ضرورت کیا ہوتی ہے۔ یہ حماقت ہے، میں ایسے ایثار کو پسند نہیں کرتا۔ آنٹی! لڑکیوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔'' عمر نے صباء کو دیکھ کر کہا گویا کہنا چاہتا ہو آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مگر وہ کھل کر کچھ بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ تاہم یہ اور بات ہے صباء اس کے لہجے سے سب کچھ سمجھ جاتی۔ اسی لیے آہستہ سے بولی۔

''بیٹے! یہ حماقت نہیں ہوتی اور اگر یہ حماقت ہے تو بھی اچھی ہے کیونکہ اس حماقت کی بدولت پورے خاندان کو تو خوشیاں ہی ملتی ہیں۔''

''مگر فائدہ؟'' عمر تلخی سے بولا۔ ''زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ ہر انسان اس میں ایک بار اپنے لیے ضرور سوچتا ہے مگر......'' عمر براہ راست آنٹی سے کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا اور صباء نے سوچا اگر مزید اس موضوع پر بات ہوتی رہی تو شاید بات اس کی ذات تک آ پہنچے، اس خوف کے پیش نظر اس نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پلیز عمر! ختم کرو یہ سب۔''

''او۔ کے آنٹی!'' عمر فوراً سنبھل گیا۔ ''لیجیے یہ موضوع اب ختم، چلیے کوئی اور بات کیجیے۔''

''میں کیا بات کروں، تم ہی باتیں کرتے جاؤ۔''

''جی بہتر۔'' عمر نے سعادت مندی سے کہا اور شروع ہو گیا پھر ایوبیہ پہنچنے تک عمر نے کتنے موضوعات پر باتیں کیں۔ یہ بھی یاد نہ رہا بس ایک ہی خیال تھا اس کے ذہن میں

کہ آنٹی کو ہر حال میں خوش رکھنا ہے۔ خواہ اچھے طریقے سے یا برے طریقے سے۔

رات گئے جب ان کی واپسی ہوئی تو مال سے گزرتے ہوئے صباء بولی۔ ''عمر! تمہیں معلوم ہے ثناء بھی یہیں آئی ہوئی ہے۔''

''وہ تو خیر ہر سال ہی آتی ہے۔ آپ کو ملنا ہے کیا اس سے؟''

''نہیں تو......'' صباء نے جلدی سے کہا۔

''ویسے ملنے کا فائدہ بھی نہیں، جب وہ آپ کو گھر میں لفٹ نہیں دیتی تو باہر کیا دے گی۔ بہرحال اب یہ صرف کچھ عرصہ کی بات ہے۔ اس کے بعد......'' عمر شوخی سے ہنس کر بولا۔ ''ہم مس رضوان کو آنٹی کی ملازمہ کا درجہ دے کر آنٹی کے حوالے کر دیں گے۔ کیوں آنٹی؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''بکومت۔'' صباء مصنوعی خفگی سے بولی۔ ''وہ تو اس گھر کی رانی ہو گی۔''

''جی ہاں، جس طرح فوزیہ ممانی اس گھر کی رانی ہیں۔'' عمر نے طنزیہ کہا۔

''عمر! مجھ سے ایسی باتیں مت کیا کرو۔'' صباء نے غصے سے کہا اور جیپ سے اتر گئی کیونکہ وہ لوگ گھر پہنچ چکے تھے۔

''ارے آنٹی! بات تو سنیں۔'' عمر اُن کے پیچھے لپکتے ہوئے بولا۔ آپ تو ناراض ہو گئیں آپ کی خوشی کے لیے ہم اسے رانی تو کیا ملکہ کا درجہ دے دیں گے۔ بس آپ خوش رہا کریں۔'' صباء نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔

ایک ماہ میں عمر نے صباء کو اتنا گھمایا تھا کہ وہ پوری زندگی میں بھی اتنا نہیں گھومی ہو گی۔ جب صباء کو عمر گھما پھرا چکا تو پھر دل میں طے شدہ پروگرام کے مطابق اس نے ثناء کی خبر لینے کا فیصلہ کیا اور پوری تیاری کر کے اس کی تلاش میں چل پڑا۔ مگر پوری مری چھان ماری مگر ثناء اور اس کے ماموں کے گھر والوں کا سراغ نہ ملا۔ عمر بجائے مایوس ہونے کے اور واپس آنے کے وہیں کبھی مال پر، کبھی کشمیر پوائنٹ سے پنڈی پوائنٹ، کبھی گلیات اور بھوربن میں گھومتے ہوئے اسے تلاش کرتا رہا۔ مگر ثناء کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ عمر مایوس ہو کر واپس گھر چلا آیا اور سوچنے لگا۔ کہا تو سہیل نے مری ہی کا تھا مگر اب پتہ نہیں کشمیر گئے ہیں یا پھر، خیر دیکھا جائے گا۔'' اس نے بے زاری سے سر جھکا اور سوچنے لگا۔ آنٹی کی خواہش کی تکمیل تو ہر حال میں کرنی ہے۔

اسی شام رضوان ماموں کا فون آ گیا۔ جب سے صباء آئی تھی اس کی خیریت دریافت کرنے کے لیے وہ اکثر فون کرتے رہتے تھے۔فون عمر نے ریسیو کیا اور اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولا۔''ماموں جان! کیا فومی، نومی مری کے ٹور سے واپس آ گئے؟''

''نہیں بیٹا! وہ تو ایبٹ آباد چلے گئے ہیں۔'' رضوان ماموں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''جی اچھا...... لیجیے آنٹی آ گئی ہیں۔آپ ان سے بات کیجیے۔'' عمر نے ریسیور صباء کے ہاتھ میں دے دیا۔

فون پر دونوں بہنوں نے بھائی سے بات کی تھی۔فون کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد عمر ممی کے پاس آ کر بولا۔

''ممی! مجھے امام ضامن باندھ دیجیے۔''

''کیوں خیریت تو ہے؟'' پروین نے کچھ محبت اور کچھ فکر مندی سے عمر کو دیکھا۔

''جی ممی! خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔'' اس نے شرارت سے ہنستے ہوئے صباء اور پروین کو باری باری دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' پروین نے گھور کر اسے دیکھا۔

''کیوں بھئی، کہاں جا رہے ہو تم؟'' صباء نے بھی پوچھا۔

''ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔'' عمر نے کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''کچھ بتاؤ گے نہیں۔'' صباء نے ہاتھ بڑھا کر اس کا چہرہ اپنی جانب کیا۔

''نہیں آنٹی جان! ابھی میں کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔تاہم جب کام ہو گیا تو ان شاء اللہ ضرور بتاؤں گا۔''

''یاد رکھنا عمر تم نے پہلی بار کوئی بات مجھ سے چھپائی ہے۔''

''آنٹی جان! یہ کام بھی تو آپ کا ہی ہے۔'' وہ جھک کر بولا اور قبل اس کے کہ صباء کچھ اور پوچھتی وہ چلا گیا۔

''یا اللہ اسے اپنی پناہ میں رکھنا۔'' صباء نے دعا دی تو پروین مسکرا دی۔

عمر نے ایبٹ آباد جانے کے لیے خطرناک مگر شارٹ کٹ راستے کا انتخاب کیا تھا۔

تیزی سے ڈرائیونگ کرتے ہوئے وہ مسلسل ثناء کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ وہ ثناء جس نے کبھی عمر سے سیدھے منہ بات نہ کی تھی اور آج اسی ثناء سے وہ اظہار عشق کرنے جا رہا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اپنے ماموں زاد سہیل کو بہت پسند کرتی ہے اور ہو سکتا ہے محبت کے موضوع پر وہ آپس میں مکالمے بازی بھی کر چکے ہوں۔ اب پتہ نہیں وہ مجھے لفٹ دے گی یا نہیں۔ اپنے انہی خیالات میں گم وہ اطراف کے خوبصورت اور دلکش نظاروں سے بھی بے نیاز ہی رہا۔

عصر کی اذان ہو رہی تھی۔ جب عمر وہاں پہنچا۔ جیپ روک کر وہ اوپر بلند بالا پہاڑوں کو دیکھنے لگا۔ پہاڑ کے نیچے ہی مسجد تھی اور پہاڑ کے اندر ہی سے ایک ٹھنڈے چشمے کا پانی بہتا تھا جو مسجد کے نمازیوں کے بھی کام آتا تھا۔ عمر نے جیپ لاک کی اور مسجد میں داخل ہو گیا۔ وضو کر کے نماز پڑھی اور جب وہ نماز سے فارغ ہو کر باہر آیا تو یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس کی نظر اوپر اٹھ گئی اسے کچھ شک سا ہوا۔ کچھ سوچتے ہوئے وہ اوپر چلا آیا اور اس کا شک درست ہی نکلا۔ وہ ثناء ہی تھی ایک خطرناک پتھر پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی وہ مسکرا رہی تھی اور سہیل فوکس درست کر رہا تھا۔

''اچھا محترمہ دیکھ لوں گا۔ آپ کے اس بونگے کزن کو بھی۔'' عمر بڑبڑایا۔ کچھ دیر وہ وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر دوسری سمت سے مڑ کر اس کی جانب بڑھنے لگا۔ مگر اتنے میں وہ سہیل کا ہاتھ تھام کر اتر گئی اور عمر وہیں بیٹھ کر انہیں دیکھنے لگا۔ وہ دونوں اکیلے ہی تھے۔ دوسرے لوگ نہ جانے کہاں تھے۔ اگر آس پاس ہوتے تو نظر آتے۔ وہ دونوں گھوم پھر کر باتیں کرتے۔ تصویریں بناتے رہے اور عمر دیکھتا رہا پھر شاید فلم ختم ہو گئی تھی۔ سہیل ایک پتھر پہ بیٹھ گیا اور کیمرے سے ریل نکالنے لگا۔ ثناء پاس بیٹھی مسلسل باتیں کیے جا رہی تھی۔ پھر نہ جانے سہیل نے کیا کہا وہ ہنستے ہنستے اس کے کاندھے پر سر رکھتے ہوئے شرما گئی۔ عمر بھنا گیا۔''ہاں تو آنٹی جان یہ ہے آپ کی ثناء۔ مگر خیر آپ کی خاطر یہ بھی سہی۔''

اچانک وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر اٹھے اور نیچے چلے گئے۔ پھر عمر بھی اپنی جیپ میں آ بیٹھا۔ اور تعاقب شروع کر دیا اور یہ تعاقب ہوٹل پہنچ کر ختم ہو گیا۔ عمر نے جیپ واپسی کے لیے موڑ لی، رات وہیں اپنے ایک دوست کے گھر بسر کی اور صبح ہوتے ہی ہوٹل پہنچ گیا۔ اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ لوگ نظر آ گئے۔ فومی، نومی اور سہیل

گاڑی میں سامان رکھ رہے تھے جبکہ خواتین پاس کھڑی باتوں میں مصروف تھیں۔

عمر نے شکر ادا کیا کہ وہ وقت پر پہنچ گیا۔ اس نے پھر ان کا تعاقب شروع کیا جو ایک خوبصورت پارک پر ختم ہوا کیونکہ آج دوسرے لوگ بھی ساتھ تھے۔ اسی لیے عمر کو بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ عمر اسی کشمکش میں تھا کہ ثناء سے کس طرح بات کی جائے۔ وہ جیپ میں بیٹھا طریقے سوچ رہا تھا کہ دفعتاً ثناء واپس آتی ہوئی نظر آئی۔ عمر نے سوچا شاید اب موقع مل جائے مگر اس کے ساتھ ہی سہیل بھی مڑا۔ عمر نے دانت پیستے ہوئے سوچا۔

’’دیکھتا ہوں۔ یہ کب تک تمہارے ساتھ رہے گا۔‘‘ وہ دونوں پھر واپس چلے گئے اور عمر جیپ میں ہی بیٹھا رہا۔ موسم کچھ زیادہ خوشگوار نہ تھا۔ ہلکی ہلکی گرمی محسوس ہو رہی تھی۔

عمر دو دن ایبٹ آباد میں رہا مگر ثناء سے بات کرنے کا کوئی موقع نہ مل سکا۔ پھر وہ لوگ واپس مری روانہ ہو گئے اور ساتھ ہی عمر بھی۔ مری کا موسم ہمیشہ کی طرح خوشگوار تھا۔ عمر نے ان کی رہائش گاہ دیکھی اور پھر ہوٹل چلا آیا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ثناء سے ایک بار تفصیلی بات ہو جائے تو واپس جائے مگر فی الحال اس بات کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ جبکہ عمر کا خیال تھا۔ آج ہر حال میں گھر بھی واپس جانا ہے ورنہ پاپا ناراض ہوں گے۔

وہ بیٹھ کر ملاقات کے منصوبے بنانے لگا۔

دوپہر کے بعد یکایک آسمان بادلوں سے بھر گیا تھا۔ بارش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ چونکہ عمر آج واپس جانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس لیے تیار ہو کر ثناء کی تلاش میں چل پڑا اور اچانک پہاڑوں کے درمیان بنے ہوئے پارک میں ثناء اور سہیل گھڑسواری کرتے ہوئے مل گئے۔ آج تو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ عمر نے سوچا اور جیپ میں سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ وہ دونوں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ باقی گھر والوں کا دور، دور تک پتہ نہ تھا۔ عمر نے سہیل کے گھوڑے کے پاؤں کے قریب کی زمین پر فائر کر دیا۔ عین اسی وقت فضا میں بجلی کی کڑک بھی سنائی دی اور سہیل کا گھوڑا بے قابو ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے پیچھے ہی ثناء کا گھوڑا بھی، مگر عمر جس نے ثناء سے بات کرنے کے لیے یہ رسک لیا تھا۔ اسے کیسے جانے دیتا۔ عمر نے بھاگتے ہوئے چھلانگ لگا کر گھوڑے کی لگام تھام لی۔

’’تم......‘‘ ثناء نے نفرت سے اسے دیکھا۔

’’ہاں میں، اب نیچے آؤ۔‘‘ عمر نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’تو یہ حرکت تمہاری تھی۔‘‘ ثناء دانت پیستے ہوئے بولی۔

’’اس میں کیا شک ہے۔‘‘ عمر نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا۔

’’گویا تم شروع ہی سے ہمارے تعاقب میں تھے۔‘‘ ثناء نے غصے سے اس کو گھورتے ہوئے کہا۔

’’یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ موسم کو دیکھو بارش ہونے والی ہے اور ہمیں بارش سے پہلے پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہیے ورنہ بہت مشکل ہو گی۔‘‘ عمر نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

’’مشکل ہو یا آسانی میں تمہارے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی بلکہ سہیل کی تلاش میں جاؤں گی۔‘‘

’’پاگل پن کا مظاہرہ مت کرو تم سہیل کے پیچھے نہیں جاؤ گی۔ وہ مرد ہے خود ہی آ جائے گا۔‘‘

’’مگر اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی اور بہت عرصہ چپ رہنے کے بعد تم نے یہ حرکت کی ہے۔ اس کی سزا تمہیں ضرور ملے گی۔‘‘ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

’’دیکھو، میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں‘‘ عمر کی بات ادھوری رہ گئی۔ ایک بار پھر بجلی زور سے کڑکی اور ساتھ ہی بارش شروع ہو گئی۔ عمر کو غصہ تو شدید قسم کا آیا مگر فی الحال وہ اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ضبط کرتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ’’احمق لڑکی! تمہاری حماقت کی وجہ سے آخر بارش شروع ہو ہی گئی۔‘‘

’’ہو جائے مجھے پرواہ نہیں۔‘‘ ثناء نے کہا اور گھوڑے سے اتر آئی۔

’’اب جاؤ سہیل کی تلاش میں مَیں تو چلا۔‘‘ عمر نے قدم آگے بڑھایا تو ثناء اسے گھورنے لگی۔

’’تمہارا کیا خیال ہے میں اکیلی نہیں جا سکتی۔‘‘ اس نے بظاہر غصے سے کہا مگر لہجہ کمزور سا تھا۔

’’شوق سے جاؤ، میں نے کب کہا تم اکیلی نہیں جا سکتیں۔ تم اگر خاندان کے ساتھ آ کر صرف ایک لڑکے کے ساتھ یوں گھوم پھر سکتی ہو تو اکیلی گھر بھی جا سکتی ہو۔‘‘ عمر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

’’وہ میرا کزن ہے سمجھے۔‘‘ ثناء نے چیخ کر کہا۔

''اچھا تو میں کون ہوں؟'' عمر نے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ بارش تیز ہو رہی تھی مگر اب عمر کو اس کی پرواہ نہیں تھی وہ یہیں ساری بات کر لینا چاہتا تھا۔

''جہنم میں جاؤ تم۔'' ثناء جھلا کر بولی۔ تیز بارش کی وجہ سے وہ پوری کی پوری بھیگ گئی تھی۔

''ویسے تم اگر چاہو تو میں چند باتیں تم سے یہیں کر لوں۔'' عمر نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

''وہاٹ۔'' ثناء نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے تم چاہو تو اب بھی میرے ساتھ چل سکتی ہو۔'' عمر نے اسے چڑانے والے انداز میں کہا۔ ثناء نے آس پاس دیکھا۔ گہری تاریکی اور تیز بارش کی وجہ سے دو گز کے فاصلے پر بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''چلو۔'' ثناء نے گویا ہار مان لی اور عمر کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ ایسے میں اس نے تین چار بار ٹھوکر بھی کھائی مگر عمر نے سہارا دینا تو دور کی بات پلٹ کر اسے ایک نظر دیکھا بھی نہیں۔

''تم گدھے ہو۔'' ثناء بمشکل چلتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

عمر نے پلٹ کر اسے دیکھا اور طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''اگر یہ خطاب اس وجہ سے دیا گیا کہ میں نے تمہارا ہاتھ نہیں تھاما تو...... تو میں...... یعنی میں کیپٹن عمر فاروق غیر محرم عورت کو ہاتھ نہیں لگاتا۔''

''تو گویا ابھی سے کوئی اپنی محرم عورت بھی رکھ چکے ہو۔'' ثناء نے طنز کیا۔

عمر نے مسکرا کر اسے دیکھا اور سنجیدگی سے کہا۔ ''خیر خیر ابھی رکھی تو نہیں مگر رکھنے کی سوچ رہا ہوں۔ تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟''

''کس سلسلے میں؟'' ثناء نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

''میری بیوی بننے کے سلسلے میں اگر تم سہیل کا خیال دل سے نکال کر ایمان داری سے ہاں کرتی ہو تو میں تمہارا ہاتھ تھام لیتا ہوں۔'' عمر کے لہجے میں شرارت تھی۔

''او شٹ اپ۔'' ثناء غصے سے دھاڑی۔

''تم ذرا سوچو تو سہی۔'' عمر نے کہنا چاہا۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' ثناء نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

''اگر تم ہاں کرتی ہو تو سید حامی کے پاس لے چلتا ہوں بصورت دیگر......''

''میں پوچھتی ہوں اس وقت ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' ثناء غرائی۔ عمر کے دل میں آیا ایک الٹا ہاتھ رسید کرے مگر فی الحال اسے ضبط کرنا تھا۔ خشک لہجے میں بولا۔

''معلوم نہیں، یونہی جا رہا ہوں تاہم جیسے ہی کوئی گھر نظر آیا پناہ کے لیے۔ اندر چلے جائیں گے۔'' پھر عمر نے ایک مقامی باشندے کے گھر پناہ لی۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جو اس نے ان لوگوں کو دیا۔ شاید گھر میں دو ہی کمرے تھے۔

''بابا! چائے مل سکتی ہے؟'' عمر نے سردی سے لرزتی کانپتی ثناء کو دیکھ کر پوچھا۔

''ابھی لاتا ہوں بیٹا۔'' بابا چلا گیا تو ثناء غصے سے بولی۔

''نان سنس۔ تمہیں اس سے یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ مجھے کپڑے مل سکتے ہیں۔''

''کیوں؟'' عمر نے بوٹوں کے تسمے کھولتے ہوئے پوچھا۔

''ایڈیٹ تمہیں دکھتا نہیں میں ساری بھیگ چکی ہوں۔'' پہلی بار غور سے عمر نے اسے دیکھا۔ اگرچہ بھیگ تو وہ خود بھی گیا تھا۔ مگر چونکہ فوجی آدمی تھا اس لیے کچھ زیادہ اثر نہ لیا مگر وہ تو عورت تھی اور اس وقت سردی سے کانپ رہی تھی۔ عمر کے دل میں صرف ترس آیا اور کوئی جذبہ نہ جاگا۔

''اچھی بات ہے۔'' وہ طویل سانس لے کر بولا۔ ''اب بابا آئے گا تو کپڑوں کی درخواست پیش کروں گا۔'' ثناء نے کچھ نہ کہا۔

جلد ہی بابا چائے لے کر آ گیا تو اس سے عمر نے اپنا مدعا بیان کیا۔ بابا بجائے کچھ کہنے کے ثناء کو اپنے ساتھ لے گیا اور عمر چائے پیتے ہوئے سوچنے لگا۔ بات کا آغاز کس طرح سے کیا جائے کہ یہ پتھر موم ہو جائے اور آنٹی کی خواہش پوری ہو جائے۔ اسی دوران میں بابا آتش دان میں لکڑیاں ڈال کر چلا گیا اور کچھ دیر بعد ہی ثناء بھی واپس آ گئی۔ مقامی عورتوں کے لباس میں وہ بھی مقامی ہی نظر آ رہی تھی۔ عمر اسے دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔ ثناء کچھ دیر تو برداشت کرتی رہی پھر پوچھ بیٹھی۔

''اچھا نہیں لگ رہا؟''

''بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' عمر نے دل سے تعریف کی۔

"ہنہ......" ثناء نے یوں منہ بنایا گویا کوئی کڑوی چیز منہ میں گھل گئی ہو اور پھر چائے پینے لگی۔ چائے پیتے پیتے اچانک چونک کر بولی۔

"ہائے اللہ پتہ نہیں سہیل کس حال میں ہوگا۔" عمر نے بھی یوں منہ بنایا جیسے کوئی کڑوی چیز نگل لی ہو۔ پھر خالی کپ پرچ میں رکھتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

"میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتا ہوں۔ وہ مرد ہے جہاں بھی ہوگا ٹھیک ہی ہوگا۔"

ثناء نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ چائے پیتی رہی عمر کچھ دیر اسے دیکھتا رہا پھر دونوں بازو سر کے نیچے رکھ کے لیٹتے ہوئے بولا۔

"دیکھو میں تم سے...... دراصل میں تم سے ایک بہت ضروری بات کہنا چاہتا ہوں، اب تو خیر سے باہر موسم بھی میری بات کے موافق ہوگیا ہے اور مجھے اب یہ بات تم سے کہہ دینی چاہیے کیونکہ اس بات کو کہنے کے لیے میں تمہارے پیچھے ایبٹ آباد تک گیا۔"

"تو گویا میرا اندازہ درست ہی تھا۔" ثناء نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔

"تم ٹھیک سمجھی ہو۔ مگر کیا تم یہ نہیں پوچھو گی، وہ ایسی اہم بات کیا ہے؟"

ثناء نے ایک نظر عمر کو دیکھا۔ پتہ نہیں کس موڈ میں تھی بولی۔ "سن رہی ہوں۔"

"دیکھو میں۔" عمر کچھ دیر رک کر اس کے سپاٹ چہرے کو دیکھتا رہا۔ "میں یعنی عمر فاروق تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" عمر نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سارے لفظ ادا کیے۔

"ہنہ شادی اور مجھ سے۔" ثناء کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا۔ "وجہ بتانا پسند کرو گے؟"

"وجہ تو بہت سادہ سی ہے۔ مجھے نہیں معلوم لوگ اظہار کس طرح کرتے ہیں۔ فوجی آدمی ہوں گھما پھرا کر بات کرنے کی بجائے میرا مطلب ہے تعریف اور تمہید میں بہت سارے لفظ ضائع کرنے کی بجائے مختصراً یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے تم سے محبت ہے میرا مطلب ہے تم مجھے پسند ہو اور اسی پسند اور محبت کی وجہ سے میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ رکا، کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر طویل سانس لے کر بولا۔ "دیکھو میں کوئی فارغ آدمی تو ہوں نہیں کہ پہلے چند سال تم سے محبت کا ڈرامہ کرتا پھر منگنی اور پھر شادی۔ یہ سب فضول چیزیں ہیں۔ چونکہ مجھے تم سے شادی ہی کرنا تھی۔ اس لیے میں نے ساری بات ایک ہی وقت میں......"

"مگر میں تم سے شادی نہیں کروں گی۔" ثناء نے غصے سے عمر کی بات کاٹ کر کہا۔

"کیوں نہیں کرو گی، آخر کوئی وجہ بھی تو ہو کیا مجھ میں کسی بات کی کمی ہے؟" عمر نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"خوبی کیا ہے ذرا میں بھی تو سنوں؟" ثناء کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ "مجھ سے شادی کا خواب دیکھتے وقت تم اپنی اوقات بھول گئے ہو، ہنہ...... صرف کیپٹن۔"

"دیکھو منہ سنبھال کر بات کرنا۔ میں تمہاری فضول بکواس نہیں سنوں گا۔ سمجھیں؟" عمر نے کچھ سخت لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے میں اس وقت تمہارے رحم و کرم پر ہوں۔ مگر میں تم سے نفرت کرتی ہوں۔ شادی تو دور کی بات ہے۔ مجھے تو تمہاری طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں۔ یوں بھی میری شادی میری ممی کی پسند سے ہوگی۔" ثناء نے بے خوف لہجے میں کہا۔

عمر نے بغور اسے دیکھا اور بولا۔ "نفرت کی وجہ...... شاید یہ وہ نفرت ہے جو تمہاری ممی اپنی سسرال والوں سے کرتی رہی ہیں اور تمہارے دل میں بھی بھرتی رہی ہیں۔"

"تم کچھ بھی کہو میری ممی جو کچھ بھی کہتی ہیں اور جو کچھ بھی کرتی ہیں وہ سب صحیح ہوتا ہے۔"

"مگر یہ بھی تو دیکھو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔" عمر ایک بار پھر نرم پڑ گیا۔ ورنہ جی تو چاہ رہا تھا دو چار ہاتھ لگائے اور یہیں چھوڑ کر چلتا بنے۔ مگر پھر وہی آنٹی کی خواہش۔

ثناء نے خود پر ایک نظر ڈالی اور غرور سے بولی۔ "میں تو اس قابل ہوں کہ تم تو کیا ساری دنیا مجھ سے پیار کرے۔ ساری دنیا کی تو خیر مجھے پرواہ نہیں مگر تم مجھ سے محبت کرو۔ اس کو میں اپنی توہین تصور کروں گی۔" ثناء غصے سے نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی کہ عمر جلدی سے بول پڑا۔

"سنو، ابھی سے کوئی فیصلہ مت کرو، یہ فیصلے لمحوں کے فیصلے نہیں ہوتے۔ میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں۔ خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا میری باتوں پر غور کرنا اور شکل بھی کوئی ایسی بری نہیں۔" عمر نے بڑے ضبط سے کہا۔ ورنہ اس کا جی تو چاہا تھا کہہ دے اتنا غرور مت کرو۔ تمہیں اگر میری طرف دیکھنا پسند نہیں تو میں تو تم پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ باقی رہی محبت یا شادی تو یہاں کون کافر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے یہ تو اس

ہستی کی خواہش ہے جس کو میں نے ماں سے بھی زیادہ درجہ دے رکھا ہے۔ ورنہ میں تمہاری طرف دیکھتا۔ یہ تو ایک انہونی ہوتی۔

"مجھے سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟" ثناء نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ آرمی کٹ اسٹائل میں اس کا بھرا ہوا چہرہ بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ مگر ثناء کو اس سے کیا دلچسپی تھی۔ اسے تو ہپیوں کی طرح لمبے بال رکھنے والا سہیل پسند تھا۔ اسی لیے بگڑ کر بولی۔ "میرا جو فیصلہ آج ہے وہی کل بھی رہے گا۔ تم کسی غلط فہمی میں مت رہنا۔ میں تمہارا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"اچھی بات ہے۔" عمر نے طویل سانس لے کر اسے دیکھا۔ "تمہارے اس انکار کے باوجود میں تمہاری ہاں کا منتظر رہوں گا۔ ہو سکتا ہے تمہاری یہ ناں کبھی ہاں میں بدل جائے۔ کیا خیال ہے؟"

"فضول ہے، یہ سب تسلیاں وقت ضائع کرنے کے مترادف ہوں گی۔" ثناء نے خشک لہجے میں کہا اور منہ پھیر لیا۔

اتنے میں بابا کھانا لے کر آ گیا۔ ثناء نے فوراً ایک نظر کھانے کو دیکھا اور ناک منہ چڑھاتے ہوئے بولی۔

"میں ایک دن بھوکی رہ سکتی ہوں مگر یہ جانوروں والا کھانا نہیں کھا سکتی۔"

"نہیں کھانا چاہتیں تو مت کھاؤ مگر اپنی بکواس بھی بند رکھو۔" عمر نے سخت لہجے میں کہا پھر بابا سے مخاطب ہوا۔ "بابا! بارش رکنے کا کوئی امکان ہے کہ نہیں؟"

"ابھی تو کچھ پتہ نہیں۔" بابا نے آہستہ سے کہا پھر ثناء کو دیکھا۔ "بیٹی لگتا ہے تمہیں یہ کھانا پسند نہیں آیا مگر غریب کے پاس جو تھا وہ حاضر کر دیا۔"

"بابا! کھانا بہت اچھا ہے۔" عمر نے کہا تو بابا باہر چلا گیا۔ بابا کے جانے کے بعد عمر نے گھور کر ثناء کو دیکھا۔ "ویسے تو تمہاری عقل شریف کے بارے میں کچھ کہنا فضول ہی ہے۔ کیونکہ جن لوگوں نے تمہاری تربیت اور پرورش کی ہے وہ اس عظیم نعمت سے محروم تھے۔ لیکن ماموں جان کی محبت کا تو کچھ اثر ہونا ہی چاہیے تھا مگر افسوس......"

"اوہ یو شٹ اپ۔" ثناء نے آنکھیں نکال کر عمر کو دیکھا مگر وہ اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کھانے پر جھک چکا تھا۔

شام ہوتے ہوتے بارش تو رک گئی تھی مگر ماحول پر اب بھی گہری رات کا سا سکوت طاری تھا۔ عمر ثناء کے کہنے پر اس کو لے کر چل دیا۔ جیسے تیسے ان کے کاٹیج پہنچا تو سب لوگ پریشان بیٹھے تھے۔ ثناء کو دیکھتے ہی سب اس کی خیریت پوچھنے لگے مگر عمر پر کسی نے کوئی توجہ نہ دی تو وہ واپسی کے لیے مڑا مگر رک کر اونچی آواز میں بولا۔

"دیکھو میں نے جو بات کہی تھی اس پر غور کرنا۔" پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔

رات تین بجے جب وہ گھر پہنچا تو پھر شدید قسم کی بارش شروع ہو چکی تھی۔ جیپ لاک کر کے وہ جیسے ہی برآمدے میں پہنچا۔ صباء لائٹ آن کرتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کچھ دیر اس کا جائزہ لیتی رہی پھر ڈانٹ بھرے لہجے میں بولی۔ "یہ وقت ہے گھر آنے کا اور پھر ایسے خوفناک موسم میں آئے ہو۔ عمر تمہیں کچھ خیال نہ آیا۔ یہاں کے چکر اور بل کھاتی ہوئی سڑکوں کا جہاں اتنے دن رہے تھے۔ وہاں ایک رات اور رک جاتے۔ ایسے موسم میں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اپنی جان کا نہیں تو کم از کم میرا ہی سوچ لیا کرو۔"

"ارے آنٹی جان! آپ نے تو پورا لیکچر ہی دے دیا۔ اتنی جلدی آپ بھول گئیں میں نے کہا تو تھا کہ آپ ہی کے کام سے جا رہا ہوں اس کے باوجود آپ ناراض ہیں۔"

"کون سا میرا کام، آخر مجھے بھی تو پتہ چلے؟" صباء نے اسی لہجے میں کہا۔

"وہ آنٹی جانی! دراصل کام ابھی ہوا نہیں اور اب تو مجھے امید بھی نہیں کہ ہو گا مگر پھر بھی کہتے ہیں۔ مایوسی گناہ ہے، ہے نا؟" عمر نے سر ہلاتے ہوئے اپنی بات کی تائید چاہی۔

"اپنی بکواس کرتے رہو گے کچھ بتاؤ گے نہیں کہ وہ کمبخت کام کیا ہے؟" صباء نے غصے سے کہا۔

"آنٹی جان! مجھے بہت سردی لگ رہی ہے باقی بات اندر چل کر کی جائے گی۔" عمر نے چالاکی سے بات بدل دی۔

"ہاں، ہاں، چلو چلو تم اندر چلو میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" صباء نے جلدی سے کہا۔

"نہیں آنٹی جان! آپ کو چائے بنانے کی ضرورت نہیں، چائے اس تھرماس میں ہے۔" اس نے سینے سے لگا تھرماس صباء کے حوالے کیا اور اسی کے کمرے میں بھاگتے ہوئے آیا اور بیڈ پر بیٹھ کر سارا کمبل جسم پر لپیٹ لیا۔ صباء نے تھرماس سے چائے نکال کر

اسے دی اور وہ آہستہ آہستہ پینے لگا۔

"اب بتاؤ وہ کیا کام تھا جس کے لیے تم سرگرداں رہے؟" صباء کہاں بھولنے والی تھی۔

"آنٹی جان! بتایا تو ہے۔ ابھی وہ کام ہوا نہیں۔ جب ہوگا تو آپ کو بھی بتا دوں گا۔"

"اچھی بات ہے اگر تم نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ تمہیں اگر یونہی آوارگی کرنی ہے تو مجھے یہاں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بھی لاہور چلی جاؤں گی۔" صباء نے گویا دھمکی دی۔

"ارے نہیں نہیں آنٹی! یہ ظلم مت کیجیے گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں اب کبھی رات کو گھر سے باہر نہیں رہوں گا۔ اب تو آپ خوش ہو جائیں۔" عمر نے لاڈ سے کہا۔

"ہاں بیٹا، اب تو میں خوش ہوں۔ دراصل اس دنیا میں اب تو تُو ہی میری خوشیوں کا مرکز ہے۔ اچھا اب صبح ہونے والی ہے۔ جاؤ کچھ دیر آرام کر لو۔" صباء نے کہا اور عمر شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

بوٹ اتارتے ہوئے وہ ثناء کے بارے میں سوچنے لگا۔ ظاہر ہے اس نے جو کچھ کہا تھا وہ کر کے بھی دکھائے گی۔ خیر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ تاہم یہ طے ہے کہ تمہیں ہاں کرنا پڑے گی۔ مس رضوان، میں اب اس وقت تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ جب تک تم ہاں نہیں کرو گی۔ تمہیں ہاں کرنا ہوگی۔ میں تمہیں اس کے لیے مجبور کر دوں گا۔ اس نے پُرعزم حوصلے کے ساتھ سوچا اور مطمئن ہو گیا۔

صبح ابھی صباء ناشتے سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ پروین بولی۔ "صباء! جلدی سے تیار ہو جاؤ، کہتے ہیں مری کا موسم بہت خوبصورت ہو رہا ہے میں اور کرنل صاحب جا رہے ہیں تم بھی چلو۔"

"نہیں پروین! میرا دل نہیں چاہ رہا تم لوگ چلے جاؤ۔" صباء نے آہستہ سے کہا۔

"کیوں بھئی، یہ آپ کے دل کو کیا ہو جاتا ہے۔ جب بھی کوئی کام کی بات ہو یہ بیچ میں روڑا بن جاتا ہے۔" کرنل نے مسکرا کر کہا تو صباء بھی ہنس دی۔

"شاباش! اسی طرح ہنستے ہوئے اب جلدی سے تیار بھی ہو جاؤ کیونکہ ہم آپ کو چھوڑ کر جانے والے ہرگز نہیں۔" کرنل نے کچھ ایسے خلوص سے کہا کہ صباء تیار ہونے چل دی۔

تیار ہو کر باہر آئی تو عمر بھی کھڑا تھا۔

"ارے آنٹی جان! آپ بھی جا رہی ہیں؟" اس نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا تو صباء نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ "پاپا اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟" عمر نے پوچھا۔

"رات کو کہاں سے آئے تھے؟" کرنل نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"مری سے۔" عمر نے معصومیت سے بتایا۔

"بس تو پھر صاحبزادے ڈیوٹی اٹینڈ کرو۔" کرنل نے کہا اور صباء، پروین کے ساتھ جیپ کی جانب بڑھ گئے۔

چونکہ عمر صباء سے وعدہ کر چکا تھا کہ وہ رات گھر سے باہر نہیں رہے گا اس لیے دن میں جب بھی وقت ملتا وہ ثناء کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا۔ مگر یہ محض اتفاق ہی تھا کہ ثناء سے جب بھی ملاقات ہوتی، ساتھ سہیل ہی نہیں باقی سب لوگ بھی موجود ہوتے جن میں عمر کوشش کے باوجود کوئی بات تو کر نہیں سکتا تھا۔ تاہم ڈھیٹ بن کر اتنا ضرور پوچھ لیتا کہ ہاں بھئی کیا فیصلہ کیا ہے پھر تم نے؟" جواباً ثناء گھور کے دیکھتی اور وہ ہنستے ہوئے آگے بڑھ جاتا۔

تین ماہ اتنی جلدی گزر گئے کہ صباء کو احساس تک نہ ہوا۔ محسوس تو اس وقت ہوا جب رضوان نے فون کیا۔

"صباء! اب آ جاؤ، تین ماہ کافی ہیں رہنے کے لیے۔" صباء نے جی بہتر کہا اور اگلے ہی روز جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ اگرچہ عمر بہت ناراض ہوا کیونکہ وہ چاہتا تھا۔ صباء اب مستقل ان کے پاس رہے مگر صباء نہیں چاہتی تھی کہ بھائی کی عزت پر کوئی حرف آئے اس لیے بالکل نہ رکی۔

سارا راستہ عمر خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ صباء اس کے بولنے کا انتظار کرتی رہی مگر وہ تو گویا چپ کا روزہ رکھ کر چلا تھا آخر تنگ آ کر صباء نے کہا۔

"عمر! اب تم بچے نہیں، بڑے ہو گئے ہو۔ ضد مت کرو بیٹا میں نہیں رہ سکتی تم میری مجبوری نہیں سمجھ سکتے؟"

"آنٹی! اس خاندان میں صرف میں اکیلا نہ صرف آپ کو سمجھتا ہوں بلکہ آپ کی مجبوریوں کو بھی سمجھتا ہوں۔"

"اس کے باوجود تم ضد کر رہے ہو۔" صباء نے ڈانٹا۔

''اس لیے کہ آپ کو اپنا نہیں صرف دوسروں کا خیال رہتا ہے۔'' عمر نے ناراضگی سے کہا۔

''یہ بھی تو ایک مجبوری ہے۔'' صباء نے دکھی لہجے میں کہا۔

''ہو گی مجھے کیا۔ لیجیے آپ کا گھر آ گیا۔'' عمر جیپ روک کر دوسری سمت دیکھنے لگا۔

''تم اندر نہیں آؤ گے؟'' صباء نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' عمر نے ناراضگی سے کہا۔

''اچھے بچے ضد نہیں کرتے۔'' صباء نے اس کی ناک پکڑ کر کہا اور عمر بیگ پکڑ نے اتر آیا۔ صباء کے ساتھ گھر میں داخل ہوا تو سامنے ہی نانی بیٹھیں تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ قریب ہی صوفے پر ثناء بیٹھی تھی اور فوزیہ چاول صاف کر رہی تھی۔ فومی، نومی نظر نہیں آ رہے تھے شاید باہر گئے ہوئے تھے۔

عمر نے سب کو سلام کیا تو نانی پیار کرتے ہوئے پروین کا پوچھنے لگیں۔ ماں کی خیریت بتاتے ہوئے اچانک عمر کی نظر ثناء کی طرف اٹھ گئی۔ وہ اس کو یوں گھور رہی تھی گویا کچا کھا جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

''الٰہی خیر۔'' عمر نے پست آواز میں کہا اور ممانی کو دیکھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر اندر جا رہی تھیں۔ عمر، ثناء کو دیکھ کر مسکرایا، اشارے سے اس کی ہاں کے بارے میں پوچھا۔ جواباً اس نے آنکھیں نکال کر دیکھا تو عمر اٹھ کر صباء کے کمرے میں آیا اور بیگ سے کپڑے نکال کر وارڈ روب میں رکھنے لگا۔ صباء کچھ دیر اسے کام کرتا دیکھتی رہی پھر بولی۔

''چھوڑ دو عمر! یہ سب رہنے دو میں خود کر لوں گی۔'' مگر وہ کام ختم کر کے ہی ہٹا۔

''اچھا آنٹی! اب اجازت؟'' عمر نے جھکتے ہوئے کہا۔

''ہاں بیٹا! اب جاؤ۔'' صباء اسے چھوڑنے باہر آئی تو خلاف معمول فوزیہ بولی۔

''اتنی جلدی جا رہے ہو کم از کم اپنے ماموں سے تو مل کر جاتے۔ وہ بس آنے ہی والے ہیں۔ اور پھر اتنی دور سے آئے ہو سفر کی تھکن ہو گی، چائے تو پیتے جاؤ۔ چلو ثناء تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو بھائی کے لیے چائے بنا کر لاؤ۔''

عمر نے حیران ہو کر صباء کو دیکھا مگر وہ تو عمر سے بھی زیادہ حیران تھی۔

''شکریہ ممانی! میں ذرا جلدی میں ہوں۔ ماموں کو میرا سلام کہیے گا۔ باقی رہی چائے

تو وہ پھر کبھی پی لوں گا۔'' وہ جانے کے لیے مڑا تو ثناء اس کے راستے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

''میں آپ کو چائے پیئے بغیر ہرگز نہیں جانے دوں گی۔'' ثناء نے اتراتے ہوئے کہا۔

''گویا ہاں کا پروگرام بن گیا؟'' عمر نے شوخی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے آہستہ سے مسکرا کر پوچھا۔ کیونکہ فوزیہ تھوڑی دور تھی اور نانی جان پھر سے تسبیح پڑھنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔ البتہ صباء ان کے پیچھے تھی مگر عمر نے بات اس قدر مدھم لہجے میں کی تھی کہ اسے صرف ثناء ہی سن سکی تھی۔

''تم رکو تو سہی، ہاں بھی ہو جائے گی بلکہ ساتھ میں تمہاری خاطر مدارات بھی ہو جائے گی۔'' ثناء نے بھی اسی لہجے میں کہا۔ صباء ان کی باتیں تو نہیں سن رہی تھی۔ تاہم ان دونوں کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ اس کو صاف نظر آ رہی تھی۔ ان دونوں کی جوڑی صباء کو بہت پیاری لگ رہی تھی۔ ثناء کا رویہ دیکھ کر تو وہ بہت خوش ہو گئی تھی اور یہ سوچ کر کہ کہیں عمر پھر انکار نہ کر دے جلدی سے بولی۔

''اب تو رک جاؤ بیٹا دیکھو تو سنی کتنے پیار سے کہہ رہی ہے۔''

''جی بہتر.....'' عمر حیران ہوتے ہوئے بیٹھ گیا۔ نانی اماں نماز کے لیے اٹھ گئی تھیں۔ جبکہ فوزیہ بیٹھی رہی اور عمر سوچ رہا تھا۔ ''شاید ثناء بدل گئی ہے اور اس کے ساتھ فوزیہ بھی۔ شاید ثناء نے فیصلہ اس کے حق میں دے دیا ہے۔ اگر یہی بات ہے تو وہ سوچ رہا تھا یہ فیصلہ اک تاریخی فیصلے سے بھی زیادہ اہم فیصلہ ہو گا۔ مگر یہ سب ہوا کیسے کہیں کوئی اور معاملہ نہ ہو۔ وہ انہی سوچوں میں غرق تھا کہ ثناء مسکراتی ہوئی چائے لے کر آ گئی۔ صرف چائے ہی تھی ساتھ کھانے کو اور کچھ بھی نہ تھا۔ ثناء نے چائے کا کپ اسے دیا اور خواہ مخواہ ہنس پڑی۔ عمر نے اب کے اس کے ہنسنے کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ خاموشی سے کپ منہ سے لگا لیا۔

ابھی وہ چائے پی ہی رہا تھا کہ باہر گاڑیاں رکنے کی آواز آئی۔ عمر حیران ہوا لیکن کچھ سمجھ نہ سکا اور پھر سب سے پہلے اندر داخل ہونے والے رضوان ماموں تھے اور پیچھے تو گویا ایک قافلہ تھا۔ ثناء کے ماموں، ممانی، نانی اماں اور سہیل بھی چلے آ رہے تھے۔ عمر نے چائے والا کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے سوچا۔ ''یار عمر برے پھنسے۔ یہاں تو کوئی گڑ بڑ ہے جب ہی تو ثناء نے چائے کا ایک کپ بنانے میں ایک گھنٹہ لگایا ہے گویا چائے نہ ہوئی قورمہ کی دیگ

ہوگئی۔ مجھے رکنا نہیں چاہیے تھا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔'' اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر اپنے قریب کھڑی ثناء کو دیکھا اور حیرت سے بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ مسکراہٹ کی بجائے وہ ہونٹ بھینچے کھڑی تھی۔ آنکھوں میں کچھ دیر پہلے کے چھلکتے ہوئے پیار نے نفرت کی جگہ لے لی تھی۔ وہ مسلسل عمر کو گھورے جا رہی تھی۔ عمر کو بھاگنے کا کوئی راستہ نہ سوجھا تو سر پر ہاتھ پھیر کے رہ گیا۔ اتنے میں رضوان ماموں اس کے قریب پہنچ چکے تھے۔ عمر نے فوراً اٹھ کر مؤدبانہ انداز میں انہیں سلام کیا۔ جس کا جواب دیتے ہوئے وہ بولے۔

''کیوں بھئی، یہ سب کیا سنا ہے میں نے؟''

''جی ماموں جان میں سمجھا نہیں۔'' عمر نے سادگی سے پوچھا۔ ویسے اس کی چھٹی حس چیخ چیخ کر اسے بتا رہی تھی کہ اصل بات کیا ہو سکتی ہے۔

''یہ کیا حرکت کی ہے تم نے؟'' رضوان اسی لہجے میں بولے۔

''کون سی حرکت کچھ پتہ بھی تو چلے۔ آپ تو پہیلیاں بجھوا رہے ہیں۔'' عمر نے سنبھل کر کہا۔

''عمر! تم نے اس ٹور میں ثناء کو بہت تنگ کیا ہے کیا یہ سچ ہے۔ وہ جہاں بھی جاتی تھی تم تعاقب کرتے ہوئے پیچھے پہنچ جاتے تھے۔ کیا یہ سب درست ہے؟''

''ماموں جان! اگر یہ سب آپ کہہ رہے ہیں تو درست ہی ہوگا۔'' عمر نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''تو اس کا مطلب ہے تم سچ مچ اتنے بے ہودہ ہو گئے ہو۔ میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟'' رضوان غصے سے بولے۔

''ارے یہ کیا بتائے گا اور یہ کیا بولے گا؟ اس نے کوئی ایسا ویسا تنگ کیا ہے سی کو۔ ارے اس کو تو کسی کی شرم تھی نہ لحاظ۔ اگر باتیں کر لیتا تو اور بات تھی مگر یہ تو کبھی اس کا دوپٹہ کھینچتا۔ کبھی چوٹی کھینچتا اور حد تو یہ ہے کہ یہ ثناء کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا اور پھر جانتے ہو رضوان میاں رات کو چھوڑنے آیا۔ ہم جہاں بھی جاتے یہ جن بھوت کی اولاد بن کر وہیں پہنچ جاتا۔ پھر سیٹیاں بجا بجا کر فلمی گانے گا گا کر ہماری طرف دیکھا کرتا۔ میں نے ہزار بار منع کیا۔ لڑکے! ایسی چھچھوری حرکتیں مت کر، مگر یہ کہاں باز آنے والا تھا۔'' ثناء کی نانی نے جھوٹ بولنے میں گویا نیا ریکارڈ قائم کیا۔ عمر نے دانت پیس کر اس مکار بڑھیا کو

دیکھا اور پھر ایک نظر ثناء کے شولڈر کٹ بالوں پر ڈالی جو چوٹی تو ہرگز نہیں بن سکتے تھے اور فلمی گیتوں سے تو خود عمر کو شدید نفرت تھی۔ مگر اس وقت وہ کسی بات کی تردید نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر کرتا بھی تو رضوان ماموں یقین نہ کرتے۔ اب جبکہ ثناء کی نانی کی باتوں نے جلتی پر تیل ڈالا تھا رضوان کو اور بھی شدید غصہ آیا۔

''عمر! میں تمہیں اتنا ذلیل ہرگز نہیں سمجھتا تھا۔ تم نے خود اپنی ہی نہیں اپنے پیشے کی بھی توہین کی ہے۔ میں تمہیں اس خاندان کا سب سے ذہین اور لائق بچہ سمجھتا تھا مگر تم۔'' رضوان غصے سے غرائے یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی عمر کی پٹائی کر دیں گے۔ صباء نے یہ سب دیکھا اور سنا تو بہت دکھ ہوا۔ اسے عمر پر بے انتہا ترس اور پیار آیا۔ وہ اتنے لوگوں کے بیچ میں مجرم کی حیثیت سے کھڑا تھا۔ فوزیہ اور اس کی ماں غصے سے بڑبڑاتی جا رہی تھیں۔ سہیل اور ثناء الگ کھسر پھسر کر رہے تھے اور اس کا ماموں، ممانی الگ عمر کو گھورے جا رہے تھے۔ اور عمر چپ چاپ سر جھکا کر کھڑا تھا۔ نہ کوئی وضاحت، نہ کوئی تردید، وہ تڑپ کر آگے بڑھیں۔

''بھائی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آپ کچھ پوچھ تو لیں مجھ سے بھی۔''

''کیا پوچھ لوں تم سے۔'' رضوان اسی غصے میں صباء کی طرف پلٹ پڑے۔ اس وقت ان کو جو شرمندگی ہو رہی تھی اس کو وہی سمجھ سکتے تھے۔ وہ تو بڑے فخر سے ان سب لوگوں سے کہا کرتے تھے۔'' میرا بھانجا کیپٹن عمر فاروق بہت لائق اور ذہین بچہ ہے۔ سارے خاندان میں عمر جیسا کوئی اور بچہ نہ ہوگا۔'' مگر اس وقت ان کا لہجہ سن کر صباء کانپ گئی۔ تاہم اسے کچھ نہ کچھ کہنا تو تھا ہی۔

''بھائی جان! عمر کو میں نے ہی.....'' صباء پتہ نہیں کیا کہنا چاہتی تھی کہ عمر تڑپ کر ان کی طرف پلٹا۔

''نہیں آنٹی جان! پلیز آپ کوئی وضاحت، کوئی تردید نہ کریں گی۔ اگر آپ نے ایسا کیا تو مجھے آپ کے مقدس وجود کی قسم میں جان دے دوں گا۔ خدا نے بندے کو سوچنے سمجھنے کے لیے دماغ دیا ہے۔ جب وہ خود کچھ نہیں سمجھ سکتا تو سمجھانے کی کیا ضرورت ہے۔'' عمر کا لہجہ بہت سرد تھا۔ صباء کچھ دیر شش و پنج میں کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ بے شک اس نے عمر کو جنم نہیں دیا تھا۔ مگر وہ بیٹوں سے بڑھ کر اسے

سمجھتی تھی۔مگر اس وقت اسی بیٹے کو مجرم کے روپ میں کیسے دیکھتی؟ سو وہ اپنے کمرے میں آ گئی مگر کمرے میں بیٹھی بھی وہ فوزیہ کی تیز آواز سن رہی تھی۔

"ارے ابھی تو ہم منہ نہیں لگاتے ان لوگوں کو تب یہ جرأت اور حوصلے ہیں۔ بے غیرتی کی انتہا ہے۔ کمبخت دیکھو تو چہرے سے کتنا معصوم بنتا ہے۔ دیکھ لو جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا۔ رضوان! آپ کو کبھی میری باتوں پر یقین نہیں آیا۔ میں تو شروع دن سے ہی اس کے خلاف تھی۔ اسی لیے تو آپ سے کہا کرتی تھی کہ اس کا ہمارے یہاں آنا اور رہنا ٹھیک نہیں۔ مگر آپ کب سنتے تھے میری۔ اگر تب میری بات مان لی ہوتی تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ آپ کو تو ہر ایرے غیرے سے ہمدردی ہے آپ کے بس میں ہو تو......"

"تم چپ رہو۔" رضوان جو صباء کے جانے سے پریشان ہو گئے تھے بگڑ کر فوزیہ پر ہی برس پڑے۔

"ماموں جان! اگر کچھ اور کہیں سے کمی رہ گئی ہو تو۔" عمر نے انہیں پھر اپنی طرف متوجہ کیا مگر رضوان چپ رہے گویا منہ پر تالا لگ گیا ہو۔ نہ جانے کیوں صباء کی خاموشی، اداسی دیکھ کر وہ خود بھی اسی کیفیت سے دوچار ہو جاتے تھے۔ اس وقت بھی ان کا ذہن صباء میں الجھا ہوا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہتی تھی اور وہ کیوں چلی گئی۔

عمر نے انہیں چپ اور الجھا دیکھا تو بولا۔

"ماموں جان! ان لوگوں نے آپ سے کہا اور آپ نے یقین کر لیا۔ کیا آپ مجھے نہیں جانتے تھے؟ میں نے کسی کی چوٹی کھینچی ہے یا دوپٹہ، یہ تو خدا بہتر جانتا ہے۔ جب آپ خود نہیں سمجھ سکے تو مجھے صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں، کیا مجھے اس گھر میں دوبارہ آنے کی اجازت ہے یا وہ بھی ختم ہو گئی۔"

"ابھی باقی کچھ رہ گیا ہے جو تم پھر آؤ گے، غیرت تو ان لوگوں کو چھو کر نہیں گزری۔" فوزیہ نے نفرت سے کہا۔

"او۔کے ماموں جان! جیسی آپ کی مرضی۔ آپ کی یہ خاموشی ممانی کے فیصلے کی تائید ہے لیکن کیا میں آخری بار آنٹی سے مل سکتا ہوں؟" عمر نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"ملنا کیا ہے، ساتھ ہی لیتے جاؤ۔" فوزیہ نے طنز کیا۔ رضوان کی خاموشی اسے شہہ دے گئی تھی۔

"فوزیہ! تم اپنی بکواس بند رکھو۔" رضوان نے گھور کر اسے دیکھا اور عمر، صباء کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

عمر، صبا کے کمرے میں داخل ہوا اور دروازے میں ہی کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ صباء بیڈ پر بیٹھی رو رہی تھی۔ عمر کو معلوم تھا بلکہ اچھی طرح یاد تھا۔ جب وہ چھوٹا تھا تو آنٹی کو اکثر روتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ پھر اس نے آنٹی سے عہد لیا تھا کہ وہ کبھی نہیں روئیں گی۔ کیونکہ آنٹی کے رونے سے اسے اذیت ہوتی تھی اور اس کے بعد واقعی آنٹی کبھی نہیں روئی تھیں اور آج اتنا بڑا ہونے کے بعد عمر پہلی بار پھر ان کو روتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ آنٹی کے آنسوؤں نے اس کے اندر ایک آگ سی لگا دی۔

"مس رضوان میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ اپنی آنٹی کے آنسوؤں کی قیمت میں تم سے وصول کروں گا۔ اب میں تمہیں ضرور بتاؤں گا۔ تنگ کیسے کیا جاتا ہے۔' عمر نے سوچا اور بے آواز چلتا ہوا آنٹی کے قریب آ کر مسکرا کر بولا۔

"ارے آنٹی جان! کتنی عجیب اور بری بات ہے۔ آپ رو رہی ہیں۔ اپنے جوان اور فوجی بیٹے کے ہوتے۔"

"عمر......عمر میرے بچے میں جانتی ہوں۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں نے کیوں کی ایسی خواہش جس کی تکمیل کے لیے تمہیں آج اتنی بڑی ذلت کا سامنا کرنا پڑا، مجرم بننا پڑا۔"

"نہیں آنٹی جان! آپ نے غلط کہا ہے کہ یہ آپ کی خواہش تھی۔ یہ خواہش تو میری اپنی بھی تھی۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ اس لیے میں اس کے تعاقب میں گیا مگر اس کی نانی نے جو کچھ بھی کہا وہ سب جھوٹ تھا۔" پھر عمر نے پوری تفصیل سے ان کو سب کچھ بتا دیا۔ وہ چپ ہوا تو صباء کچھ سوچنے لگیں۔

"اب کیا سوچ رہی ہیں آپ؟" عمر نے مسکرا کر پوچھا۔

"تم نے سچ کہا کہ وہ تمہیں اچھی لگتی ہے؟" صباء نے اسے شک سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

عمر نے شرارت سے انہیں دیکھا اور نہایت بے باکی سے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"آپ جس کی چاہے قسم لے لیں۔"

"نہیں قسم کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا خیر اب تم جاؤ تا کہ رات ہونے سے پہلے گھر پہنچ سکو ورنہ میرا خیال تم ہی میں رہے گا۔" صباء نے پیار سے کہا تو عمر ہنس کر بولا۔

"کمال ہے آنٹی! میں اب کوئی بچہ تھوڑی ہوں جو رات کے اندھیرے میں گم ہو جاؤں گا۔ ویسے آپ فکر مت کیجیے میں گھر جاتے ہی فون کروں گا۔" پھر وہ باہر آیا اور رضوان ماموں کو سلام کر کے جیسے ہی آگے بڑھا وہ بول پڑے۔

"سنو بیٹا! صباء سے ملنے تم جب چاہو آ سکتے ہو۔" رضوان جانتے تھے، وہ صباء کو بہت عزیز ہے۔

"شکریہ ماموں جان! وقت آپ کو بتائے گا مجرم میں تھا یا کوئی اور۔" پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

"یہ تم نے کیا حماقت کی رضوان! اس بدتمیز کو پھر یہاں آنے کی اجازت دے دی۔" ثناء کی نانی غصے سے بولی اور رضوان بگڑ کر بولے۔

"یہی سب کچھ تو آپ چاہتی ہیں کہ کوئی ایک آدھ رشتے دار بھی یہاں نہ آنے پائے۔ عمر ایسا بچہ نہیں تھا۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ جو میں بھی آپ لوگوں کی باتوں میں آ گیا۔" پھر وہ خود بھی صباء کے کمرے میں چلے آئے۔ روتی ہوئی صباء کو دیکھا تو دکھ سے بولے۔

"مجھے افسوس ہے صباء! میں نے ان کی باتوں میں آ کر یہ سب کچھ کیا۔ کیا تم اپنے بھائی کو معاف نہیں کرو گی؟"

"ایسی کوئی بات نہیں بھائی جان! لیکن آپ کو کم از کم مجھ سے تو پوچھ لینا چاہیے تھا۔" پھر صباء نے سب کچھ تفصیل سے انہیں بتا دیا اور رضوان کو اور بھی دکھ ہوا مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔

رات دس بجے عمر کا فون آ گیا تھا کہ وہ خیریت سے پہنچ گیا ہے اور صباء مطمئن ہو گئی تھی ورنہ اس کو ڈر تھا پریشان سوچوں میں ڈرائیو کرتے ہوئے وہ کہیں کوئی حادثہ نہ کر بیٹھے۔

جب سے عمر نے صباء سے یہ بات کہی تھی کہ ثناء اسے اچھی لگتی ہے تب سے صباء نے اپنے اندر ایک تبدیلی کی تھی۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا فوزیہ اور ثناء اس کے ساتھ بات کرنا پسند نہیں کرتی تھیں تو صباء خود بھی ان کو مخاطب کرنے کی کوشش نہ کرتی تھی۔ مگر عمر کی وجہ سے وہ دن میں اب کئی بار ثناء سے بات کرنے کی کوشش کرتی تاہم یہ اور بات تھی اس کی یہ کوشش

زیادہ تر ناکام ہی رہتی۔



دسمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ صباء جھولے میں بیٹھی کینو کھا رہی تھی کیونکہ موسم بہت خوشگوار تھا۔ چار دن کی لگا تار بارش کے بعد آج دھوپ خوب چمک رہی تھی۔ یہی وجہ تھی صباء کمرہ چھوڑ کر لان میں آ گئی تھی۔ اچانک اس کی نظر فومی پر پڑی تو اس نے آواز دی۔

"فومی ذرا نمک دانی تو دے جانا۔" وہ خاموشی سے آ کر نمک دانی دے گیا۔ یہ تو ظاہر تھا جب سے لان میں جھولا لگا تھا۔ فوزیہ نے سب بچوں کو لان میں آنے سے روک دیا تھا کہ شاید اس طرح ان کے باپ پر کچھ اثر ہو جو ابھی تک تو ظاہر نہیں ہوا تھا۔ تاہم اس کے باوجود فومی اور نومی آ جاتے تھے۔ ثناء کو البتہ جھولے کا کچھ زیادہ ہی غصہ تھا۔ وہ لان میں قدم رکھنا بھی اپنی توہین سمجھتی تھی۔ یوں بھی وہ ہر چیز میں ماں سے دس قدم آگے تھی۔ خوبصورتی میں، زبان درازی میں، غصے میں، اَنا میں، نفرت میں وہ فوزیہ کو پیچھے چھوڑ گئی تھی حالانکہ وہ کیا اور اس کی عمر کیا۔

دسمبر کی تعطیلات ہونے کی وجہ سے ثناء نے اپنی چند دوستوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ اور ان کے آنے سے گھر میں ایک شور سا مچا ہوا تھا۔ صباء صبح سے کمرے میں ہی بند تھی۔ دوپہر کا کھانا بھی اس نے کمرے میں ہی کھایا۔ کھانے کے بعد وہ باہر دھوپ میں جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ برآمدے میں سے ثناء کی آواز آئی۔

"ہش، پلیز لان میں مت جانا۔" نہ جانے کیوں اس نے یہ بات آہستہ کہی تھی حالانکہ وہ آہستہ بات کرنے کی قائل ہی نہ تھی یوں بھی اسے اس بات کی پرواہ کب تھی کہ صباء سن لے گی۔

"کیوں نہ جاؤں لان میں؟" اس کی دوست نے حیران ہو کر پوچھا۔ "میں تو جاؤں گی دیکھو تو کتنا خوبصورت جھولا لگا ہے۔ ثناء تو تو یہیں بیٹھ کر پڑھتی ہو گی۔"

"ہنہ پڑھتی ہوں میں۔ جس جھولے کی تم بات کر رہی ہو وہ میرا نہیں میری پھپھو کا ہے۔ اگر کبھی کوئی جھولے پر بیٹھ جائے تو ان کی جان جل جاتی ہے۔ وہ گھر میں رہیں یا نہ رہیں میں نے کبھی ان کے جھولے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"مگر تمہاری پھپھو یہاں کیوں رہتی ہیں؟"

''شادی جو نہیں کی۔ خیر سے کنواری پھپھو ہیں۔''

''اچھا، لیکن وہ ہیں کہاں ہمیں بھی دکھاؤ؟'' اس کی دوستوں نے اشتیاق سے کہا۔

''چھوڑو، ان کو دیکھ کر کیا کرو گی، سارا وقت بارہ بجتے رہتے ہیں ان کے چہرے پر آؤ میں تمہیں کچھ اور دکھاؤں، دیکھنے کے لائق اس گھر بہت کچھ ہے۔'' ثناء انہیں لیے آگے بڑھ گئی اور صباء دکھی ہو کر ماضی میں کھو گئی۔ ''دیکھو آفاق، اگر دیکھ سکتے ہو۔ محض تمہاری یاد کے سہارے زندہ ہوں ورنہ یہ باتیں، یہ حالات کیا تم سمجھ سکتے ہو میری اذیت کو تم نے تو اب خط نہ لکھنے کی قسم کھائی ہے۔ میں تم سے یہ کیسے کہتی کہ تمہارے خط میرے لیے زندگی تھے۔ مگر قصور تمہارا کب ہے قصور تو میرا اپنا ہے۔ نہ جانے تم کیسے ہو جیسے میں ہوں ویسے ہی تم ہو گے، یا پھر ہو سکتا ہے تم نے شادی کر لی ہو۔ مگر نہیں مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہوا ہو گا۔ وہ تو محض تم نے دھمکی دی تھی، وہ آفاق کے پرانے خطوط نکال کر پڑھنے لگی۔ پھر آخری خط پڑھ رہی تھی کہ فوزیہ غصے میں بھری ہوئی اندر داخل ہوئی۔

''چارپائیاں توڑنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ سارا دن فارغ بیٹھنا بھلا کہاں کی تک ہے۔''

''کیا بات ہے بھابی؟'' صباء فوراً خط رکھ کر اٹھی۔

''بات کیا ہو گی یہ کپڑے ہیں، تمہیں تو اب کوئی کام نظر ہی نہیں آتا۔ بھائی نے بادشاہ زادی بنا کر رکھ دیا ہے۔ کچھ اور نہیں کر سکتیں تو کم از کم کپڑے ہی استری کر دیا کرو۔ تھک جاتی ہوں۔ سارا دن اس گھر میں کام کرتے کرتے مگر کسی کو میرا خیال نہیں آتا۔''

''آپ نے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا بھابی!'' صباء نے کپڑے لیتے ہوئے کہا۔

''میں ہی کہتی، تمہاری تو جیسے آنکھیں نہیں ہیں۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئیں اور صباء کپڑے پریس کرنے لگی۔

''ثنی..... او ثنی، ذرا بات تو سن!'' صباء کب سے اس کو آوازیں دے رہی تھی اور ثناء یوں برآمدے میں کھڑی کتاب پڑھنے میں محو تھی گویا آس پاس کی کچھ خبر ہی نہ ہو۔''

''ثنی.....'' رضوان نے غصے سے پکارا تو وہ چونک پڑی۔

''جی ڈیڈی! کیا بات ہے؟'' ثناء نے فوراً کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''تمہاری پھپھو کب سے بلا رہی ہیں۔ آواز سنائی نہیں دیتی تمہیں۔'' رضوان نے

غصے سے کہا۔

''سوری ڈیڈی!'' ثناء بادل نخواستہ لان میں آئی کیونکہ صباء اپنے جھولے میں بیٹھی ہی آوازیں دے رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' ثناء نے قریب آ کر بدتمیزی سے پوچھا۔

''ذرا پانی تو پلانا۔'' صباء نے یونہی اسے پاس بلانے اور بات کرنے کے بہانے ڈھونڈ رکھے تھے۔ ثناء جیسے تیسے پانی کا گلاس لائی اور صباء کو پکڑاتے ہوئے دانت پیس کر بولی۔ ''آئندہ مجھے آواز مت دینا۔ میں تمہاری ملازمہ نہیں۔ یوں بھی تم اچھی طرح جانتی ہو میں تم سے بات کرنا پسند نہیں کرتی۔''

''بری بات ہے ثنی، بزرگوں کو ایسے نہیں کہتے۔''

''کیا کہا ہے اس نے؟'' رضوان، بہن کی بات سن کر قریب آ گئے۔

''کچھ نہیں بچی ہے، مجھ سے بھلا کیا کہے گی۔'' صباء نے مسکرا کر اسے دیکھا مگر وہ منہ بناتی ہوئی چلی گئی اور رضوان بہن سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

دن اگرچہ اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہے تھے۔ تبدیلی آئی تھی تو صرف یہ کہ پہلے صباء بالکل فارغ رہتی تھی۔ اب روزانہ آٹھ، نو جوڑے پریس کرنے پڑتے تھے اور مسلسل بیٹھنے سے کمر میں درد رہنے لگا تھا۔ صباء کا جی چاہا فوزیہ سے کہہ دے کہ یہ کام اب ثناء سے لیا کرو وہ اب چھوٹی تو نہیں ہے۔ مگر عمر کی وجہ سے ثناء بھی اسے عزیز ہو گئی تھی پھر وہ ثناء کا کیسے کہتی۔

حسب معمول وہ کپڑے پریس کر کے اٹھی ہی تھی کہ عمر کا فون آ گیا۔ صباء کی آواز سن کر بولا۔

''ہیلو آنٹی جان! کیسی ہیں آپ؟'' اس نے چہکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''ٹھیک ہوں بیٹا۔'' صباء نے کپڑوں کے ڈھیر کو ایک نظر دیکھ کر تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

''ارے کہاں ٹھیک ہیں آپ۔ یہ آپ کی آواز کو کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں یونہی تھکن محسوس کر رہی ہوں۔'' صباء نے وضاحت کی۔

''کیوں کیا کوئی کام کر رہی تھیں؟'' عمر نے فوراً پوچھا۔

''ارے نہیں، کام کیا کروں گی۔'' صباء نے ہنس کر کہا۔ ''تم یہ بتاؤ پروین کیسی ہے

اور انوار بھائی؟"

"وہ بالکل ٹھیک ہیں۔فکر مت کریں۔"

"ارے تم کیسے ہو؟"

"میں آنٹی......" عمر چپ ہو گیا۔

"ہاں ہاں کہو۔" صباء نے جلدی سے کہا۔

"کچھ ٹھیک نہیں ہوں۔" عمر نے لاڈ سے کہا۔

"کیوں خدا خیر کرے تم کیوں ٹھیک نہیں ہو؟" صباء نے فکرمندی سے پوچھا۔

"آنٹی جان! میں بہت اداس ہوں اور کل آپ کو لینے آ رہا ہوں۔" صباء چپ رہی تو عمر نے پوچھا۔"آنٹی جان! کیا میں نہ آؤں سکولوں میں تعطیلات ہو رہی ہیں۔"

"مگر تم اب کسی سکول یا کالج میں نہیں پڑھتے، اب کیپٹن صاحب خیر سے فوج میں ہیں۔"

"مگر آنٹی جان! ان دنوں تو میں آپ کے پاس ہوتا تھا۔پچھلی بار آپ کو یہاں لے آیا تھا اور اس بار بھی آپ کو آنا ہو گا۔ بلکہ جب تک میں زندہ ہوں۔ آپ کو گرمیوں کی تعطیلات میرے ساتھ گزارنی ہوں گی۔" عمر نے کچھ اتنے پیار سے کہا کہ صباء سوچ میں پڑ گئی۔

"اچھا ٹھیک ہے تم پھر کل آ جانا۔" صباء نے کچھ دیر بعد کہا۔

"شکریہ، شکریہ آنٹی جان! میں کل ٹھیک ایک بجے تک آ جاؤں گا۔" اس کے لہجے میں خوشی تھی۔

"او۔کے میں منتظر رہوں گی۔" صباء نے کہا تو عمر نے خدا حافظ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

اگلے روز صباء نے رضوان کو بتا دیا تھا کہ وہ اسلام آباد جائے گی۔اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی ضروری تیاری مکمل کر لی تھی۔ دوپہر میں وہ کھانا کھا رہی تھی جب عمر آ گیا۔

"اچھا تو ہماری آنٹی کھانا کھا رہی ہیں۔" اس نے ایک طرف رکھے ہوئے بیگ کو دیکھ کر کہا جو اس بات کی علامت تھا کہ صباء جانے کے لیے تیار ہے۔

"آؤ تم بھی کھانا کھا لو۔" صباء نے دعوت دی تو وہ بولا۔

"معاف کیجیے گا میں کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔"

"کہاں سے؟" صباء نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ارے ارے غصہ مت کیجیے۔" عمر ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔"دراصل ممی کا ایک میسج زاہدہ آنٹی کو دینا تھا۔ اسی لیے سیدھا ان کے گھر چلا گیا اور آپ کو معلوم ہے اُدھر ہی آنٹی نسرین کا گھر ہے سوچا وہاں سے بھی ہوتا جاؤں اور یہ آپ کو معلوم ہے وہاں ایک پیاری سی لڑکی عائشہ بھی رہتی ہے۔ بس اس نے حکم دیا مسٹر کیپٹن آپ کھانا ہمارے یہاں سے کھا کر جائیں گے اور میں نے کھا لیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی آپ کی طرف چلا آیا ہوں۔ تاہم اس کے باوجود اگر آپ ناراض ہوتی ہیں تو ایک بار اور کھا لیتا ہوں، بعد میں چاہے بدپرہیزی ہو جائے مگر خیر یہ تو بعد کی بات ہے۔"

"نہیں، خیر اب اور کھانے کی ضرورت نہیں۔" صباء نے ہنس کر کہا پھر کھانے سے فارغ ہوتے ہی وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب ہی ملازمہ عمر کے لیے کھانا لیے کمرے میں داخل ہوئی۔

"شکریہ میں کھا چکا ہوں۔" عمر نے ایک نظر ٹرے میں رکھے ہوئے کھانے کو دیکھ کر کہا۔ ملازمہ واپس چلی گئی اور وہ آنٹی کے ساتھ بیگ اٹھائے باہر آیا تو رضوان سامنے سے آ رہے تھے۔ عمر نے سلام کیا تو وہ بولے۔

"ہاں بھئی، یہ کھانا کیوں واپس کر دیا تم نے؟"

"ماموں جان! میں دراصل نسرین آنٹی کے گھر سے کھانا کھا کر آیا تھا۔" عمر نے وضاحت کی اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ مگر آج رضوان، صباء کو چھوڑنے خود باہر تک آئے اور عمر کو دیکھتے ہوئے بولے۔

"برخوردار! تم نے بہت زیادہ اثر لیا ہے میری باتوں کا۔ مانا وہ میری غلطی تھی مگر بڑا ہونے کے ناطے اگر میں نے کچھ غلط بھی کہا ہے تو تمہیں اتنا محسوس نہیں کرنا چاہیے۔"

"پلیز ماموں جان! ایسی باتیں مت کیجیے۔ میں نے آپ کی کسی بات کا برا نہیں مانا۔" پھر خدا حافظ کہتے ہوئے اس نے جیپ سٹارٹ کی۔

"آج کیا گھر میں کوئی بھی نہیں تھا؟" راستے میں عمر نے پوچھا۔

"کیوں تم کس کا پوچھ رہے ہو؟" صباء کچھ اور ہی سمجھی۔

"بھئی فومی، نومی اور کس کا پوچھنا ہے۔" عمر نے جلدی سے کہا۔

"وہ لوگ کل ہی مری جا چکے ہیں۔" صباء نے بتایا تو وہ سر ہلاتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

''چونکہ پچھلی بار صباء نے عمر کو گھر سے باہر رہنے پر سخت ڈانٹا تھا۔ اس لیے عمر نے اس بار اس بات کی پوری کوشش کی تھی کہ وہ زیادہ وقت گھر سے باہر نہ رہے اور رات میں تو بالکل ہی نہ جائے۔

صباء کو گھر لاتے ہی وہ اگلے ہی روز ثناء کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور پھر رات ہونے سے پہلے ہی ان کا اچھی طرح پتہ کر کے لوٹ آیا تھا۔

آنٹی کے آنسو اور اپنی توہین کا بدلہ لینے کا اس نے اس بار پورا پروگرام بنایا تھا۔ پچھلی بار تو وہ شرافت سے اس کی ''ہاں'' کے بارے میں پوچھتا رہا تھا۔ مگر اس بار اس کا پروگرام کچھ اور ہی تھا۔ اپنے اسی پروگرام کے مطابق اس وقت وہ اپنی جیپ میں بیٹھا ثناء کو دیکھ رہا تھا۔

ثناء مری کے مال روڈ پر کھڑی آئس کریم کھا رہی تھی، جدید طرز اور خاصے مشہور کلر کی یعنی بلیو جینز اور وائیٹ شرٹ میں وہ بہت زیادہ اچھی لگ رہی تھی اور تھی بھی بالکل اکیلی۔ باقی لوگ نہ جانے کہاں تھے۔ عمر نے آس پاس دیکھا مگر کوئی بھی نظر نہ آیا۔ یہاں تک کہ سہیل بھی غائب تھا۔ کچھ سوچ کر وہ جیپ لاک کر کے کی رنگ انگلیوں میں گھماتے ہوئے اس کے نزدیک چلا آیا۔

''ہیلو مس رضوان۔'' عمر نے ایڑی سے لے کر سر تک اسے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''تم......'' ثناء نے گھور کر اسے دیکھا۔ وہ اس وقت اپنی وردی میں ہی تھا۔

''جی میں......'' عمر مسکرایا۔ ''آپ کیسی ہیں؟'' اس نے شرافت سے پوچھا۔

''تم وہ بے عزتی اتنی جلدی بھول گئے جو اس وقت پھر نظر آ رہے ہو۔'' ثناء نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بے عزتی کیسی ڈیئر! سنا ہے عاشق تو اس سے زیادہ ذلت اٹھاتے ہیں۔ یہ تو کچھ بھی نہ تھی۔'' عمر نے مسکرا کر کہا۔

''اچھے خاصے ڈھیٹ انسان ہو ورنہ کسی بھی شریف آدمی کے لیے اتنا ہی کافی ہوتا ہے۔ جتنا کہ تمہارے ساتھ ہوا۔''

''خیر خیر...... میں جو بھی ہوں، سو ہوں، مگر تم نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ کچھ نظر ثانی کی اپنے فیصلے پر یا نہیں؟'' عمر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کیسا فیصلہ اور کیسی نظر ثانی؟'' ثناء غرائی۔

''کیا بھول گئیں میں نے تمہیں ایک پیش کش کی تھی۔ تمہارے ہی فائدے کی بات تھی۔ بڑا رعب ہوتا ہے فوجی کی بیوی کا۔'' عمر نے جیبوں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھا۔

''لگتا ہے تمہارا دماغ ابھی پوری طرح درست نہیں ہوا۔'' ثناء نے نفرت سے اسے دیکھا۔

''پوری طرح۔'' عمر ہنسا۔ ''ارے بابا یہ تو ابھی ذرا سا بھی درست نہیں ہوا۔''

''اگر یہ بات ہے تو اس کو پھر سے درست کر دیا جائے گا۔'' ثناء نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''اب تو یہ اسی وقت درست ہو گا جب تم ''ہاں'' کرو گی۔'' عمر نے لہجے کو نرمی سے پُر رکھا۔

''تم فوراً چلے جاؤ ورنہ میں آوازیں دے کر لوگوں کو جمع کر لوں گی۔'' ثناء نے دھمکی دی۔

''ضرور، ضرور لیکن یہ سوچ لینا میں اس وقت وردی میں ہوں۔ جیپ میرے پاس ہے۔ لوگ مجھے ایک معزز آفیسر سمجھیں گے اور تم جیسی لڑکیاں......''

''یو شٹ اپ۔'' ثناء چیخ پڑی۔

''پوری بات تو سن لو۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا میرا تو کچھ نہیں جائے گا مگر......''

''تم پتہ نہیں کیا بکواس......'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ سہیل پر نظر پڑ گئی۔ ''ابھی آنے کا کہہ کر کہاں چلے گئے تھے تم؟'' اس نے خفگی سے پوچھا جبکہ عمر تیزی سے سہیل کا جائزہ لے رہا تھا۔

''بھئی پاپا کو ایک ضروری خط پوسٹ کرنا تھا۔ فون کی تو لائن ہی نہیں مل رہی۔ وہ دو دن سے۔ ارے......'' بات کرتے کرتے اچانک اس کی نظر عمر پر پڑی اور وہ چونک کر بولا۔

''اچھا تو آپ بھی تشریف رکھتے ہیں۔''

''جی آپ کو کوئی اعتراض؟'' عمر نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔

''جی نہیں۔'' سہیل نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ویسے بھولنے والی چیز تو نہ تھی وہ بے عزتی۔''

''شٹ یور ماؤتھ میں یہاں تمہاری بکواس سننے نہیں آیا۔'' عمر نے گھور کر اسے دیکھا۔

''اچھا تو آپ سنی سے کوئی گیت سننے آئے ہیں۔''

''ہائیں، تو کیا مس رضوان گلوکاری بھی کرتی ہیں۔'' عمر نے حیرت کا اظہار کیا۔

سہیل نے گھور کر اسے دیکھا اور نفرت سے بولا۔ ''اپنا راستہ ناپو مسٹر! یہاں تمہاری دال نہیں گلے گی۔''

''تمہاری تو گل رہی ہے۔ میں بھی ٹرائی کر کے دیکھ لوں کیا حرج ہے۔''

''تم......'' سہیل غرایا۔ ''اپنی اوقات میں رہو ورنہ......''

عمر ایک دم غصے میں بھر گیا۔ زمین پر بوٹ مارتے ہوئے بولا۔ ''ذلیل انسان مجھے اپنی اوقات کی اچھی طرح پہچان ہے مگر لگتا ہے تم اپنی اوقات بھول گئے ہو۔ ویسے اس میں تمہارا کوئی قصور بھی نہیں۔ سنا ہے کتوں کی کوئی اوقات نہیں ہوتی۔''

''کمینے......'' سہیل نے آگے بڑھ کر تھپڑ مارنا چاہا مگر عمر اس کا ہاتھ جھٹک کر جیپ میں آ بیٹھا۔

''تم سے پھر ملاقات ہو گی۔ مس رضوان!'' کہتے ہوئے عمر نے جیپ اسٹارٹ کی اور یہ جا وہ جا۔

اسی شام وہ صباء کو شاپنگ کے لیے مارکیٹ لے گیا اور ضد کر کے کہتا رہا۔ ''آنٹی یہ خریدیئے، وہ خریدیئے آنٹی یہ لیجیے وہ لیجیے۔'' آخر زچ ہو کر صباء بولی۔

''اف عمر! تم بچے نہیں ہو۔ اس طرح کی حرکتیں مت کرو مجھے معلوم ہے اپنے لیے مجھے کیا لینا ہے۔ اپنی ضروریات کا مجھے خود اچھی طرح اندازہ ہے۔ تم اپنی چونچ بند رکھو۔''

''شکریہ آنٹی! لیکن میری چونچ بند نہیں رہ سکتی کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ کو اپنی ضروریات کا کوئی اندازہ نہیں، کوئی سمجھ نہیں ورنہ آپ یوں۔''

''خدا کے لیے عمر! فلاسفر مت بنا کرو۔'' صباء نے التجا کرنے والے انداز میں کہا اور عمر ہنس پڑا۔ اس کے باوجود وہ باز نہیں آیا اور صباء کے لیے مزید سوٹوں کا کپڑا دیکھنے لگا۔

''عمر! تم باز نہیں آؤ گے اس عمر! میں اتنے سوٹ بنا کر میں کیا کروں گی؟ تمہیں اگر زیادہ شوق ہے تو بیٹا اپنی دلہن کے لیے خریداری کرو۔''

''جس چیز کا ابھی وجود نہیں اس کے لیے کیوں خریدوں۔'' عمر نے کہا تو دکاندار بھی بیچ میں بول پڑا۔

''بیگم صاحبہ! بہت لائق بیٹا ہے آپ کا۔ ورنہ آج کے دور میں کون ماں کا اتنا خیال کرتا ہے۔''

''اب کیا خیال ہے ماں جی!'' عمر نے شرارت سے صباء کو دیکھا اور صباء ہنس پڑی۔
پھر عمر کی پسند سے شاپنگ کر کے وہ باہر آئے اور جیپ میں بیٹھتے ہوئے عمر پھر چونک پڑا۔

''اب کیا ہوا؟'' صباء نے گھور کر اسے دیکھا۔

''وہ آنٹی جان! میں نے یہاں ایک دکان میں آپ کے لیے ایک بہت خوبصورت شال دیکھی تھی۔''

''عمر! خدا کے لیے میری جان چھوڑ دو۔ مجھ میں اب مزید چلنے پھرنے کی سکت نہیں ہے۔''

''آنٹی پلیز......'' وہ بچوں کی طرح ضد کرنے لگا اور صباء اس کے ساتھ پھر چلی آئی۔ شال واقعی بڑی خوبصورت تھی۔ گولڈن بارڈر والی سبز رنگ کی شال عمر نے خود اس کے لیے پسند کی اور پھر بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے باہر چلا آیا۔

ثناء سے دوسری ملاقات مری کے پہاڑوں پر ہوئی تھی۔ ثناء وائٹ پینٹ اور بلیک ٹی شرٹ پہنے پوز بنا رہی تھی اور سہیل فوکس بدل بدل کر تصویر لے رہا تھا۔ شولڈر کٹ بال ہوا کے تیز جھونکوں سے بار بار چہرے پر آتے جنہیں وہ بڑے اسٹائل سے پیچھے کرتی۔ عمر کچھ دیر یہ کھیل دیکھتا رہا پھر ٹہلنے والے انداز میں چلتا ہوا سہیل کے نزدیک آ گیا اور جب فوکس درست کرتا ہوا سہیل آہستہ آہستہ قدموں سے پیچھے ہو رہا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے عمر نے پاؤں اڑا دیا۔ سہیل نے سنبھلنے کی پوری کوشش کی تھی۔ مگر بے سود، وہ لڑھکتا ہوا نیچے چلا آیا۔ ثناء بھاگی بھاگی آئی اور عمر کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''تم! ضرور یہ تم نے کیا ہو گا؟''

''ظاہر ہے اور کس میں یہ جرأت ہو سکتی ہے۔'' عمر نے غور سے اسے دیکھا۔

''تم نہایت ذلیل انسان ہو۔'' ثناء نے غصے سے کہا۔

''بھئی کیا کروں، مجبوری ہے۔ لنگور کے پہلو میں حور کو نہیں دیکھ سکتا۔'' عمر نے پُرسکون لہجے میں کہا اور پلٹ کر سہیل کو دیکھنے لگا جو آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا اوپر آ رہا تھا۔

''میں ڈیڈی سے پھر شکایت کروں گی۔'' ثناء نے غضب ناک ہو کر اسے دیکھا پھر پاؤں پٹختی ہوئی سہیل کے پیچھے جانے لگی تو عمر نے آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا پھر دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''وہ مر نہیں گیا زندہ ہے تم پہلے میری بات سنو۔''

''بکواس مت کرو ایڈیٹ!'' ثناء نے الٹا ہاتھ عمر کے منہ پر رسید کیا۔ عمر اس کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے حیران ہو کر ثناء کو دیکھا اور اگلے ہی لمحے دو زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیئے۔

''میں بونگا سہیل نہیں ہوں جو تمہاری ہر اچھی بری حرکت کو برداشت کرتا رہوں۔ اپنے آپ کو ٹھیک کر لو ورنہ میں تمہیں ٹھیک کر کے رکھ دوں گا۔ آنا تو تمہیں میرے پاس ہی ہے۔'' عمر نے کچھ اتنے وثوق سے کہا کہ ثناء کی جان جل گئی۔

''تمہارے پاس آنے کی بجائے مرنا قبول ہو گا مجھے منہ دھو کر رکھو۔''

''چلو یہ بھی اچھا ہو گا خس کم جہاں پاک۔'' عمر نے لاپرواہی سے کہا۔

''میں کہتی ہوں اب تم دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔'' ثناء غصے سے چیخی اور اتنے میں سہیل بھی ان کے قریب پہنچ گیا۔ عمر اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''سنو! تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟'' ثناء نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر پوچھا اور عمر کی جان جل گئی۔

''مجھے تو چوٹ نہیں آئی مگر کیمرہ ٹوٹ گیا۔'' سہیل نے قہر آلود نظروں سے عمر کو دیکھا۔ ''اس بار تم ذرا لاہور تو آنا پھوپا سے کہہ کر......''

''وہ وقت گزر گیا جب تمہاری بات مانی جاتی تھی۔'' عمر اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''کبھی تم لوگوں نے جھوٹ کہا تھا اور ماموں جان نے سچ مان لیا تھا لیکن اب اگر تم سچ بھی کہو گے تو۔'' عمر مسکرانے لگا۔

''اچھی بات ہے میں خود تمہیں دیکھ لوں گا۔'' سہیل غرایا۔

''وہ تو خیر اس وقت بھی دیکھ رہے ہو۔'' عمر کے لہجے میں شرارت تھی۔

''آؤ سنی!'' سہیل اس کا ہاتھ تھام کر مڑ گیا اور عمر بھی واپس چلا آیا۔

گھر پہنچا تو صباء برآمدے میں کرسی پر بیٹھی۔ آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ عمر کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر پیار سے آواز دی۔ ''آنٹی!''

صباء نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''آپ کیا سوچ رہی ہیں؟'' عمر نے لاڈ سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' صباء مسکرائی اور عمر کے دل میں آیا کہے۔ مجھے معلوم ہے آنٹی آپ

انکل آفاق کے بارے میں سوچ رہی تھیں...... کہاں ہوتے ہیں آج کل یہ انکل آفاق! مگر نہ جانے کیا بات تھی۔ ہمیشہ سوچنے کے باوجود وہ صباء سے بھی کچھ نہ پوچھ سکا تھا۔

''ارے مجھ سے پوچھتے پوچھتے اب خود کس سوچ میں گم ہو گئے ہو۔'' صباء نے غور سے اسے دیکھا۔

''آنٹی جان ایک بات پوچھوں؟'' عمر نے اپنے اندر ہمت پیدا کر ہی لی۔

''پوچھو۔'' صباء نے پیار سے کہا۔

''آپ ناراض تو نہیں ہوں گی؟''

''بات اگر ناراض ہونے والی ہے تو مت پوچھو ویسے میں سب سے ناراض ہو سکتی ہوں مگر تم سے نہیں۔'' صباء نے مسکرا کر کہا۔

''آنٹی! آپ کو یاد ہے جب میں چھوٹا تھا۔'' عمر اچانک خاموش ہو کر سوچنے لگا کہیں ایسا نہ ہو آنٹی اس ذکر سے اداس ہو جائیں اور پھر رونے لگیں۔ ''چھوڑیئے آنٹی! یہ بتائیں ممی، پاپا کہاں ہیں؟''

''بیٹا! وہ تو کسی پارٹی میں گئے ہیں۔ ایک تو تمہارے یہاں آئے دن پارٹیاں بہت ہوتی رہتی ہیں۔''

''آپ کو پتہ ہے آنٹی یہ شہر صدر مقام ہے۔ یعنی دارالحکومت۔ یہاں میجر، جنرل، سفارت کار، ادیب، صحافی اور نہ جانے کون کون لوگ رہتے ہیں۔ یہاں کے روز کے معمولات میں پارٹیاں بھی شامل ہیں۔ ویسے آپ کیوں نہیں گئیں ممی، پاپا کے ساتھ۔''

''یونہی بس دل نہیں چاہتا تھا۔''

''ہوں۔'' عمر نے غور سے انہیں دیکھا۔ ''کھانا کھا لیا آپ نے؟''

''میرا موڈ نہیں۔''

''موڈ کیوں نہیں یہ آپ کے موڈ کو اچانک کیا ہو جاتا ہے؟'' عمر نے فوراً ملازمہ کو آواز دی اور صباء کو اٹھنا پڑا۔ کھانا کھا کر وہ لوگ باتوں میں مصروف ہو گئے۔

ثناء سے تیسری ملاقات ایوبیہ کے خوبصورت پارک میں ہوئی تھی۔ اس بار وہ اور سہیل اکیلے نہ تھے بلکہ باقی سب لوگ بھی موجود تھے جن میں خاص کر فومی، نومی بھی شامل تھے۔ ورنہ عموماً عمر کو ثناء اور سہیل اکیلے ہی ملتے تھے۔ عمر نے سوچا اب کیا کیا جائے سوائے

انتظار کے۔ ہو سکتا ہے کوئی موقع مل ہی جائے سو وہیں بیٹھ کر وہ ان کو دیکھنے لگا۔ اس کو یقین تھا ثناء اور سہیل کوئی نہ کوئی بہانہ لگا کر اکیلے پھر کہیں ضرور جائیں گے مگر آدھا گھنٹہ گزر گیا اور ایسا نہ ہوا۔ وہ سب لوگ وہیں باتوں میں مصروف رہے۔ ثناء کی نانی ان سب میں نمایاں تھی۔

"اچھا تو جھوٹ کے ریکارڈ توڑنے والی بڑھیا آج تمہیں بھی دیکھ لوں گا۔" عمر نے دل میں سوچا۔ بہت دیر گزر گئی۔ وہ بیٹھا رہا۔ اچانک فومی، نومی اور سہیل اٹھ کر ایک جانب چلے گئے۔ ثناء اس وقت بیٹھی کچھ کھا رہی تھی۔ اصل میں عمر فومی اور نومی کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا اور جیسے ہی وہ لوگ نظروں سے اوجھل ہوئے وہ بڑے آرام سے اٹھا اور یوں ٹہلنے والے انداز میں چیونگم چباتا ہوا قریب پہنچ گیا۔ کچھ دیر ان کے سر پہ کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر ٹانگیں پھیلا کر عین ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ سب نے چونک کر اسے دیکھا اور کچھ دیر دیکھتے رہے پھر ثناء نفرت سے ناک سکیڑ کر بولی۔

"آپ نے دیکھا نانی! یہ ڈھیٹ انسان اسی طرح ہمارا تعاقب کرتا ہے اور ہمیں تنگ کرتا ہے۔"

"کیوں بھئی، تمہیں اپنی حرکتوں سے باز آنا ہے یا نہیں؟" ثناء کی نانی نے چشمہ درست کیا اور عمر کو گھورنے لگیں۔ ان کا خیال تھا جس طرح فوزیہ کے گھر عمر ان سے دبتا تھا اسی طرح اب بھی کچھ نہ بولے گا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" عمر نے تیزی سے منہ چلاتے ہوئے رک کر پوچھا۔

"میں پوچھتی ہوں تمہیں اپنی حرکتوں سے باز آنا ہے یا نہیں؟" ثناء کی نانی نے چیخ کر کہا۔

"آپ ایسا کیوں کرتی ہیں۔ کیا میں نے آپ سے کچھ کہا ہے محترم بڑھیا۔"

"ہائیں......" ثناء کی نانی کو غصہ آ گیا۔ "تم نے مجھے بڑھیا کہا۔"

"تو کیا گڑیا یا گرل کہتا؟" عمر نے معصومیت سے پوچھا۔

"بہت بدتمیز ہو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔ دیکھنا میں رضوان سے تمہاری شکایت کروں گی۔" نانی جان غصے سے بولیں اور ثناء عمر کو گھورنے لگی۔

"جسے دیکھو یہی دھمکی دیتا ہے میں پوچھتا ہوں کیا کیا ہے میں نے۔ کیا آپ سے کچھ کہا ہے میں نے؟"

"اچھا اگر تم نے کچھ کیا نہیں، کچھ کہا نہیں تو پھر یہاں کیا لینے بیٹھے ہو۔" ثناء کی ممانی نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یہ پارک آپ نے الاٹ کروایا ہے؟" عمر نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"تم بہت گستاخ لڑکے ہو، سب کچھ کر بھی رہے ہو اور جھوٹ بھی بول رہے ہو۔" ممانی نے غصے سے کہا۔

"شکریہ۔" عمر نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی اور ثناء کی نانی کو دیکھا۔ "کچھ لوگ تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہوئے ہیں اور اس کے باوجود جھوٹ بولتے ہیں اور ایسا زبردست جھوٹ بولتے ہیں کہ بندہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہ جاتا ہے اور میری تو عمر ہی بدتمیزیوں کی اور جھوٹ بولنے کی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تم باز نہیں آؤ گے؟" نانی نے غصے سے پوچھا۔

"پتہ بھی تو چلے کس بات سے باز آ جاؤں۔ میں تو اس پارک میں بیٹھا تھا۔ بات چیت کا آغاز تو آپ لوگوں نے خود کیا ہے۔ میں تو خواہ مخواہ کسی ایرے غیرے کو بلانا پسند ہی نہیں کرتا۔ آپ کی رشتہ داری ماموں رضوان سے ہو سکتی ہے مجھ سے نہیں۔ پھر میں کیوں بلاتا آپ کو؟"

"سنو لڑکے! اگر اپنا بھلا چاہتے ہو تو یہاں سے اٹھ جاؤ ورنہ ابھی سہیل اور فومی، نومی آ گئے تو اچھا نہ ہو گا تمہارے حق میں۔" ممانی نے گویا اسے دھمکی دی۔

"ہرگز نہیں اٹھوں گا۔ یہ پارک آپ کی ملکیت نہیں۔ عوامی جگہ ہے جس کا جہاں جی چاہے وہ وہاں بیٹھے۔ آپ لوگ کون ہوتے ہیں اٹھانے والے یا بٹھانے والے۔"

"مگر تمہیں یہاں سے اٹھنا پڑے گا۔" ثناء آنکھیں نکال کر بولی۔

"دل سے کہہ رہی ہو؟" عمر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"جہنم میں جاؤ۔" ثناء دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"اب اٹھ جاؤ لڑکے ورنہ۔" ممانی غصے سے اٹھتی ہوئی بولیں۔ گویا قتل کرنے کا ارادہ رکھتی ہو۔

"اچھی زبردستی ہے۔ میں پوچھتا ہوں آپ خود کیوں نہیں اٹھ جاتیں۔ اگر میرا بیٹھنا ناگوار گزر رہا ہے تو۔" عمر نے کہا اور چپس نکال کر کھانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ ادھر اُدھر

یوں دیکھنے لگا گویا وہاں ان کی موجودگی سے بے خبر ہو گیا ہو۔ وہ لوگ کچھ دیر تو عمر کے اٹھنے کا انتظار کرتے رہے۔ آخر تنگ آ کر خود ہی اٹھ گئے اور ثناء کی نانی عمر کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں بولی۔

''یہ ڈھیٹ خاندان کا فرد ہے تم نے دیکھا نہیں فوزیہ کی سختی اور ہزار باتوں کے باوجود یہ لوگ کتنی ڈھٹائی سے وہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔''

''اور آپ نے جہیز میں اپنے وجود کو بھی شاید سامان کا ایک حصہ سمجھ کر دے دیا تھا جب ہی تو تیس دن خود آ کے بیٹی کے گھر بیٹھی رہتی ہیں۔'' عمر نے فوراً جواب دیا۔

''لڑکے تم۔'' وہ کچھ کہتی کہتی آگے بڑھ گئیں۔ عمر ٹھیک سے سن نہ سکا مگر وہ ان کے جاتے ہی خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں بیٹھنے کا مقصد تو محض ان لوگوں کو تنگ کرنا تھا۔ جو پورا ہو چکا تھا۔ یوں بھی اب اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ وہ مسکراتا ہوا جیپ میں آ بیٹھا۔

❁ ❁ ❁

ڈیوٹی کے اوقات کچھ زیادہ ہی سخت ہو گئے تھے۔ کوشش کے باوجود وہ کافی دن ثناء کی طرف نہ جا سکا اور گھر میں بھی کم ہی رہا۔ صبح ناشتے کے بعد جاتا اور رات گئے گھر واپس آتا۔ اسی دوران جو تھوڑا بہت وقت ملتا وہ آنٹی کے ساتھ گپ شپ لگانے میں گزار دیتا۔ مگر جیسے ہی تھوڑی نرمی ہوئی وہ وردی میں ہی سیدھا مری روانہ ہو گیا۔ موسم خوشگوار بھی تھا اور خطرناک بھی۔ بارش کا امکان تھا بلکہ صاف لگتا تھا آج بارش ضرور ہو گی۔ عمر سوچ رہا تھا۔ عرصہ ہو گیا ثناء کا پیچھا کرتے ہوئے مگر حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا...... پتہ نہیں آنٹی کی قسمت خراب تھی جو ان کی یہ خواہش بھی پوری ہوتی نظر نہ آ رہی تھی یا وہ خود خوش قسمت تھا جو ثناء جیسی زبان دراز اور بدتمیز لڑکی کے ساتھ سے بچ رہا تھا۔ اسے اپنی غمی اور خوشی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ مقصد تو صرف آنٹی کی خواہش کی تکمیل تھا۔

عمر نے جیپ جب پہاڑی کی جانب موڑی تو بارش شروع ہو گئی۔ عمر نے ہیڈ لائٹس جلائیں وہ آہستہ آہستہ جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ کیونکہ ایک جانب بلند و بالا پہاڑ تھے تو دوسری جانب گہری کھائی۔ دفعتاً وہ سڑک پر کھڑے بارش میں بھیگتے ہوئے ایک جوڑے کو دیکھ کر چونک پڑا۔ جیپ کو دیکھ کر ان لوگوں نے لفٹ کے لیے ہاتھ دیا۔ عمر نے جیپ روکی اور

چونک پڑا۔ وہ ثناء اور سہیل تھے۔

''تم......؟'' سہیل نے عمر کو دیکھ کر کہا۔

''جی میں۔ آپ ہی کی تلاش میں جا رہا تھا۔ اچھا ہوا آپ جلد ہی مل گئے ورنہ نہ جانے میرا کتنا وقت ضائع ہوتا اور موسم تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں ویسے آپ کو یہ بارش میں بھیگنے کی کیا سوجھی؟'' عمر نے ثناء کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم کون ہوتے ہو پوچھ گچھ کرنے والے۔ تم جا سکتے ہو ہم یہاں بارش میں بھیگ سکتے ہیں مگر تمہاری جیپ میں نہیں بیٹھ سکتے۔''

''یہ بارش رکنے والی نہیں۔ خواہ مخواہ یہاں کھڑے کھڑے اگر آپ مسکرانے لگے تو......'' عمر نے شرارت سے کہا۔

''بس کہہ دیا ہم لفٹ نہیں لیں گے تم سے۔'' ثناء نے تیزی سے کہا۔

''او۔ کے میرا مقصد تو آپ کو سمجھانا تھا اس کے باوجود آپ نہیں سمجھے تو آپ کی مرضی۔ ویسے پھر بھی میں یہاں کھڑا آپ کا انتظار کروں گا۔ کیونکہ اس موسم اور شدید بارش میں کوئی گاڑی چلانے کا رسک نہیں لیتا۔'' عمر نے گویا انہیں سمجھایا۔

''تمہاری معلومات کا شکریہ، ہمیں یہاں کھڑے ہونا اچھا لگتا ہے۔'' ثناء نے کہا اور سہیل کا ہاتھ تھام کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

''ہاں وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں اکیلے اس بھیگے چوہے کے ساتھ گھومنا پھرنا اچھا لگتا ہے۔'' عمر نے سہیل کو دیکھا جو واقعی بھیگا چوہا لگ رہا تھا۔

''بکواس بند کرو، ہمیں نہیں لفٹ کی ضرورت۔'' سہیل نے غرا کر کہا۔

''او کے، او کے۔ اس کے باوجود میں کھڑا ہوں۔'' عمر نے جیپ سائیڈ پر کی اور تھرماس سے چائے نکال کر پینے لگا۔ چائے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اسی دوران میں ایک دو گاڑی آئی بھی مگر ان میں جگہ نہیں تھی۔ اب تو مارے سردی کے ثناء ہولے ہولے کانپ رہی تھی کیونکہ آج اس نے پینٹ شرٹ کی بجائے شلوار کرتا پہن رکھا تھا۔ عمر موسیقی سنتے ہوئے ایک اچٹتی نظر ان دونوں پر بھی ڈال لیتا پھر اس نے ثناء کی آواز سنی۔

''سنو! بارش تو شاید یہ رات تک نہ رکے ہمیں اس کی پیش کش مان لینی چاہیے۔''

یوں دیکھنے لگا گویا وہاں ان کی موجودگی سے بے خبر ہو گیا ہو۔ وہ لوگ کچھ دیر تو عمر کے اٹھنے کا انتظار کرتے رہے۔ آخر تنگ آ کر خود ہی اٹھ گئے اور ثناء کی نانی عمر کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں بولی۔

"یہ ڈھیٹ خاندان کا فرد ہے تم نے دیکھا نہیں فوزیہ کی سختی اور ہزار باتوں کے باوجود یہ لوگ کتنی ڈھٹائی سے وہاں آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"اور آپ نے جہیز میں اپنے وجود کو بھی شاید سامان کا ایک حصہ سمجھ کر دے دیا تھا جب ہی تو تیس دن خود آ کے بیٹی کے گھر بیٹھی رہتی ہیں۔" عمر نے فوراً جواب دیا۔

"لڑکے تم۔" وہ کچھ کہتی کہتی آگے بڑھ گئیں۔ عمر ٹھیک سے سن نہ سکا مگر وہ ان کے جاتے ہی خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ وہاں بیٹھنے کا مقصد تو محض ان لوگوں کو تنگ کرنا تھا۔ جو پورا ہو چکا تھا۔ یوں بھی اب اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ وہ مسکراتا ہوا جیپ میں آ بیٹھا۔



ڈیوٹی کے اوقات کچھ زیادہ ہی سخت ہو گئے تھے۔ کوشش کے باوجود وہ کافی دن ثناء کی طرف نہ جا سکا اور گھر میں بھی کم ہی رہا۔ صبح ناشتے کے بعد جاتا اور رات گئے گھر واپس آتا۔ اسی دوران جو تھوڑا بہت وقت ملتا وہ آنٹی کے ساتھ گپ شپ لگانے میں گزار دیتا۔ مگر جیسے ہی تھوڑی نرمی ہوئی وہ وردی میں ہی سیدھا مری روانہ ہو گیا۔ موسم خوشگوار بھی تھا اور خطرناک بھی۔ بارش کا امکان تھا بلکہ صاف لگتا تھا آج بارش ضرور ہو گی۔ عمر سوچ رہا تھا۔ عرصہ ہو گیا ثناء کا پیچھا کرتے ہوئے مگر حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا...... پتہ نہیں آنٹی کی قسمت خراب تھی جوان کی یہ خواہش بھی پوری ہوتی نظر نہ آ رہی تھی یا وہ خود خوش قسمت تھا جو ثناء جیسی زبان دراز اور بدتمیز لڑکی کے ساتھ سے بچ رہا تھا۔ اسے اپنی غمی اور خوشی کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ مقصد تو صرف آنٹی کی خواہش کی تکمیل تھا۔

عمر نے جیپ جب پہاڑی کی جانب موڑی تو بارش شروع ہو گئی۔ عمر نے ہیڈ لائٹس جلائیں وہ آہستہ آہستہ جیپ ڈرائیو کر رہا تھا۔ کیونکہ ایک جانب بلند و بالا پہاڑ تھے تو دوسری جانب گہری کھائی۔ دفعتاً وہ سڑک پر کھڑے بارش میں بھیگتے ہوئے ایک جوڑے کو دیکھ کر چونک پڑا۔ جیپ کو دیکھ کر ان لوگوں نے لفٹ کے لیے ہاتھ دیا۔ عمر نے جیپ روکی اور

چونک پڑا۔ وہ ثناء اور سہیل تھے۔

"تم......؟" سہیل نے عمر کو دیکھ کر کہا۔

"جی میں۔ آپ ہی کی تلاش میں جا رہا تھا۔ اچھا ہوا آپ جلد ہی مل گئے ورنہ نہ جانے میرا کتنا وقت ضائع ہوتا اور موسم تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں ویسے آپ کو یہ بارش میں بھیگنے کی کیا سوجھی؟" عمر نے ثناء کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کون ہوتے ہو پوچھ گچھ کرنے والے۔ تم جا سکتے ہو ہم یہاں بارش میں بھیگ سکتے ہیں مگر تمہاری جیپ میں نہیں بیٹھ سکتے۔"

"یہ بارش رکنے والی نہیں۔ خواہ مخواہ یہاں کھڑے کھڑے اگر آپ مسکرانے لگے تو......" عمر نے شرارت سے کہا۔

"بس کہہ دیا ہم لفٹ نہیں لیں گے تم سے۔" ثناء نے تیزی سے کہا۔

"او۔ کے میرا مقصد تو آپ کو سمجھانا تھا اس کے باوجود آپ نہیں سمجھے تو آپ کی مرضی۔ ویسے پھر بھی میں یہاں کھڑا آپ کا انتظار کروں گا۔ کیونکہ اس موسم اور شدید بارش میں کوئی گاڑی چلانے کا رسک نہیں لیتا۔" عمر نے گویا انہیں سمجھایا۔

"تمہاری معلومات کا شکریہ، ہمیں یہاں کھڑے ہونا اچھا لگتا ہے۔" ثناء نے کہا اور سہیل کا ہاتھ تھام کر ایک طرف کھڑی ہو گئی۔

"ہاں وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ تمہیں اکیلے اس بھیگے چوہے کے ساتھ گھومنا پھرنا اچھا لگتا ہے۔" عمر نے سہیل کو دیکھا جو واقعی بھیگا چوہا لگ رہا تھا۔

"بکواس بند کرو، ہمیں نہیں لفٹ کی ضرورت۔" سہیل نے غرا کر کہا۔

"او کے، او کے۔ اس کے باوجود میں کھڑا ہوں۔" عمر نے جیپ سائیڈ پر کی اور تھرماس سے چائے نکال کر پینے لگا۔ چائے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اسی دوران میں ایک دو گاڑی آئی بھی مگر ان میں جگہ نہیں تھی۔ اب تو مارے سردی کے ثناء ہولے ہولے کانپ رہی تھی کیونکہ آج اس نے پینٹ شرٹ کی بجائے شلوار کرتا پہن رکھا تھا۔ عمر موسیقی سنتے ہوئے ایک اچٹتی نظر ان دونوں پر بھی ڈال لیتا پھر اس نے ثناء کی آواز سنی۔

"سنو! بارش تو شاید یہ رات تک نہ رکے ہمیں اس کی پیش کش مان لینی چاہیے۔"

سہیل نے سردی سے کانپتی ہوئی ثناء کو دیکھا پھر بولا۔

''چلو تمہاری خاطر یہ بھی کر لیتا ہوں ورنہ میں اکیلا ہوتا تو کبھی ہار نہ مانتا۔''

''سنو! غلط مت سمجھو۔ ہم اسے کرایہ ادا کر دیں گے۔'' ثناء نے وضاحت کی۔

''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' سہیل خوش ہو گیا پھر جیپ کی طرف آیا اور عمر سے بات کیے بغیر دروازہ کھولنے لگا۔

''ارے ارے بھائی! یہ کیا کر رہے ہو؟'' عمر نے بوکھلا کر پوچھا۔

''دکھائی نہیں دیتا بیٹھ رہے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔'' سہیل نے دانت پیس کر جواب دیا۔

''مگر کس سے پوچھ کر بیٹھ رہے ہو؟'' عمر نے حیران ہونے کی اداکاری کی۔

''تم نے خود ہی تو کہا تھا بلکہ منت سماجت کر رہے تھے۔'' سہیل نے غصے سے کہا۔ ثناء تو اب بولنے کی بھی سکت نہیں رکھتی تھی۔ خاموش کھڑی ان کی مکالمے بازی سن رہی تھی۔

''بھائی! وہ تو میں نے ایک گھنٹہ پہلے کہا تھا۔'' عمر کے لہجے میں شرارت تھی۔

''کیا مطلب؟'' سہیل نے غرا کر پوچھا۔

''مطلب کا تو مجھے بھی پتہ نہیں۔ بہرحال اس وقت تم لوگ نہیں بیٹھ سکتے۔'' عمر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ثناء کو دیکھا جو اب مسلسل چھینکیں مارے جا رہی تھی۔

''تم......'' سہیل نے آنکھیں نکال کر عمر کو دیکھا۔ پھر ثناء کو لے کر واپس مڑا تو عمر بولا۔ ''سنو! میں اب صرف تمہاری ساتھی کو لفٹ دے سکتا ہوں۔''

''ہوں۔'' سہیل نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''وہ اکیلی نہیں بیٹھے گی۔ اس سے بہتر تو یہ ہو گا کہ ہم دونوں بارش میں بھیگتے رہیں۔''

''خوشی سے بھیگو، بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' عمر نے لاپرواہی سے کہا۔ پھر بولا۔ ''یہ کیسا عجیب اتفاق ہے آج نہ تمہارے پاس کیمرہ ہے اور نہ ہی میرے پاس ورنہ پوز یہ یادگار تھا۔ مگر افسوس......''

''سلو! پلیز میری طبیعت۔'' ثناء رو دینے کے قریب تھی۔

''تمہارا مطلب ہے تمہیں اکیلے جانے دوں۔ اس کمینے انسان کے ساتھ۔'' سہیل دھاڑا۔

''پلیز سلو! یہ بھی تو دیکھو اگر میں مزید کچھ دیر اسی حالت میں رہی تو بیمار پڑ جاؤں

گی۔'' ثناء نے التجا کی۔ سہیل کا دل تو نہیں چاہتا تھا مگر وہ مان گیا۔

''ٹھیک ہے سنی! تم جاؤ میں اس ذلیل کو بعد میں دیکھ لوں گا۔'' ثناء نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ جیپ کے قریب آئی تو عمر بولا۔

''رکو رکو کہاں چڑھتی چلی آ رہی ہو؟''

''تم......'' ثناء اسے بہت کچھ سنانا چاہتی تھی مگر بولنے کی سکت نہیں تھی۔

''سنو، ایک بار پہلے میں نے تمہیں بارش سے بچانے کا صلہ پایا تھا جو اس وقت تمہیں بچا کے پاؤں گا۔ ویسے بھی میرا خیال ہے تمہیں مر جانا چاہیے۔ اس طرح میری جان بھی مصیبت سے چھوٹ جائے گی۔ تمہاری وجہ سے جو میرے پاؤں میں چکر پڑ گئے ہیں پھر وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔'' پھر حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کھڑی ثناء کو بائے بائے کہتے ہوئے اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور چلتا ہی چلا گیا۔

گھر پہنچا تو سب لوگ کھانا کھا رہے تھے عمر بھی جلدی سے ہاتھ دھو کر ان میں شامل ہو گیا۔

''مسٹر کیپٹن! کہاں رہتے ہو آج کل؟'' کرنل نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پاپا! گھر پہ ہوتا ہوں یا ڈیوٹی پر اور کہاں رہ سکتا ہوں۔'' عمر نے ڈش میں سے چاول نکالتے ہوئے جواب دیا۔ تاہم وہ سمجھ گیا تھا کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

''گھر پر کس وقت ہوتے ہو تم؟'' کرنل نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''جب دیکھو یوں لگتا ہے گویا کہیں بھاگنے کی تیاری میں ہو۔ کرنل ایاز، تمہاری شکایت کر رہا تھا۔ سچ بتاؤ اصل بات کیا ہے؟''

''یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے پاپا۔'' عمر نے کھانا کھاتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ بہت خاص بات ہے نہ تم گھر پر ہوتے ہو نہ ڈیوٹی پر اور اس بار تم اپنی آنٹی کو کہیں گھمانے بھی نہیں لے کر گئے۔''

''سوری پاپا! میں اپنے ایک نجی کام کے سلسلے میں کچھ مصروف ہو گیا تھا ورنہ آنٹی...... آنٹی کو تو میں پاپا کبھی نہیں بھولتا۔ وہ تو بس۔'' عمر کچھ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

''مجھے یقین ہے۔'' پروین مسکرا کر بولی۔ ''تم ہمیں بھول سکتے ہو مگر صباء کو نہیں۔ مگر بیٹا! تمہیں پتہ نہیں تمہاری آنٹی سارا وقت گھر میں پڑی بور ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے ساتھ ٹی

پارٹی میں تو وہ جاتی ہی نہیں اور گھمانے پھرانے کی ذمے داری تمہاری تھی جبکہ تم۔"

"ختم کرو پروین اس موضوع کو۔ میں اب بھلا اور کہاں گھوموں گی۔ سب کچھ ہی تو دیکھ چکی ہوں۔ باقی رہی گھر میں بیٹھ کر بور ہونے کی بات تو گھر میں بیٹھنا میری عادت ہے۔" صباء نے عمر کو دیکھ کر کہا۔

"ارے نہیں آنٹی جان! ابھی آپ نے سب کچھ کہاں دیکھا ہے۔ دیکھنے کو تو ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ بس میں ذرا کام سے فارغ ہو جاؤں، پھر کشمیر چلیں گے۔ ممی آپ بھی تیاری کیجیے گا۔ سب مل کر چلیں گے۔ تقریباً ایک ہفتہ تو لگ ہی جائے گا۔"

"شکر ہے صباء تمہارے بیٹے کو ہمارا بھی کچھ خیال آیا۔" پروین نے ہنس کر کہا تو نہ صرف صباء بلکہ کرنل بھی مسکرا دیئے۔

کشمیر کو کسی نے یونہی تو جنت کا نظارہ نہیں کہا تھا۔ خوبصورت نظاروں، جھرنوں، پہاڑوں، چشموں اور قدم قدم پر پھولوں اور سبزے میں گھری ہوئی یہ جگہ بہت خوبصورت اور رنگین تھی۔

کشمیر کا یہ رومان پرور موسم صباء کو اداس کر گیا۔ بے ساختہ لارنس گارڈن میں گزری ہوئی گھڑیاں یاد آئیں تو دل میں درد کی ایک ٹیس اٹھی۔ وہ چپکے سے بغیر کسی سے کچھ کہے اٹھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان سب سے دور ہونے لگی۔ کیونکہ یادیں آج کچھ اس شدت سے آئی تھیں کہ ضبط نہ ہو رہا تھا۔ وہ رونا نہیں چاہتی تھی، اس لیے اٹھ گئی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی اگر روئی تو سب اس کا سبب دریافت کریں گے اور وہ کیا بتائے گی؟ چلتے چلتے تھک گئی تو اک پتھر پر جا بیٹھی اور پھر نیچے زمین کو دیکھا اور اوپر آسمان کو وہ کتنی بے بس تھی۔ کس قدر مجبور تھی۔ کیسی اذیت ناک زندگی بسر کر رہی تھی۔ کوئی ایسا نہیں تھا۔ جس سے دل کا درد کہتی ایک روحی تھی وہ بھی پہلے بچے کی پیدائش پر چل بسی تھی۔ اب اس کے دکھ اپنی ذات تک محدود تھے اور آج ان دکھوں کو یاد کرتے ہوئے ہزار ضبط کے باوجود آنسو بہہ نکلے اور صباء گھاس پر انگلیوں سے آفاق کا نام لکھتے ہوئے دکھ سے بڑبڑائی۔

وابستہ تجھ سے ہو کر بھی ہم تیرے نہ ہوئے
یہ وہ دکھ ہیں جو کبھی ہم سے بھلائے نہ گئے

دل میں تو جو درد تھا سو تھا مگر سردی محسوس کرتے ہی کمر میں بھی درد شروع ہو گیا۔

صباء کو نہیں معلوم تھا کہ عمر اس کے پیچھے آیا ہے اور اس وقت چند قدموں کے فاصلے پر کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ جب صباء نے کمر کو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے طویل سانس لیا تو عمر بھاگتا ہوا آیا۔

"آنٹی جان! آنٹی جان آپ ٹھیک تو ہیں؟" صباء نے چونک کر آنکھیں کھولیں پھر اپنے سامنے کھڑے پریشان عمر کو دیکھ کر بولی۔

"میں ٹھیک ہوں عمر!" اچانک اسے آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں کا احساس ہوا تو وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ "اب نظر کا چشمہ بھی لگوانا پڑے گا۔ آنکھیں بہت خراب ہو گئی ہیں۔ دیکھو تو یونہی کبھی کبھی پانی بہنے لگتا ہے۔"

"جی آنٹی ضرور، میں خود آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔" عمر نے یوں کہا گویا کچھ بھی نہ جانتا ہو۔ پھر آنٹی کو ساتھ لیے وہ ممی پاپا کے پاس آ گیا اور جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر چائے پی رہے تھے۔ عمر ان سے کچھ دور ایک درخت سے ٹیک لگائے آفاق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ جتنا سوچ رہا تھا اتنا ہی الجھ رہا تھا۔ کوئی بات بھی تو سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔

اس کو اچھی طرح یاد تھا آنٹی انکل آفاق کے خطوط پڑھ کر رویا کرتی تھیں۔ مگر عمر کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آئی تھی کہ ان دونوں میں مجبور یا بے وفا کون تھا۔ ممی نے اس کو بتایا تھا۔ صباء نے شادی سے خود انکار کیا تھا۔ اگر یہ بات صحیح تھی تو پھر مجرم آفاق نظر آتا تھا لیکن پھر وہ سوچتا اگر بے وفا آفاق تھا تو وہ سب خطوط کیسے تھے جن کو پڑھ کر آنٹی رو دیا کرتی تھیں اور وہ فون کیسے تھے جنہیں آنٹی آدھی رات کو سنا کرتی تھیں۔

کوئی بات بھی ٹھیک سے عمر کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اور نہ ہی کوئی ایسا ذریعہ تھا جو اس کو پتہ چل جاتا کہ آفاق کون تھا اور کہاں رہتا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ ایک بار جب اس نے کہا تھا۔ "آنٹی! میری انکل سے بات کروائیں، میں انہیں بتاؤں گا آنٹی بہت روتی ہیں۔" تب آنٹی نے کہا تھا۔ "تم سو جاؤ عمر، وہ جانتے ہیں میں کس وقت کیا کرتی ہوں۔" اگر وہ سب کچھ جانتے تھے تو پھر آنٹی نے تنہا زندگی کیوں گزاری۔ عمر، آنٹی سے اگر کبھی بات کرنے کی کوشش کرتا تو بات منہ سے ہی نہ نکلتی۔ بھلا پوچھتا بھی تو کیا۔ یہ حق تو ماں کا تھا۔ بہنوں کا تھا یا پھر بھائی کا اور عمر ان کی بے حسی پر دانت پیستا اور جب وہ خود پتہ نہ لگا پاتا تو

آنٹی کا درد خود اس کے دل میں اتر آتا۔

آنٹی کو اپنے گھر میں کیا حیثیت دی جاتی تھی۔ عمر کو اس کا اچھی طرح اندازہ تھا۔

جب ماں، باپ ہی اپنے نہ تھے تو کوئی دوسرا کیسے اپنا بن سکتا تھا۔ وہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا۔ آنٹی کی محبت دل میں جڑ پکڑتی گئی۔ کتنی عجیب بات تھی وہ خوبرو تھا، نوجوان تھا۔ ایک تو اکلوتی اولاد تھی، دوسرا ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کے دل میں اپنے لیے کبھی کوئی نرم جذبہ نہ جاگا تھا۔ کبھی کسی آرزو نے جنم نہیں لیا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی وہ لڑکپن خاموشی سے گزار آیا تھا اور جوانی بھی خاموشی سے گزار رہا تھا۔ اس کی خوشی اور غمی صرف اور صرف آنٹی کی ذات تک محدود ہو گئی تھی۔ نہ جانے ایسا کیوں ہوا تھا۔ اس کے دوست جب فارغ ہوتے تو کوئی اپنی فرینڈ کا، کوئی اپنی کزن کا قصہ بیان کرتا۔ سب لوگ، دلچسپی سے سنتے۔ مگر عمر کو عجیب سی بے زاری محسوس ہوتی۔ وہ تو صرف آنٹی کے بارے میں سوچتا۔ آنٹی، جو تنہا تھی۔

مگر اس سوال کا اسے کبھی جواب نہ ملا تھا۔ اس کے باوجود سب کچھ جان لینے کی تمنا کبھی ختم نہ ہوئی تھی۔ وہ آنٹی کے قریب ہوتا یا دور اس کے دل و دماغ میں ہمیشہ آنٹی ہی رہتی۔ وہ اتنا بڑا ہو گیا تھا مگر خود اپنے لیے اپنے دل میں کوئی خواہش نہ پائی تھی۔ وہ شاید کچھ دیر اور انہی سوچوں میں گم رہتا۔ مگر صباء کو سامنے سے آتا دیکھ کر مسکرا دیا۔

''کیوں بھئی، یہاں بیٹھے کیا سوچ رہے ہو؟'' وہ جو کچھ دیر پہلے بہت افسردہ تھیں اس وقت بالکل فریش لگ رہی تھیں۔

''میں کیا سوچوں گا آنٹی جان! بس آپ لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔''

''اچھا، اگر دیکھ چکے ہو تو اب چلو۔'' صباء نے کہا اور وہ ہمیشہ کی طرح سعادت مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اٹھ گیا اور صباء اس کے ساتھ باتوں میں لگ گئی۔

کشمیر میں ایک ہفتہ گزار کر وہ جیسے ہی واپس آئے عمر، ثناء کی تلاش میں چل پڑا اور جب ان کی رہائش گاہ پر گیا تو پتہ چلا کہ ثناء کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے وہ لوگ جلدی واپس چلے گئے ہیں۔ ثناء کی بیماری کا سن کر عمر کو ایک خوشی سی محسوس ہوئی اور وہ مسکراتے ہوئے واپس آ گیا۔



تین ماہ بعد جب وہ آنٹی کو چھوڑنے لاہور آیا تو گیٹ پر ہی ثناء سے ملاقات ہو گئی۔ صباء تو اندر چلی گئی اور عمر رک کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''کہو کیسے حال چال ہیں۔''

''تم...... ممی ٹھیک کہتی ہیں۔ تم لوگ نمک حرام اور احسان فراموش ہو۔''

''واقعی۔'' عمر نے سکون سے اس کو دیکھا۔ سرمئی سوٹ میں وہ اگرچہ خوبصورت لگ رہی تھی۔ مگر پہلے سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ ''سنو یہ تم ہر وقت ممی کی کہی ہوئی باتیں دوہراتی ہو۔ تمہاری اپنی کوئی سوچ نہیں۔ کب تک ممی اور سہیل کی انگلی پکڑ کر چلتی رہو گی۔ میرے حق میں فیصلہ دے دو۔ میں تمہیں اعتماد کی وہ دولت دوں گا کہ تم سب کچھ اپنی سوچ کے حوالے سے کہا کرو گی، کیا خیال ہے، کیا فیصلہ کیا ہے پھر تم نے؟''

''اس بات کو تو بھول جاؤ اور اپنی منحوس شکل لے کر یہاں سے دفعہ ہو جاؤ کیونکہ یہی تمہارے حق میں بہتر ہو گا ورنہ.....'' ثناء نے غصے سے اسے دیکھا۔

''جی بہتر۔ آپ کا حکم ہو اور میں نہ مانوں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن جاتے جاتے ایک بات یہ کہہ دوں۔ سہیل کے ساتھ تنہا گھومنے کی سزا تو خوب ملی۔'' وہ وہیں سے واپس مڑ گیا اور ثناء نے غصے سے منہ بنا لیا کیونکہ اس کے سوا وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔

واپس آتے ہی اس نے پاپا سے شکایت کی تھی اور رضوان نے سب کچھ سن کر کہا تھا۔ ''یہ سب کچھ صباء سے عمر کو جدا کرنے کے گر ہیں جو تمہاری نانی تمہیں پڑھا رہی ہیں۔ یاد رکھو آئندہ عمر کے بارے میں مجھے کچھ کہنے یا بتانے کی ضرورت نہیں میں جانتا ہوں کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔''

باپ کی بات سن کر ثناء چپ ہو گئی۔ تاہم اس نے اور سہیل نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ یہ بات تو طے ہے شادی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ہو گی۔ مگر عمر کو جلانے کے لیے انہیں منگنی کر لینی چاہیے اور ہو سکتا ہے۔ اس طرح وہ پیچھا بھی چھوڑ دے۔ ورنہ اس نے تو ہر تفریح کا مزہ غارت کر رکھا تھا۔

بی۔ اے کے بعد ثناء نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا تھا۔ اگرچہ سہیل بھی اسی یونیورسٹی میں تھا مگر یہ اس کا فائنل ایئر تھا۔

سہیل کے ماں باپ نے ثناء کو مانگ لیا۔ انکار کون کرتا جبکہ یہ ثناء کی خواہش تھی۔

منگنی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ فوزیہ یہ منگنی دھوم دھام سے کرنا چاہتی تھی۔ سارا دن گھر میں ثناء اور سہیل کی باتیں ہوتیں۔

ایسے میں صباء اکثر عمر کا سوچتی کہ اب کیا ہو گا۔ وہ بھی ساری عمر اپنی آنٹی کی طرح تنہائی کی آگ میں جلے گا۔ کیونکہ اس نے کہا تھا۔ ثناء میری اپنی خواہش تھی۔ ان ہی دنوں جب منگنی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ عمر ترقی کر کے میجر کے عہدے پر فائز ہو گیا۔

پہلے تو عمر نے صباء کو فون کرنا چاہا۔ مگر چونکہ ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے وہ لاہور آ رہا تھا۔ سوچا آنٹی کو سرپرائز دے گا میٹنگ کچھ دیر سے ختم ہوئی۔ عمر نے پہلے تو سوچا واپس چلا جائے مگر پھر آنٹی کا خیال لیے وہ ان کے پاس چلا آیا۔ جیسے ہی اس نے صباء کے کمرے میں قدم رکھا تو وہ کوئی دھوبی گھاٹ نظر آیا۔ کپڑوں کا ایک ڈھیر تھا اور صباء پریس کر رہی تھی۔

''تم......'' وہ عمر کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ ''اچانک کیسے آنا ہوا؟'' وہ استری بند کر کے اٹھیں تو عمر بولا۔

''ہوں تو آپ کے کمر درد کی وجہ یہ مشقت ہے۔''

''ارے بیٹا! مشقت کیسی، بس کپڑے ہی تو استری کرتی ہوں۔ دراصل فارغ بیٹھے بیٹھے بور ہو جاتی ہوں۔''

''مجھے بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں آنٹی یہاں رہنے کی کوئی نہ کوئی قیمت تو دینی ہے آپ کو۔'' عمر کی آواز بھیگ گئی۔

''ارے چھوڑو اسے، یہ بتاؤ نہ کوئی فون نہ اطلاع تم اچانک کیسے چلے آئے۔ اب کھڑے کیوں ہو، آؤ بیٹھو۔''

''نہیں آنٹی جان! آپ بیٹھیں میں کپڑے پریس کروں گا۔'' وہ وہیں زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ پھر صباء روکتی رہ گئی مگر وہ نہ مانا کپڑے پریس کرنے کے ساتھ ساتھ وہ باتیں بھی کرتا رہا تا کہ آنٹی کا دھیان بٹا رہے۔ آنٹی جو اس کے اچانک آنے سے نروس ہو گئی تھیں۔ تاہم خود اس کا اپنا دل چاہا سارے کپڑے جلا دے مگر نزلہ پھر آنٹی پر گرتا۔ اس لیے خاموشی سے سارے کپڑے پریس کیے اور دو گھنٹے ضائع ہو گئے وہ کپڑوں سے فارغ ہوا تو صباء چائے بنا لائی اور چائے پیتے ہوئے عمر نے میجر ہونے کی خوشخبری سنائی۔

''سچ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے مگر......'' صباء کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔

''مگر کیا آنٹی جان؟'' عمر نے کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' صباء نے چھپانا چاہا۔

''آپ کو میری قسم آنٹی! بتائیے کیا بات ہے؟'' عمر نے ضد کی۔

''تمہیں معلوم ہے عمر! ثناء کی منگنی سہیل سے ہو رہی ہے۔''

''تو ٹھیک ہے، ہونے دیجیے۔ ہمارا کیا جاتا ہے۔ یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔''

''مگر عمر......'' صباء نے دکھی ہو کر اسے دیکھا۔ ''تمہاری وہ خواہش یہ خواہشیں انسان کو جیتے جی مار دیتی ہیں۔ میں جانتی ہوں بیٹا! کاش میں تمہارے لیے کچھ کر سکتی۔'' آنٹی کو افسردہ دیکھ کر عمر تڑپ اٹھا۔

''میری نہیں آنٹی جان! اپنی کہیے۔ یہ آپ کی خواہش تھی۔ مجھے آپ کی قسم آنٹی! میں تو ثناء کی صورت سے بھی نفرت کرتا ہوں مگر جب آپ نے کہا تو...... تو آپ کی خواہش تو میرے لیے عبادت کا درجہ رکھتی ہے اور میں اس کی تکمیل میں لگ گیا۔ ورنہ ثناء چیز کیا ہے، ثناء سے زیادہ اچھی، اچھی تو خیر...... وہ ہے ہی نہیں۔ ثناء سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں اس دنیا میں موجود ہیں۔ ظاہری حُسن پر بے وقوف مرد مرتے ہیں۔ میں ان مردوں میں سے نہیں ہوں اور پھر ابھی تو ایک عمر پڑی ہے ان باتوں کے لیے۔''

''اوہ شکر ہے عمر! تم نے میری طرح یہ احمقانہ خواہش نہیں کی۔'' صباء نے اداسی سے کہا۔

عمر نے بغور انہیں دیکھا اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ''خواہش کوئی احمقانہ نہیں ہوتی آنٹی جان! خواہش اور یادیں تو بڑی قیمتی چیز ہوتی ہیں۔ ان خواہشوں اور یادوں کے سہارے انسان آس کے دیپ جلائے زندگی گزار دیتا ہے، صباء چونک کر اسے دیکھنے لگی تو وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ''اب مجھے اجازت دیجیے آنٹی ورنہ دیر ہو جائے گی۔''

''اتنی رات ہو رہی ہے، ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم رات یہیں رک جاؤ۔''

''نہیں آنٹی جان! یہ میجر رک نہیں سکتا اسے ابھی جانا ہے۔'' عمر نے کہا تو صباء نے اجازت دے دی۔

رضوان نے ثناء کی منگنی میں سب بہنوں کو بلایا تھا۔ سوائے فرحت اور راحت کے

کیونکہ وہ دونوں امریکہ میں تھیں اور فوزیہ نے بھی ان لوگوں کو بلانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ کیونکہ جو اس نے چاہا تھا وہ ہو گیا تھا اور فوزیہ خود بھی منگنی کا ہنگامہ ان لوگوں کو دکھانا چاہتی تھی۔ سارا گھر نئے سرے سے سجایا گیا تھا۔ لائیٹنگ ایسی زبردست کی گئی تھی گویا منگنی نہیں شادی ہو۔ مہمانوں کی آمد چار بجے شروع ہوئی تھی۔ سب سے پہلے آنے والی مہمان پروین تھی۔ ساتھ صرف عمر فاروق تھا۔ کرنل انور کم ہی آتے تھے۔ سب لوگوں سے مل کر وہ سیدھا صباء کے کمرے میں آیا اور صباء کو دیکھتے ہی عمر نے شور مچا دیا۔

''کمال ہے آنٹی! آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں جبکہ آپ کو سب سے پہلے تیار ہونا چاہیے تھا۔''

''بس بیٹا ہونے لگی ہوں۔'' صباء نے کہا اور عمر باہر آ گیا۔ وہ چاہتا تھا ثناء سے ایک آدھی ملاقات ہو جائے اور اس کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔ ثناء اپنے کمرے میں جا رہی تھی۔ عمر کو دیکھا تو خود ہی رک گئی پھر ہنس کر بولی۔

''اچھا تو تم بھی آئے ہو۔ بڑی ہمت کی بات ہے ورنہ.....''

''ہاں، بات تو واقعی ہمت کی ہے۔ اس لیے مس رضوان کہ میں اب بھی مایوس نہیں ہوں۔ یوں بھی کہتے ہیں مایوسی گناہ ہوتی ہے۔ پھر ڈیئر منگنی ہی تو ہو رہی ہے تمہاری۔''

''کیا مطلب؟'' ثناء نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے کون سی شادی ہو رہی ہے اور منگنیاں تو ہوتی رہتی ہیں اور ٹوٹ بھی جاتی ہیں۔'' عمر نے شرارت سے اسے دیکھا۔

''بکواس مت کرو، تم ضرورت سے زیادہ ڈھیٹ ہو۔'' ثناء نے غصے سے کہا۔

''اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔'' عمر نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی۔'' ثناء نے آگے بڑھنا چاہا۔

''ویسے تمہارے لیے ایک انفرمیشن ہے۔'' عمر نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟'' ثناء نے بے ساختہ پوچھا۔

''میں کیپٹن سے میجر ہو گیا ہوں۔'' عمر دلکش انداز میں مسکرایا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' ثناء نے لاپرواہی سے اسے دیکھا۔ ''مگر اس عہدے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری حیثیت تو آج بھی وہی ہے۔ یعنی صفر۔''

''واقعی۔'' عمر نے تھوڑا سا حیران ہو کر پوچھا۔

''لکھ کر دوں گی تو یقین کرو گے۔'' وہ اپنی دوستوں کو دیکھ کر چپ ہو گئی اور عمر باہر لان میں آ گیا۔

''بھائی جان! آپ یہاں بیٹھے ہیں؟'' نومی نے عمر کو اکیلے دیکھ کر پوچھا۔ اس گھر میں وہ واحد فرد تھا جو عمر سے بات کر لیتا تھا۔ اس کی اگر عمر سے دوستی نہیں تھی تو دشمنی بھی نہ تھی۔

''ہاں یار! میں یہاں بیٹھا ہوں، تمہیں کوئی اعتراض ہے؟'' عمر نے ہنس کر پوچھا۔

اتنے میں فومی نے آواز دی اور نومی بغیر جواب دیئے چلا گیا اور عمر، سہیل کے بارے میں سوچنے لگا۔ وہ یقیناً لکی تھا۔ اپنی منزل کو بڑی آسانی سے پا گیا تھا اور عمر ہزار کوششوں کے باوجود ناکام رہا۔ ''خیر ایک طرح سے یہ بھی اچھا ہوا جس کی صورت دیکھنا مجھے پسند نہیں۔ اس کا عمر بھر کا ساتھ کتنی اذیت دیتا۔'' عمر نے سوچا اور مطمئن ہو گیا۔

''لو بھئی صباء تمہاری خواہش تو درمیان ہی میں رہ گئی۔ ثناء بجائے عمر کی دلہن بننے کے کسی اور کی دلہن بن گئی۔'' پروین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''جہاں کسی کا نصیب ہوتا ہے وہاں رشتہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ مجھے دکھ تو ہے مگر خیر میرے عمر کے لیے لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔ ہو سکتا ہے ہمیں ثناء سے اچھی لڑکی مل جائے۔'' صباء نے کہا۔

''اچھا بھئی تم تیار ہو جاؤ۔ میں ذرا باہر کی رونقیں دیکھوں۔ بڑی زبردست تیاری کی ہے بھابی نے۔'' پروین باہر آئی تو زاہدہ آ چکی تھی۔

''ارے آپا! آپ اکیلی آئی ہیں کیا؟'' پروین نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھئی، تم تو جانتی ہو یہاں کوئی سیدھے منہ بات تو کرتا نہیں۔ سچی بات ہے ہمارے تو بھائی کا گھر ہے۔ ہمیں تو ہر حال میں آنا ہے اور سب کچھ برداشت کرنا ہے۔ مگر آج کل کے بچے کہاں یہ سب کچھ دیکھتے ہیں یا برداشت کرتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہتی ہیں آپا! مگر آج تو بھابی کا موڈ بڑا خوشگوار ہے۔ آپ سے نہیں ملیں، مجھے تو بڑی اپنائیت سے ملیں۔ میں نے مبارک باد دی اور کہا بڑی زبردست تیاری کی ہے آپ نے۔ مسکرا کر بولیں۔ ''بھئی میری ایک ہی تو بیٹی ہے۔ کوئی چھ نہیں اور پھر اس کا باپ کماتا ہے۔ میں تو جی بھر کر ارمان نکالوں گی۔''

''اس نے اتنی بڑی بات کہی اور تم کہتی ہو اس کا موڈ خوشگوار ہے۔'' زاہدہ نفرت سے بولی۔ ''میری سمجھ میں یہ نہیں آتا جن کی ایک بیٹی ہوتی ہے وہ اس قدر اتراتے کیوں ہے۔ اگر ایک ہے تو ہم کیا کریں۔ اب دیکھو تمہارا عمر بھی تو اکیلا ہے۔'' اتنے میں نسرین بھی آ گئی اور تینوں بہنیں آہستہ آہستہ اسی موضوع پر باتیں کرتی رہیں۔

صباء نے فیروزی کلر کی ساڑی پہن کر سادہ جوڑا بنایا پھر وہ چپل پہن رہی تھی۔ جب عمر اندر داخل ہوا۔

''ارے واہ، آج تو ہماری آنٹی بہت کیوٹ، بہت سویٹ اور بہت بیوٹی فل......''

''بس کرو عمر!'' صباء نے ہنس کر کہا۔

''آنٹی! آپ کو معلوم ہے باہر ایک آدمی گجرے بیچ رہا ہے۔ میں آپ کے لیے لے کر آؤں۔'' پھر صباء کا جواب سنے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور کچھ دیر بعد پھولوں کے گجروں کے ساتھ اس کے سامنے تھا۔ ''لیجیے آنٹی! یہ پھولوں کے گجرے ہیں یہ جوڑے میں لگا لیجیے۔ بہت اچھے لگیں گے۔''

''پاگل ہو گئے ہو عمر! اس عمر میں کیا میں گجرے لگاتی اچھی لگتی ہوں۔''

''تو پھر کس عمر میں گجرے لگائے جاتے ہیں؟'' عمر نے ناراض ہو کر پوچھا۔ اتنے میں تینوں بہنیں اندر داخل ہوئیں تو عمر بولا۔

''ممی! آنٹی کے لیے میں یہ گجرے لایا تھا اور یہ لگا نہیں رہیں۔''

''کیوں صباء! گجرے کیوں نہیں لگا رہی ہو لاؤ میں لگا دوں۔'' پروین نے پیار سے کہا۔

''پروین! تم بھی بچوں والی باتیں کرتی ہو۔ اس عمر میں، میں گجرے......'' صباء نے ذرا غصے سے کہا۔

''آنٹی! مما تو رات کی ہر تقریب میں گجرے لگاتی ہیں۔'' عمر نے کہا تو پروین بولی۔

''اور کیا، بھلا گجرے کا عمر سے کیا تعلق؟'' اس نے گجرے صباء کے لگا دیئے۔

''اب آنٹی کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔'' عمر نے تعریف کی۔

''اور کیا......'' سب بہنوں نے ایک ساتھ کہا تو صباء مسکرا دی۔ باہر آئی تو رضوان کھڑے تھے۔ صباء کو دیکھا تو بولے۔

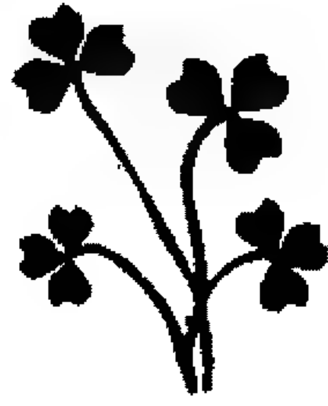
''ارے واہ، آج تو ہماری بہنا بہت پیاری لگ رہی ہے۔ کیا ثناء کے پاس جا رہی

ہو؟'' صباء کا ثناء کے پاس جانے کا موڈ تو نہیں تھا مگر جب رضوان نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی ہوئی مسکراتی ہوئی ثناء کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

ثناء کی سہیلیاں اسے تیار کر رہی تھیں۔ صباء کو دیکھ کر سب نے ادب سے سلام کیا اور صباء جواب دیتے ہوئے بولی۔

''اچھا بھئی تم لوگ دلہن کو اچھی طرح تیار کر لو میں پھر آ جاؤں گی۔'' پھر وہ مسکراتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔ ابھی اس نے دروازے سے پہلا قدم باہر نکالا ہی تھا جب ثناء کی سہیلیوں نے سوال کیا۔

''ارے بھئی، یہ پیاری سی ہستی کون تھیں؟''



"تم نہیں جانتیں؟ یہی تو ہیں میری کنواری پھپھو۔" ثناء کے لہجے میں طنز تھا۔

"کیا یہ تمہاری پھپھو تھیں؟" سب نے حیرت سے کہا۔

"کیوں، یقین نہیں آیا۔ یہی تو ہیں میری سب سے بڑی دشمن۔"

"مگر ثناء! انہوں نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"پتہ نہیں، شاید کسی نے لفٹ نہ دی ہو، کسی کو پسند نہ آئی ہوں اور اب ہمارے دل کا بوجھ بن کر بیٹھی ہیں۔ خوبصورت ہوتیں تو کوئی لے بھی جاتا مگر......"

"خیر ثناء اب اتنی بری بھی نہیں ہیں اور جوانی میں تو کہتے ہیں گدھی بھی خوبصورت لگتی ہے۔ تمہاری پھپھو تو پھر عورت تھیں۔ شادی نہ کرنے کی کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے۔ کوئی لو وغیرہ کا چکر یا پھر......"

"دفعہ کرو، گولی مارو وجہ کو۔" ثناء نفرت سے بولی۔ "تم نے دیکھا نہیں کیسے گجرے لگا کر بن ٹھن کر آئی تھیں، جیسے میری نہیں۔ ان کی منگنی ہو رہی ہو، بے چاری اس لیے بن ٹھن کر پھر رہی ہیں کہ شاید......بس نہیں چلتا ورنہ تو شاید سہیل ہی......" ثناء کی آواز میں زہر گھلا ہوا تھا۔ صباء کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی سب سہیلیاں صباء کے بارے میں رائے زنی کرنے لگیں۔ ان سب کو صباء سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی اور صباء......؟

دروازے کے باہر کھڑی صباء کو یوں لگا جیسے جسم میں جان ہی نہ رہی ہو۔ وہ بمشکل اپنے بے جان وجود کو گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے تک لائی۔ بے وقت آنسو ضبط کرتے ہوئے لباس تبدیل کیا۔ گجرے نوچ کر پھینک دیئے اور بے دم سی مسہری پر لیٹ گئی۔ باہر کیا کیا ہنگامہ ہوا، اس کو کچھ خبر نہ تھی وہ تو اس کے بعد باہر ہی نہ نکلی تھی۔ اندر لیٹی، باہر ابھرنے

والے قہقہے اور ہنسی کی آوازیں سنتی رہی۔

گیارہ بجے کے قریب سب مہمان رخصت ہو گئے تو عمر ان کے کمرے میں آیا۔

"آپ نے کھانا کھا لیا آنٹی۔"

"ہاں بیٹا۔" صباء نے نارمل انداز میں کہا۔

"ارے یہ آپ کو کیا ہوا۔ آنٹی طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟" عمر نے غور سے انہیں دیکھا۔ وہ لباس تبدیل کر چکی تھیں اور اس وقت زرد ہوتے چہرے کے ساتھ بستر پر لیٹی تھیں۔

صباء کا جی چاہا آج زور، زور سے روئے اور چیخ چیخ کر کہے عمر، پلیز عمر کہیں سے جا کر کسی طرح اپنے انکل آفاق کو ڈھونڈ لاؤ۔ ان کو بلا لاؤ میرے پاس۔ اب میں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ میں ایسی باتیں اور نہیں سن سکتی۔ مجھ میں اب اور حوصلہ نہیں ہے۔ خدا کے واسطے انہیں بلا لاؤ۔ مگر وہ ایسا سوچ سکتی تھی، کہہ نہیں سکتی تھیں۔ عمر ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھ رہا تھا اور صباء عمر کی نظروں کو پہچانتی تھی۔ اس لیے آہستہ سے بولی۔

"مہمانوں کے شور کی وجہ سے سر میں درد ہونے لگا ہے۔ عمر! تم تو جانتے ہو میں اس شور کی عادی نہیں۔"

"میں آپ کا سر دبا دوں؟" عمر نے فوراً پوچھا۔

"نہیں عمر! تم جاؤ میں اس وقت صرف سونا چاہتی ہوں۔" صباء نے کہا اور عمر مشکوک انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے باہر چلا گیا۔

اگلی صبح بچے کھچے مہمانوں کے ساتھ عمر اور پروین بھی چلے گئے اور صباء اکیلی سوچنے کے لیے اپنے کمرے میں رہ گئی۔ رہ رہ کر ثناء کی باتیں یاد آتیں اور وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیتی۔ یوں بھی منگنی کے بعد وہ اپنے کمرے سے کم ہی باہر نکلتی تھی۔ نہ جانے کیوں دل میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا۔

ایک ہفتہ یونہی گزر گیا۔ صباء نے کسی کو اپنی طبیعت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ کسی نے اس کا حال پوچھا۔

ایک روز صباء نے طبیعت کو بہتر محسوس کیا اور باہر برآمدے میں نکل آئی۔

"ممی! کتنی پیاری تصویریں آئی ہیں۔" ثناء کہہ رہی تھی۔

''ہاں بھئی۔'' فوزیہ نے ایک نظر تصویروں پر ڈالی اور نہ جانے کیا رکھنے اندر چلی گئی۔

''ثناء ذرا اِدھر لاؤ۔ میں بھی دیکھوں کیسی ہیں تمہاری تصویریں۔'' بے ساختہ صباء کے منہ سے نکل گیا۔ ثناء نے کچھ سوچا پھر چپ چاپ آ کر البم اسے دے گئی۔ تصویریں واقعی بہت خوبصورت تھیں۔ ثناء دلہن بنی اور بھی پیاری لگ رہی تھی۔ سہیل بھی اچھا لگ رہا تھا۔

ابھی صباء دیکھ رہی تھی کہ فوزیہ باہر آتے ہوئے بولی۔

''لاؤ ثناء البم میں بھی تو دیکھوں۔''

''ممی! البم تو پھپھو صباء دیکھ رہی ہیں۔''

''ارے اس کو کیوں دیا البم؟'' فوزیہ نے تیزی سے کہا۔ اس کو بھلا ڈر کس کا تھا جو وہ آہستہ بات کرتی۔

''کیوں ممی؟'' ثناء نے حیرت سے پوچھا۔

''ارے خواہ مخواہ تصویریں دیکھ کر آہیں بھرے گی۔ خود جو دلہن نہیں بن سکی۔ چل جا جلدی سے البم لے کر آ۔'' ماں کی بات سن کر ثناء تیزی سے آئی قبل اس کے وہ البم چھین کر لے جاتی، صباء نے خود ہی اس کی جانب بڑھا دیا۔ تاہم اٹھتے اٹھتے اس نے فوزیہ کی غصیلی آواز سنی۔

''تم نے دیکھا نہیں منگنی کے روز کیسے سر منہ لپیٹے اپنے کمرے میں ہی پڑی رہی۔ حوصلہ نہیں تھا نہ تمہیں دلہن کے روپ میں دیکھنے کا۔ خیر ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا ہے۔''

فوزیہ کی بات کا ثناء نے کوئی جواب دیا یا کوئی وضاحت کی یا نہیں، صباء نے کچھ نہ سنا تقریباً بھاگ کر اپنے کمرے میں داخل ہوگئی۔ دل میں درد اس شدت سے اٹھا تھا کہ مارے تکلیف کے وہ نڈھال ہو رہی تھی۔ بس اچانک ہی اس کا جی چاہا گھر چھوڑ کر بلکہ یہ لوگ، یہ شہر، یہ ہنگامے، سب کچھ چھوڑ کر کسی جنگل میں جا کر بسیرا کر لے۔ مگر کیسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

پھر بہت دن اس کی طبیعت خراب رہی۔ ماں تو جیسے اس کے وجود سے ہی لاعلم تھی۔ وہ جیتی تھی یا مرتی تھی ماں کو اس بات سے کوئی سروکار نہیں تھا اور رضوان منگنی کے فوراً بعد بزنس کے سلسلے میں ملک سے باہر چلے گئے تھے اور ابھی تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔

کافی روز بعد اس کی طبیعت ایک بار پھر سنبھلی تو وہ شام کے وقت کمرے کی چار دیواری

سے نکل کر لان میں آ بیٹھی۔ سامنے ہی ماں کھڑی تھی۔ لمحہ بھر کو زرد، زرد سی صباء کو غور سے دیکھا، دو قدم آگے بڑھیں کچھ کہنا چاہا مگر اچانک نہ جانے کیا سوچ کر اندر چلی گئیں اور اتنے میں فوزیہ آ گئی۔ صباء کو دیکھتے ہی تلخی سے بولی۔

''ایک کام تمہارے سپرد کیا تھا تو وہ بھی ڈھنگ سے نہیں کیا۔''

''بھابی میری طبیعت ٹھیک نہیں۔'' صباء نے نحیف سی آواز میں کہا۔

''ہونہہ! طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں پوچھتی ہوں تمہاری طبیعت کو ہوا کیا۔ ارے منگنی ثناء کی ہوئی ہے تمہیں کیا دکھ ہو گیا جو کمرے میں ہی بند ہو کر رہ گئی ہو، تمہاری ماں زندہ ہے اگر ابھی تک شوق ہے تو خود ماں سے کہہ دیا ہوتا خواہ مخواہ دوسروں کو دیکھ کر کیوں......'' قبل اس کے فوزیہ کچھ اور کہتی صباء جلدی سے اپنے کمرے میں آئی وہ درد جو اتنے دنوں بعد ٹھہرا تھا۔ ایک بار پھر شروع ہو گیا اور اب صباء مزید ثناء اور فوزیہ کا سامنا کرنے کا حوصلہ خود میں نہیں پا رہی تھی۔ ان کی نظروں میں طنز تھا، نفرت تھی اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ ملازمہ ہی اسے کھانا دے جاتی اور خالی برتن لے جاتی، نہ کوئی حال پوچھنے والا تھا اور نہ کوئی تیمار داری کرنے والا۔ صباء ضبط کرتے کرتے نڈھال ہو چکی تھی۔ دل کا درد اب ہر بندھن توڑ کر باہر آنا چاہتا تھا اور صباء اس عمر میں رسوائی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بہت ضبط کیا لیکن بات جب حد سے بڑھی۔ جب جسم اور جان کا رشتہ چھوٹنے لگا تو اس نے عمر کو فون کیا۔ ایک وہی تو تھا اس کا اپنا دکھ درد سمجھنے والا اور صباء اسی کے پاس جانا چاہتی تھی۔

''جی آنٹی جان! میں میجر عمر فاروق آپ کا بیٹا بول رہا ہوں۔ فرمایئے کیسے یاد کیا؟'' عمر نے چہک کر پوچھا۔

''عمر......عمر۔'' صباء سے بات نہ ہو رہی تھی۔

''جی آنٹی بولیے۔'' عمر کچھ سمجھ نہ سکا۔

''عمر! تم آ کر مجھے لے جاؤ ورنہ، ورنہ عمر......'' صباء رو دینے کے قریب تھی۔

''آنٹی! میری اچھی آنٹی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' عمر کی ساری خوشی صباء کی آواز سنتے ہی ختم ہو گئی اور وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

''تم جلدی سے آ جاؤ عمر! ورنہ...... ورنہ میں مر جاؤں گی۔'' آخر صباء رو دی۔

''نہیں آنٹی جان۔'' عمر تڑپ کر بولا۔ ''یہ کیسی بری باتیں کر رہی ہیں آپ؟''

''میں سچ کہہ رہی ہوں عمر! تم فوراً آ جاؤ نہیں تو......''

''پلیز آنٹی۔'' عمر سسک کر بولا۔ ''آپ کو کچھ نہیں ہو گا اور اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو میں معاف نہیں کروں گا۔ ہاں آنٹی، آپ کا عمر کسی کو معاف نہیں کرے گا۔'' پھر اس نے فون بند کر دیا اور صباء جلدی جلدی اپنا ضروری سامان بیگ میں رکھنے لگی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی فون بند کرتے ہی عمر جس حال میں بھی ہو گا۔ فوراً چل پڑے گا۔

ٹھیک تین گھنٹے بعد عمر ان کے سامنے تھا۔ ایک نظر غور سے کمزور سی صباء کو دیکھا پھر کمرے میں نظر ڈالی۔ سائیڈ میز پر بیگ تیار پڑا تھا اور صباء بھی جوتا پہنے چادر اوڑھے تیار کھڑی تھی۔

''آنٹی جان آپ!''

''عمر پلیز، کوئی سوال مت کرنا۔ جلدی سے مجھے یہاں سے لے چلو، اس جگہ سے دور لے چلو، میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے باہر کی کھلی فضا میں لے چلو۔'' صباء نے بمشکل کہا اور آنسو ضبط کرنے لگی۔ آنسو جو پلکوں سے باہر آنا چاہتے تھے۔ عمر نے بغور ان کو دیکھا اور سختی سے ہونٹ بھینچ لیے پھر ایک ہاتھ سے بیگ اٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور دوسرے ہاتھ سے صباء کو سہارا دیتا ہوا باہر آیا۔ اسی دوران میں صباء کئی بار لڑکھڑا کر گرنے لگی۔ مگر عمر نے ہر بار اسے سنبھال لیا۔ عمر کو حیرت تھی۔ اس بار صباء نے گھر کے کسی بھی فرد سے ملنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

باہر نکلتے ہوئے صباء نے ثناء کو دیکھا اور مارے کرب کے ایک دم آنکھیں بند کر لیں۔ ان کی اس حرکت پر عمر نے پہلے آنٹی کو دیکھا پھر ثناء کو اور اگلے ہی لمحے جلدی سے باہر آ گیا۔ بیگ پچھلی سیٹ پر پھینک کر اس نے صباء کو اپنے ساتھ بٹھایا اور سفر شروع ہو گیا۔

کچھ دیر یونہی خاموشی سے راستہ کٹ گیا۔ کیونکہ صباء نے اسے سوال کرنے سے منع کیا تھا۔ مگر عمر اب اور برداشت خود میں نہیں پا رہا تھا۔

''یہ اچانک آپ کی طبیعت کو کیا ہوا آنٹی جان! آپ ایک دم اتنی کمزور کیسے ہو گئیں۔ ابھی دو ہفتے قبل ہی تو میں آپ کو بالکل ہشاش بشاش چھوڑ کر گیا تھا؟'' عمر نے بغور اس کا زرد چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

''پتہ نہیں عمر! یہ اچانک مجھے کیا ہو گیا ہے۔ سینے میں دم گھٹتا ہے۔ ایک دم گھبراہٹ

اور وحشت سی ہونے لگتی ہے شاید زندگی کے دن پورے ہونے والے.....''

''نہیں آنٹی جان! پلیز ایسی باتیں مت کیجیے۔ جب تک میں زندہ ہوں آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔'' عمر نے ان کی بات کاٹ کر کہا۔

''بیٹا! اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ دن تو بالآخر پورے ہو ہی جاتے ہیں۔ آخر سب ہی کو جانا ہوتا ہے۔ میں نے بھی بہت جی لیا۔ اب عزت کے ساتھ موت آ جائے۔'' صباء کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

عمر نے جیپ روک دی۔ جسم کے اندر خون کھولنے لگا۔ اس نے غور سے آنٹی کو دیکھا اور پوچھا۔ ''سچ بتایئے آنٹی! کسی نے آپ سے کچھ کہا ہے کیا؟''

''نہیں بیٹا، کوئی مجھے کیوں کچھ کہنے لگا۔ بس چلتے چلتے تھک سی گئی ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے آنٹی کہ آپ تھک گئی ہیں کیونکہ آپ اکیلی چلتی رہی ہیں مگر اب آپ کا بیٹا آپ کا سہارا ہے۔ اب آپ کو چلنے کی ضرورت نہیں۔ اب آپ صرف آرام کریں گی۔ آپ کو پتہ نہیں آنٹی! جب آپ اداس ہوتی ہیں یا روتی ہیں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے، آپ خوش رہا کیجیے۔'' عمر نے کہا تو صباء زبردستی کی مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجاتی ہوئی بولی۔

''عمر! اتنے بڑے ہو گئے ہو مگر باتیں اب بھی بچوں جیسی کرتے ہو۔''

''آپ کا بچہ جو ٹھہرا۔'' عمر نے ہنس کر کہا تو صباء طمانیت سے مسکرا دی۔



عمر کی ساری توجہ آج کل صباء پر مرکوز تھی۔ آنٹی کی تیمارداری میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ اسے اٹھتے بیٹھتے اب صباء کی فکر تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ صباء ڈاکٹری علاج کے بغیر ہی اچھی ہو گئی کیونکہ بہن اور بہنوئی بھی اس کا ہر طرح سے خیال رکھتے تھے۔ خاص کر پروین تو ایک لمحہ کے لیے بھی اسے اکیلا نہ چھوڑتی تھی۔ بازار جانا ہوتا یا پھر کسی تقریب میں صباء کے انکار کے باوجود وہ زبردستی اسے ساتھ لے جاتی اور یوں صباء، فوزیہ اور ثناء کی سب باتیں بھول گئی۔

بزنس ٹور سے واپسی پر رضوان نے صباء کو فون کیا اور یوں چلے جانے کی وجہ پوچھی تو صباء بولی۔

”بھائی جان! طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی سوچا کیوں نہ آب و ہوا تبدیل کرلوں۔“

”کیوں، طبیعت کو اچانک کیا ہوا؟“ رضوان نے فکرمندی سے پوچھا۔

”کچھ خاص نہیں ہوا۔ بس یونہی گھبراہٹ سی ہوتی تھی۔ آپ فکر مت کریں اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”او کے بھئی۔ جلدی واپس آ جانا۔“ رضوان نے تاکید کی۔

”جی بہتر بھائی جان!“ صباء نے کہا اور فون بند کر دیا۔

چار ماہ گزر گئے مگر صباء واپس نہ گئی۔ اس کا واپس جانے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ روزانہ رات کو وہ عمر کے ساتھ دیر تک سڑکوں پر پیدل گھومتی، باتیں کرتی اور عمر بھی اس کا دل بہلانے کے لیے نہ جانے کہاں کہاں کے قصے اسے سناتا تھا۔ یہ اب ان کا روز کا معمول تھا۔ شاید یہی وجہ تھی اس کی طبیعت بالکل ٹھیک ہوگئی تھی۔ صحت بھی اچھی ہوگئی تھی۔ جیسے کبھی دل میں درد ہوا ہی نہیں تھا اور اس کی اچھی صحت دیکھ کر عمر نے بھی اطمینان کا سانس لیا تھا۔ ورنہ اس کو بھی ایک عجیب سی فکر رہنے لگی تھی۔

پانچواں ماہ شروع ہوا تو رضوان نے پھر فون کیا۔

”کیوں صباء کیا اب تمہیں بھائی کی عزت کا بھی کچھ خیال نہیں؟ اب پانچواں مہینہ ہو رہا ہے۔ فوراً واپس آ جاؤ اگر تم کل تک واپس نہ آئیں تو پرسوں تک میں خود تمہیں لینے آ جاؤں گا۔“

”آپ کو آنے کی ضرورت نہیں بھائی جان! میں کل خود ہی آ جاؤں گی۔“ اس کے سینے کے اندر دل بڑے زور سے دھڑک اٹھا تھا۔ اس کا جی چاہا تھا انکار کر دے مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔

”او۔ کے اب مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔“ رضوان نے کہا اور فون بند کر دیا۔ وہ شاید جلدی میں تھے۔ مگر صباء ہاتھ میں ریسیور تھامے وہیں کھڑی رہی۔ دل کسی طرح بھی واپس جانے کے لیے رضامند نہیں تھا۔ واپسی کے خیال کے ساتھ ہی ثناء اور فوزیہ کی طنز بھری نظریں اور باتیں یاد آ گئیں۔ جن کا اب وہ مزید سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی مگر جانا تو تھا۔

”اچھا بھائی جان آپ کی خاطر ایک بار پھر آ جاؤں گی۔“ اس نے ریسیور رکھا اور عمر جو کافی دیر سے ان کے چہرے کے بدلتے ہوئے تاثرات دیکھ رہا تھا۔ قریب چلا آیا۔

”آنٹی جان! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”عمر، میں کل لاہور جاؤں گی۔“ صباء نے بمشکل کہا۔

”یہ اچانک پروگرام کیسا؟“ عمر نے غور سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا ابھی کچھ دیر قبل وہ رضوان ماموں سے فون پر بات کر رہی تھیں یقیناً انہوں نے ہی آنے کو کہا ہوگا۔

”عمر! تمہارے ماموں کہہ رہے تھے مجھے اب واپس آ جانا چاہیے۔“ وہ چپ ہوگئیں کچھ دیر سوچتی رہیں پھر کہا۔ ”بہت دن رہ لیے میرے خیال میں اب مجھے چلے جانا چاہیے۔“

”آنٹی جان! آپ کا یہ گھر ہے۔ آپ ساری زندگی اب یہیں رہیں گی۔“ عمر نے ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی اذیت دیکھ کر بڑے دکھ سے کہا۔ صباء ضبط کرنا چاہتی تھی مگر دل میں اٹھنے والے درد نے اسے بے قابو کر دیا تھا۔ وہ ہذیانی انداز میں چلائی۔

”نہیں نہیں عمر! میں اب یہاں نہیں رہ سکتی...... تم نہیں جانتے عمر! تم نہیں جانتے بیٹا! اپنی زندگی کا ایک اہم فیصلہ میں نے خود کیا تھا۔ ہاں بیٹا! صرف ایک فیصلہ میں نے خود کیا تھا اس کی سزا یہ ملی کہ باقی سارے فیصلے لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ میں تو...... میں تو کچھ نہیں ہوں عمر! میری تو کوئی حیثیت نہیں ہے۔ مجھے جانا ہوگا۔“ وہ سسکتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ہاں عمر!“ اور پھر دل دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ جھکتی چلی گئیں۔ مگر گرنے سے پہلے ہی عمر بڑی مشکل سے انہیں سنبھالتا ہوا ان کے کمرے میں لایا۔ مگر اب وہ ہوش میں نہ تھیں۔ عمر نے انہیں بیڈ پر لٹانے کے بعد سب سے پہلے ڈاکٹر کو فون کیا اور پھر بھاگ کر ممی، پاپا کو بلا لایا۔

”عمر! کیا ہوگیا ہے تمہاری آنٹی کو، اب تو یہ بالکل ٹھیک ہو چکی تھیں مگر یہ اچانک بے ہوش کیسے ہوگئیں؟“ پروین نے تشویش بھری نظروں سے بہن کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ممی! مجھے تو خود کچھ خبر نہیں۔“ عمر جان بوجھ کر سب کچھ چھپا گیا۔

”ڈاکٹر کو فون کیا ہے؟“

”جی پاپا! سب سے پہلے ڈاکٹر کو ہی فون کیا تھا۔ وہ بس آتے ہی ہوں گے۔“ عمر باہر چلا گیا، کچھ دیر بعد ہی وہ ڈاکٹر کو ساتھ لیے اندر داخل ہوا۔

ڈاکٹر نے اچھی طرح چیک اپ کیا۔ دو انجکشن دیئے پھر دوائی لکھتے ہوئے بولا۔

''کرنل صاحب! ان کے دل و دماغ پر کوئی بوجھ ہے یہ بہت پریشان ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو ان کو اٹیک ہوسکتا ہے جو جان لیوا بھی ثابت ہوسکتا ہے۔''

''اوہ نو۔'' کرنل نے پریشانی سے کہا۔ ''آپ کچھ کیجیے ڈاکٹر صاحب!''

''فی الحال میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ان کو جیسے ہی ہوش آئے آپ ان کا خاص خیال رکھیں۔ ان کو تنہا ہرگز نہ چھوڑیں، ہرممکن طریقے سے خوش رکھنے کی کوشش کیجیے۔ کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہونی چاہیے۔''

''اس کی آپ فکر مت کریں ڈاکٹر صاحب! میں آنٹی کو اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔'' عمر نے جلدی سے کہا۔

''اور شاید یہ ان کے حق میں بہتر بھی ہو۔'' ڈاکٹر نے سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد ڈاکٹر ضروری ہدایات دیتا ہوا چلا گیا اور وہ تینوں پریشان سے صباء کے بارے میں تشویش کا اظہار کرنے لگے کرنل کچھ زیادہ ہی پریشان تھے۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی بولے۔

''میرے خیال میں صباء کی طبیعت جیسے ہی کچھ بہتر ہو اسے لاہور بھیج دینا چاہیے۔ خدانخواستہ اگر اسے یہاں کچھ ہو گیا تو؟''

''پاپا! آنٹی لاہور نہیں جائیں گی۔'' عمر فوراً ان کی بات کاٹ کر بولا۔ ''آنٹی یہیں رہیں گی ہمارے ساتھ اور آپ ان کی طبیعت کی فکر مت کریں۔ مجھے معلوم ہے وہ اچھی ہو جائیں گی۔''

''بیٹا! تم میری بات نہیں سمجھے، تمہاری آنٹی یہاں ہمارے پاس ایک امانت ہیں اور خدانخواستہ اگر انہیں کچھ ہو جاتا ہے تو خاندان میں بہت سی باتیں ہوسکتی ہیں۔ اسی لیے میں کہتا ہوں۔

''پاپا! آنٹی یہاں کسی کی امانت نہیں ہیں۔ یہ گھر ہے ان کا اپنا۔''

''کیا مطلب؟'' کرنل نے حیران ہو کر بیٹے کو دیکھا۔ ''یہ گھر تمہاری ممی کا ہے وہ مہمان ہے اور مہمان کو جانا......''

''وہ مہمان نہیں ہیں۔'' عمر نے تلخی سے ایک بار پھر ان کی بات کاٹ دی۔ ''یہ گھر ان کا بھی ہے۔ میں انہیں یہاں سے ہرگز نہیں جانے دوں گا وہ اب ہمیشہ یہیں رہیں گی ہمارے ساتھ۔''

''او کے جیسے تمہاری مرضی۔'' کرنل نے آہستہ سے کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہ تو اچھی طرح جانتے تھے کہ عمر اپنی آنٹی کو بہت چاہتا ہے۔ مگر وہ اس حد تک جائے گا یہ ان کو خبر نہ تھی۔ باپ کو اٹھتے دیکھ کر عمر ماں سے مخاطب ہوا۔

''ممی آپ بھی جا کر آرام کریں۔ آنٹی کے پاس میں رہوں گا۔'' پروین کچھ دیر صباء کی طرف پریشانی سے دیکھتی رہی پھر کرنل کے ساتھ ہی چلی گئی۔

عمر، صباء کے قریب ہی کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا آخر وہ کیا حالات تھے جن سے مجبور ہو کر آنٹی نے گھر چھوڑا۔ کیا فوزیہ نے کچھ کہا تھا؟ خیر اگر کہا بھی تھا تو یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ کیونکہ وہ اکثر و بیشتر کچھ نہ کچھ کہتی ہی رہتی تھی۔ اس کے بعد رہ جاتی ہے ثناء! تو کیا ثناء نے کوئی بدتمیزی کی تھی؟ مگر ثناء کی بدتمیزیوں کو آنٹی اہمیت کب دیتی تھیں اور رضوان ماموں تو گھر پہ تھے ہی نہیں۔ پھر آخر کیا وجہ تھی جو واپس جانے کا سن کر آنٹی کی طبیعت پھر بگڑ گئی تھی؟

بہر حال اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ اب کے آنٹی اچھی ہو جائیں تو وہ براہِ راست ماموں سے بات کرے گا۔ وہ ان سے خود کہہ دے گا کہ آنٹی اب یہیں ہمارے پاس رہیں گی۔''

انہی خیالات میں گم وہ نہ جانے کتنی دیر تک یونہی بیٹھا رہا۔

صباء کو صبح کے قریب ہوش آیا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی پہلی نظر عمر پر پڑی تھی جو آنکھیں بند کیے کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ عمر جس کو اس نے جنم نہیں دیا تھا مگر جو سگے بیٹوں سے بڑھ کر اس کی خدمت میں لگا رہتا تھا۔ اسے اٹھتے بیٹھتے آنٹی کا ہی خیال رہتا تھا۔ صباء اس پر جتنا بھی فخر کرتی کم تھا۔ وہ کچھ دیر اس کے معصوم چہرے کو دیکھتی رہی پھر نحیف آواز میں کہا۔ ''عمر بیٹا پانی تو پلانا۔''

اور اونگھتا ہوا عمر چونک پڑا۔ فوراً اٹھ کر گلاس میں پانی بھرا اور آنٹی کے قریب آ گیا۔ اس نے خود اپنے ہاتھ سے صباء کو پانی پلایا پھر بیڈ پر ہی ایک طرف بیٹھ گیا۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے آنٹی؟'' عمر نے بغور صباء کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ جن کی آنکھوں میں ویرانی اور...... چہرے پر زردی تھی۔

''اب ٹھیک ہوں۔'' صباء نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''مگر یہ اچانک کیا ہو گیا تھا آپ کو آنٹی؟'' عمر نے انجان بن کر پوچھا۔

"پتہ نہیں بیٹا! یہ دل نہ جانے اب کیا چاہتا ہے؟" صباء نے افسردگی سے کہا۔

"ایک بات آپ اچھی طرح سن لیں آنٹی جان! مجھے آپ کے دل یا کسی اور معاملات سے کوئی غرض نہیں۔ بس ایک بات آپ کو سمجھا دوں کہ میں آپ کو لاہور نہیں جانے دوں گا۔ اب آپ یہیں رہیں گی۔ ہمارے ساتھ اور آپ کو میری یہ بات ماننا ہوگی۔ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گا۔" عمر نے منہ پھلا کر کہا۔

"میں کب جانا چاہتی ہوں بیٹا! مگر اس کے باوجود جانا تو ہوگا۔" صباء نے آہستہ سے کہا۔

"آنٹی! میں نے کہہ دیا نا، آپ نہیں جائیں گی۔" عمر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"تم میری مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتے عمر! تمہیں نہیں معلوم۔" صباء نے بے بسی سے عمر کی طرف دیکھا۔

"بس کیجیے آنٹی جان۔" عمر نے ان کی بات کاٹ دی۔ "ان مجبوریوں نے آپ سے آپ کی ہر خوشی، ہر خواہش تو چھین لی اب اگر آپ نے مزید ان مجبوریوں کا ساتھ دیا تو زندگی ختم ہو جائے گی اور میں ایسا نہیں چاہتا کیونکہ آپ کو زندہ رہنا ہے۔ میرے لیے میری خوشیوں کے لیے۔" عمر نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"عمر پلیز! تم ابھی کچھ نہیں سمجھ سکتے۔ تم ابھی بچے ہو ایسی بڑی بڑی باتیں مت کرو۔" صباء نے ڈانٹ کر کہا۔

"میں سب کچھ سمجھتا ہوں آنٹی! میں میجر فاروق ہوں اور میجر بچے نہیں ہوتے۔ ذمہ دار آفیسر ہوتے ہیں۔" اس نے کچھ اس انداز میں کہا کہ صباء مسکرا پڑی اور وہ ناراض، ناراض سامی پاپا کو اطلاع کرنے چلا گیا۔

صباء کو پورے ہوش وحواس میں دیکھ کر پروین ہی نہیں کرنل بھی خوش ہو گئے تھے۔

"کیوں بھئی یہ تمہیں اچانک سب کو پریشان کرنے کی کیا سوجھی تھی؟" کرنل نے مسکرا کر پوچھا تو صباء بھی مسکرا دی۔

"جانتی ہو صباء! رات تمہارے بیٹے نے بڑے تلخ لہجے میں مجھ سے بات کی ہے۔" کرنل نے عمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھئی عمر! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟" صباء نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"سوری پاپا آپ نے ایسا محسوس کیا۔" عمر نے کرنل سے معذرت کی، پھر صباء سے مخاطب ہوا۔ "آنٹی، پتہ نہیں کیا بات ہے۔ جب آپ کو کچھ ہوتا ہے تو میں اپنے حواس میں نہیں رہتا۔" اس نے سر جھکا کر اپنی کمزوری کا اعتراف کیا اور صباء اس کے اس انداز پر نہال ہو گئی۔ پھر عمر نے ناشتہ بھی آنٹی کے ساتھ کیا اور آج ڈیوٹی پر جانے سے صاف انکار کر دیا۔

"عمر! اب میری طبیعت بہتر ہے تم ڈیوٹی پر چلے جاؤ۔" صباء نے آہستہ سے کہا۔

"طبیعت تو آپ کی اس وقت بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ جب ماموں رضوان کا فون آیا تھا۔" عمر نے یاد دلایا۔

"وہ اور بات تھی۔" صباء اسے گھورتی ہوئی بولی۔

"جی ہاں! وہ اور بات تھی اور یہ اور بات ہے۔ اسی لیے تو میں ڈیوٹی پر نہیں جا رہا۔"

"عمر! تم پٹ جاؤ گے مجھ سے۔" صباء نے غصے سے کہا تو پروین بولی۔

"تم جاؤ عمر! صباء کے پاس میں جو ہوں۔" عمر نے ناراض ہو کر آنٹی کو دیکھا اور کرنل کے ساتھ باہر نکل گیا۔

"کیا کل فون آیا تھا بھائی جان کا؟" ان دونوں کے جاتے ہی پروین نے پوچھا۔

"ہاں۔" صباء نے مختصراً کہا۔

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"یہی کہ مجھے اب واپس آ جانا چاہیے۔" صباء نے اکتائے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"ہوں......" پروین کچھ سوچنے لگی۔ پھر کچھ دیر بعد بولی۔ "صباء! تم نے بتایا نہیں، مگر تمہارے اندر کوئی بات ضرور ہے۔ یہ اچانک تمہیں کیا ہو جاتا ہے۔ دیکھو صباء تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہے مجھ سے کہہ دو اس طرح بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

"دل میں بھلا کیا ہو سکتا ہے؟" صباء نے افسردگی سے کہا۔ اب وہ پروین کو کیا بتاتی۔ وہ باتیں جو ثناء نے کہی تھیں اور جو فوزیہ نے کہی تھیں۔ وہ باتیں اس قابل کب تھیں کہ کسی کو بتائی جائیں۔ تاہم بہن کو مطمئن کرنے کے لیے وہ بولی۔

"پروین! یونہی دل گھبراتا ہے۔ لگتا ہے جیسے دل سینہ پھاڑ کر باہر آ جائے گا۔"

"اس کی کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔ تم نہیں بتانا چاہتیں تو اور بات ہے۔" پروین نے

شکوہ کیا۔

''اور وجہ کیا ہو سکتی ہے۔'' صباء نے ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بس یوں لگتا ہے جیسے زندگی کے دن پورے ہو گئے ہوں۔ شاید عمر کے سر پر سہرا دیکھنا میرے نصیب میں نہیں۔'' صباء کی آواز اور آنکھیں بھیگ گئیں۔

''ایسا مت کہو صباء! تم نے خود ہی ثناء کا کہا تھا۔ اگر ثناء کا معاملہ بیچ میں نہ آیا ہوتا تو میں عمر کی منگنی کب کی کر چکی ہوتی۔ مگر خیر قسمت میں جو لکھا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے اور تم اتنی مایوسی کی باتیں مت کرو۔ انشاء اللہ تم عمر کے سر پر سہرا دیکھو گی۔'' پروین نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ اتنے میں عمر بھی آ گیا۔ شاید ڈیوٹی ادھوری چھوڑ کر آیا تھا۔

''ممی! کیا دنیا میں صرف ثناء ہی ایک لڑکی تھی۔ اور کوئی لڑکی نہیں رہی۔'' وہ کرسی کھینچ کر صباء کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔

''یہ کس نے کہا، میرے بیٹے کے لیے بھلا لڑکیوں کی کمی ہے۔ جس طرف نکل جاؤ لڑکیاں ہی لڑکیاں ملیں۔''

''ممی! آپ بہت ساری لڑکیوں کی بات چھوڑیں۔ صرف ایک لڑکی کی بات کریں۔''

''ارے ہاں صباء! یاد آیا۔ نسرین کی عائشہ، عمر کے ساتھ اچھی لگے گی تمہارا کیا خیال ہے؟''

''ہاں۔'' صباء چونک پڑی۔ ''حیرت ہے عائشہ کا تو مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ اب کے میں لاہور گئی تو نسرین سے ضرور بات کروں گی۔ بے شک عائشہ، ثناء جتنی خوبصورت نہیں لیکن بہت نیک بچی ہے مگر...... مگر میں لاہور کیسے جاؤں گی۔'' دل کی بات بے ساختہ زبان پر آ گئی۔

''آنٹی! آپ لاہور نہیں جائیں گی۔'' عمر فوراً ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ''اور یہ مایوسی کی باتیں بھی مت کیا کیجیے۔ آپ زندہ رہیں گی میرے لیے کیوں ممی؟'' اس نے ماں سے تائید چاہی۔

''ہاں بیٹا!'' پروین نہ جانے کیا سوچ کر رو دی۔ اور صباء نے آنکھیں موند لیں۔ دل کی کیفیت چھپانے کے لیے۔

''ممی! آنٹی، نسرین کے گھر آپ اور پاپا چلے جائیں اور دیر مت کریں بلکہ کل ہی چلی جائیں۔'' عمر شاید خود بھی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اور پروین نے فوراً حامی بھر لی۔

اس رات وہ دیر تک آنٹی کے ساتھ سڑکیں ناپتے ہوئے صرف اپنی شادی کے

موضوع پر ہی باتیں کرتا رہا۔

''مما کیا پہنیں گی؟ آنٹی آپ کیا پہنیں گی اور یہ کہ میں دولہا بن کر کیسا لگوں گا؟'' اس کی ان باتوں کا مقصد آنٹی کو خوش رکھنا تھا۔



مگر قسمت میں کچھ اور ہی لکھا تھا اگلے روز رضوان آئے تو عمر گھر پر نہیں تھا۔ پروین اور کرنل نے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ صباء کو اپنے ساتھ لے گئے یہ کہتے ہوئے کہ صباء کے بغیر خود ان کا گھر سونا لگتا ہے۔

اس شام عمر ڈیوٹی سے واپس نہیں آیا تھا۔

عمر نے یہ سوچ کر گھر فون کیا تھا کہ کہیں آنٹی اس کی غیر حاضری سے پریشان نہ ہوں مگر وہاں آنٹی ہوتیں تو پریشان ہوتیں۔ پروین نے اسے صباء کے جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

''یہ آپ نے کیا کیا ممی! یہ تو بہت برا ہوا آپ، ممی آپ کسی بھی طریقے سے آنٹی کو روک سکتی تھیں مگر آپ نے کوشش ہی نہ کی ہو گی۔'' عمر نے احتجاج کیا۔

''مجھے الزام مت دو بیٹا۔ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی مگر صباء بھائی کو دیکھ کر خود ہی تیار ہو گئی۔ پھر میں کیا کرتی۔'' پروین کے کچھ اور کہنے سے قبل ہی عمر نے فون بند کر دیا۔

پھر اس نے فوراً لاہور کے نمبر ڈائل کیے اور صباء کی آواز سن کر طویل سانس لے کر رہ گیا۔

''میں جانتی تھی۔'' صباء، عمر کے بولنے سے قبل ہی بولی۔ ''تم فون ضرور کرو گے اسی لیے فون اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔''

''مگر آنٹی جان! آپ کیوں آئیں مجھ سے ملے بغیر جبکہ میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ آپ نہیں جائیں گی پھر بھی آپ چلی آئیں کیوں؟'' عمر نے شکوہ کیا۔

''دیکھو بیٹا!'' صباء اپنے لہجے کو نارمل بناتی ہوئی بولی۔ ''آنے والوں کو جانا ہوتا ہے اور جانے والوں کو آنا ہوتا ہے پھر شکوہ کیسا؟''

''مگر آنٹی جان! آپ نہ آنے والوں میں تھیں نہ جانے والوں میں۔ یہ تو آپ کا، آپ کے بیٹے کا گھر تھا پھر آپ کیوں چلی آئیں۔ آنٹی! آپ نے اچھا نہیں کیا۔'' عمر سسک پڑا۔

اور صباء جو ضبط کرنے کی پوری کوشش میں تھی۔ ضبط نہ کر سکی اور خود بھی سسک پڑی۔ ''گھر تمہیں معلوم ہے عمر۔ میرا بھی ایک گھر ہے۔ بہت دور اور عمر! تمہیں پتہ ہے اس میں شاہ زیب اور شہر بانو رہتے ہیں۔ وہ دونوں بالکل تنہا ہیں اس گھر میں۔ مگر عمر وہ میرے پاس نہیں آ سکتے۔ میں انہیں چھوڑ نہیں سکتی اب وہ مجھے بلاتے ہیں۔ عمر وہ دونوں تنہا ہیں۔ میں ان کے پاس چلی جاؤں گی۔ ہاں عمر! میں ان کے پاس چلی جاؤں گی کیونکہ میں انہیں چھونا چاہتی ہوں۔ محسوس کرنا چاہتی ہوں، ہاں میں چلی جاؤں گی۔'' وہ پاگلوں کی طرح چلائیں۔ ''اور تمہیں پتہ ہے عمر! آفاق بھی تو مجھے بلا رہے ہیں۔ وہ بہت بیمار ہیں عمر۔ وہ بھی شاہ زیب اور شاہر بانو کے پاس جانا چاہتے ہیں اور میں، میں کیا کروں، ان کو تنہا کیسے چھوڑ دوں؟'' صباء پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

عمر فرط حیرت سے ریسیور تھامے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ جو عمر بھر خاموش رہی تھیں۔ آج نہ جانے کیسی کیسی داستانیں سنانا چاہتی تھیں۔ عمر یہ تو جانتا تھا کہ وہ ثناء کا نام شہر بانو رکھنا چاہتی تھیں۔ مگر فوزیہ نے اپنی من مانی کی لیکن یہ شاہ زیب کون تھا۔ کیا فومی، نومی میں سے آنٹی کسی کا نام رکھنا چاہ رہی تھیں اور یہ انکل آفاق جب بلانے کی عمر تھی تو بلایا نہیں، اب کیوں بلا رہے ہیں مگر وہ چونک پڑا۔ آنٹی نے یہ بھی تو کہا ہے، وہ بھی شاہ زیب اور شہر بانو کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ وہ صباء کی باتیں سننے کے ساتھ ساتھ سوچے جا رہا تھا۔ گویا اس دردناک کہانی کا اختتام اب ہونے لگا ہے اور جب صباء رونے لگی تو وہ گلوگیر آواز میں بولا۔

''پلیز آنٹی! پلیز آنٹی جان دور بیٹھ کر مت روئیں جہاں میں آپ کے آنسو بھی نہ پونچھ سکوں۔ رہی آفاق انکل والی بات تو آنٹی، جب میں آپ کے قریب ہوتا تھا۔ جب میں آپ سے اشاروں کنایوں میں بات پوچھا کرتا تھا۔ تب آپ نے کچھ نہ بتایا اور نہ کبھی روئیں، لیکن آنٹی! آج جب میں آپ سے دور ہوں۔ آپ کے پاس فوراً نہیں آ سکتا تو آج آپ رو رہی ہیں۔ آنٹی! آپ کسی شہر بانو اور شاہ زیب کی تلاش میں ملک عدم نہیں جائیں گی۔ آنٹی جان! میں، میں آپ کا بیٹا، آپ سے وعدہ کرتا ہوں۔ جب خدا مجھے بیٹا دے گا تو میں اس کا نام بلکہ آپ اس کا نام شاہ زیب رکھیں گی اور جب بیٹی ہو گی تو ہم اس کا نام شہر بانو رکھیں گے اور ہاں آنٹی وہ اس گھر میں اکیلے نہیں رہیں گے۔ وہ ہمارے پاس رہیں

گے۔ آپ روئیں مت آنٹی میں انکل......'' عمر کی سمجھ میں نہ آیا وہ آفاق کے بارے میں کن لفظوں میں بات کرے، کہے تو کیا کہے؟

دفعتاً صباء کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، سنبھلتی ہوئی بولی۔ ''عمر مجھے معاف کرنا اپنے ساتھ ساتھ میں نے تمہیں بھی پریشان کیا۔ یقین کرو اب میں بالکل ٹھیک ہوں تم میری فکر مت کرو۔'' عمر کو مطمئن کرنے کے لیے وہ خواہ مخواہ ہنس دی۔

''اچھا آنٹی! آپ وعدہ کریں کہ روئیں گی نہیں اور میں ذرا فارغ ہو جاؤں تو پھر انکل آفاق......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی کیونکہ اس کا ایک دوست آ گیا تھا۔ اسے دیکھ کر عمر نے گفتگو کا سلسلہ خدا حافظ کہہ کر منقطع کر دیا تھا۔

ٹیلی فون کا سلسلہ اچانک منقطع ہوا تو صباء نے اطمینان کی گہری سانس لی، یہ سوچ کر کہ عمر نہ جانے آفاق کے بارے میں کیا کہنے والا تھا۔ مجھے اپنے حواس میں رہنا چاہیے تھا مگر حواس میں رہنے والا وقت کب تھا۔

ریسیور رکھ کر اس نے سینے پر رکھا ہوا خط اٹھایا اور کھول کر ایک بار پھر پڑھنے لگی۔

وہ ٹھیک چار بجے گھر پہنچ گئی تھی۔ کچن کے قریب ہی کھڑی ثناء اور فوزیہ باتیں کر رہی تھیں۔ صباء کو دیکھتے ہی فوزیہ نفرت سے بولی۔

''بغیر سلام دعا کے گئی تو یوں تھیں گویا کبھی لوٹ کر نہیں آنا۔ اونہہ۔'' وہ بڑبڑاتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

ثناء نے ہونٹ سکیڑ کر اسے دیکھا اور لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دیتے ہوئے رخ پھیر لیا۔ فومی برآمدے میں ہی بیٹھا رہا۔ اس کی آمد کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ ماں نظر ہی نہ آئی۔ شاید اپنے کمرے میں تھی۔ البتہ نومی نہ جانے کہاں سے نکل کر سامنے آیا اور آگے بڑھ کر صباء کا بیگ پکڑتے ہوئے بولا۔

''پھپھو جان! اس بار تو آپ نے بہت دن لگا دیئے اور سب کو تو چھوڑیئے میری یاد بھی نہیں آئی تھی۔'' وہ لاڈ سے پوچھ رہا تھا۔

''آئی تھی بیٹا...... آئی کیوں نہیں تھی۔'' صباء نے مسکرا کر اس کی پیشانی چوم لی اور پھر اپنے کمرے میں پہنچی تو سائیڈ ٹیبل پر جانی پہچانی تحریر اس کی منتظر تھی۔ وہ کتنی دیر پاگلوں کی طرح کھڑی خط کو دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ نہ جانے یہ خط کب آیا ہو۔ سارے گھر کی

ڈاک ملازمہ چیک کرتی تھی اور جس جس کی ڈاک ہوتی اس کو دے دیتی چونکہ صباء گھر پر نہیں تھی۔ اس لیے دو ماہ قبل آنے والے اس خط کو وہ صباء کے کمرے میں ہی رکھ گئی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے خط اٹھایا اور جب کھولا تو آغاز ہمیشہ کی طرح ایک خوبصورت شعر سے کیا گیا تھا۔

نہ ڈھلی ہے شام الم ابھی ، نہ سحر ہماری سحر ہوئی
تجھے کیا بتائیں کہ زندگی جو ہوئی تو کیسے بسر ہوئی

''ڈیئر صباء آداب!

طویل عرصہ کے بعد تم یہ خط دیکھ کر حیران تو ضرور ہو گی اور شاید ڈسٹرب بھی ہو جاؤ یقین مانو میں تمہیں حیران کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تم نے جس طرح چپ چاپ مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا تھا۔ میں اسی طرح چپ چاپ اس دنیا سے جانا چاہتا تھا کیونکہ اب زندگی کی شام ہو رہی ہے مگر نہ جانے کیوں یہ دل ہے کہ تمہیں دیکھنے کی خواہش کیے جا رہا ہے۔ سچ کہو، ہے نہ یہ دل کا پاگل پن، وہ ہستی جس نے اتنے عرصہ میں ایک بار خیریت دریافت کرنے کی بھی کوشش نہ کی ہو۔ اس کے باوجود رخصت کے ان لمحوں میں اسے دیکھنے کی یہ خواہش پاگل پن ہی تو ہے اور یہ دل تو سدا سے ایسا ہی دیوانہ رہا ہے۔ اگر یہ دیوانہ نہ ہوتا تو اب تک تمہاری یاد کو دل سے لگا کر کیوں رکھتا۔ صباء تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ تم سے بچھڑ کر جو زندگی میں نے گزاری ہے وہ زندگی کب تھی۔ جب انسان کی سب خواہشیں، ساری آرزوئیں، ارمان اور جذبے مر جائیں تو پھر زندہ رہنا مُردوں سے بھی بدتر ہوتا ہے مگر میں نہ جانے کیوں پھر بھی زندہ رہا۔ شاید اس لیے کہ یہ تمہاری خواہش تھی۔

میری ساری زندگی کو بے ثمر اس نے کیا
عمر میری تھی مگر اس کو بسر اس نے کیا

ہاں صباء! یہ عمر میری کب تھی۔ یہ تمہاری زندگی تھی۔ جو اب ختم ہو رہی ہے۔ اب تو میں سال چھوڑ، مہینوں کا بھی نہیں ہفتوں کا مہمان ہوں

مجھے بتاؤ کیا میری اس آخری خواہش کی کوئی اہمیت ہے۔ ایک بار صباء تم میرے پاس آ جاؤ یا مجھے لکھو میں تمہارے پاس آ جاؤں کیونکہ میں چاہتا ہوں مجھے موت تمہارے پاس، تمہارے بازوؤں میں آئے تا کہ میں اس کی اذیت محسوس نہ کر سکوں۔ پلیز صباء! انکار مت کرنا، یہ ایک مرتے ہوئے انسان کی آخری خواہش ہے اور مجھے امید ہے تم مجھے مایوس نہیں کرو گی۔ اور کیا لکھوں؟ کیا پوچھوں؟ تم کچھ نہیں بتاؤ گی۔ مگر میں تمہارے یہاں نہ ہوتے ہوئے بھی تمہاری تنہائیوں اور ویرانیوں کو محسوس کر سکتا ہوں۔ تمہاری اذیت کا اندازہ کر سکتا ہوں اور مجھے یقین ہے جن لوگوں کے لیے تم نے یہ ایثار کیا ہو گا۔ وہ بھی تمہیں کوئی خاص صلہ نہ دے سکے ہوں گے۔ خیر یہ باتیں تو اب پرانی ہوئیں زندگی گزر ہی گئی۔ اچھی یا بری، ہرگز نہیں کہوں گا کیونکہ تمہاری یادوں کا قیمتی سرمایہ میرے پاس تھا۔ اچھا اب تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ اس لیے خط ختم کر رہا ہوں ورنہ دل میں جو باتیں ہیں وہ کبھی بھی ختم نہ ہوں، خط ملتے ہی جواب لکھنا یا فون کرنا۔

لمحہ لمحہ تمہاری آہٹ کا منتظر۔ تمہارا آفاق۔''

خط پڑھ کر صباء کی جو حالت ہوئی تھی، اس کا اسی کو اندازہ تھا۔ اس کے وجود کا رواں رواں، آفاق کو پکار رہا تھا۔ ایک بار پھر سینے میں نا قابل برداشت درد اٹھا تھا۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے آفاق کو فون کیا۔ گھنٹی بجتی رہی مگر کسی نے ریسیور نہ اٹھایا اس کے دل میں خوف کی ایک لہر اٹھی۔ ''کیا آفاق اس کو چھوڑ کر چلا گیا؟ نہیں نہیں۔'' اس نے بے چین دل کو سنبھالتے ہوئے تسلی دی۔ ہو سکتا ہے وہ ہوسپٹل گیا ہو یا پھر باہر کہیں، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا سوچ رہی ہے۔ کیا کر رہی ہے۔ اس کے چاروں طرف ایک دھندسی چھا رہی تھی۔ تاہم وہ ہوش کی دنیا میں رہنا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کو یقین تھا۔ یا عمر خود آئے گا نہیں تو فون کرے گا ورنہ دل بے قرار پر خط پڑھ کر جو گزری تھی اور گزر رہی تھی وہ نا قابل برداشت تھی اور اب، اب تو عمر کا فون آ چکا تھا۔ اب کسی بات کا خطرہ نہ تھا۔ صباء نے ضبط کے تمام بند توڑ دیئے۔ کئی بار خط پڑھا، چوما اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ''ہائے آفاق تم کیسے ہو؟ کس حال میں ہو......؟'' وہ یہی بات سوچے جا رہی تھی۔ ایسی اذیت ناک رات تو وہ بھی

نہیں تھی۔ جب اس نے آفاق کو ہمیشہ کے لیے ٹھکرا دیا تھا تب شاید دل کو یہ تسلی دی تھی کہ وہ میرا نہیں تو کیا زندہ تو ہے مگر اب وہ تڑپ رہی تھی، سسک رہی تھی۔ آفاق تم اس عمر میں میری رسوائیاں کیوں چاہتے ہو میں تمہارے پاس نہیں آ سکتی مگر تمہارے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتی۔

اس نے کئی بار فون کیا مگر سلسلہ نہ ملا اور وہ تڑپتی اور سسکتی رہی۔

وہ بھی مرنا چاہتی تھی۔ نہ جانے کیوں اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ آفاق اس دنیا میں نہیں رہا۔ رات تڑپتے اور سسکنے کی نذر ہو گئی۔ کوئی پاس نہ تھا جو تسلی دیتا، سمجھاتا مگر کوئی کیسے سمجھاتا جبکہ اسے خود یقین تھا۔ آفاق اب اس دنیا میں نہیں۔



صبح ملازمہ ناشتہ لے کر آئی تو صباء بے ہوش تھی۔ وہ کچھ دیر پریشان سی کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر بھاگ کر باہر آئی۔ رضوان آفس جا رہے تھے۔ ملازمہ کی آواز سن کر رک گئے۔

''کیا بات ہے؟'' فوزیہ نے گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''یوں آواز دے کر کیوں روکا صاحب کو؟''

''وہ جی صباء بی بی بے ہوش پڑی ہیں۔'' ملازمہ نے ڈرتے ڈرتے بتایا جیسے یہ بھی کوئی جرم ہو۔

''کیا؟'' رضوان چونک کر بولے۔

''آپ جائیں، میں دیکھتی ہوں۔'' فوزیہ نے ملازمہ کو گھورتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''نہیں، میں خود دیکھوں گا۔'' رضوان جلدی سے صباء کے کمرے میں آئے اور بہن کی حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ صباء بے سدھ سی اپنے بیڈ پر پڑی تھی۔ رنگت ایسی زرد ہو رہی تھی۔ جیسے رات میں سارا خون کسی نے نچوڑ لیا ہو چہرے پر آنسوؤں کے نشان تھے۔ آنکھوں کی سوجن بتا رہی تھی کہ وہ رات بھر روتی بھی رہی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر رکھا تھا۔ مٹھی بند تھی اور بند مٹھی میں کوئی کاغذ تھا۔ رضوان نے آگے بڑھ کر نبض دیکھتے ہوئے مٹھی کھولی تو اس میں ایک خط تھا۔ رضوان نے اسے فوراً پکڑ کر کوٹ کی جیب میں ڈالا اور ڈاکٹر کو فون کیا۔

فون کر کے وہ بہن کو دیکھنے لگے ذہن میں ایک ہی بات تھی۔ نہ جانے کیا وجہ تھی جو

وہ آنا نہیں چاہتی تھی میں کیوں زبردستی اسے لے آیا۔ وہ پریشانی سے سوچتے رہے اور اتنے میں ڈاکٹر بھی آ گیا۔ اچھی طرح چیک اپ کے بعد وہ رضوان کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔ ''انہیں ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔''

''کیا؟'' رضوان مزید پریشان ہو گئے مگر فوزیہ یونہی منا بنائے کھڑی رہی پھر ایک ڈاکٹر کی بجائے چار ڈاکٹر آ گئے سب اسے بچانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ پھر دن کے ایک بجے جیسے ہی اسے ہوش آیا۔ رضوان لپک کر اس کے قریب گئے۔ کیونکہ صباء کی مٹھی سے ملنے والا خط وہ اچھی طرح پڑھ چکے تھے۔

''صباء...... صباء آنکھیں کھولو۔'' انہوں نے تڑپتے ہوئے لہجے میں کہا تھا اور صباء نے ہمیشہ کی طرح ان کا کہا مان لیا، آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا اور گرم گرم آنسو رخساروں پر بہہ نکلے۔

''تم اچھی ہو جاؤ صباء پھر سب ٹھیک ہو جائے گا'' وہ پتہ نہیں اس سے کیا کہنا چاہتے تھے۔ کیا سمجھانا چاہتے تھے۔ مگر سمجھا نہ پا رہے تھے۔

صباء کچھ دیر آنکھیں کھولے ان کی آنکھوں میں جھانکتی رہی پھر گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور ڈاکٹروں نے اطلاع دے دی تھی کہ دوسرا اٹیک ہو چکا ہے اور یہ شدید خطرے کی بات تھی۔ رضوان نے طویل سانس لے کر ماں کو دیکھا جو پریشان کھڑی تھی اور کوئی دوسرا کمرے میں نہیں تھا۔ رضوان ابھی کسی کو اطلاع کر کے پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر رات نو بجے تیسرا اٹیک ہوا۔ اب بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ رضوان، نومی، سے بولے۔ ''جاؤ ثناء کو بلاؤ وہ سب کو اطلاع کر دے۔''

عمر جو پہلے ہی صباء کے جانے کی وجہ سے بے چین تھا فوراً گھر روانہ ہو گیا۔ وہ گھر دس بجے آیا تھا۔ جی چاہا ابھی آنٹی کے پاس جائے یا فون کرے کیونکہ دل ایک عجیب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ ابھی وہ فون کے قریب آیا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی اور اسے صباء کی خرابی طبع کی اطلاع مل گئی۔ فلائٹ کا وقت نہیں تھا وہ ممی کو لے کر جیپ میں روانہ ہوئے تو نہ جانے کیوں اس کو یوں لگ رہا تھا۔ جیسے وہ اب کبھی بھی صباء سے نہ مل سکے گا اور وہی ہوا۔ وہ آیا تو صباء رخصت ہو چکی تھی۔ بغیر اس سے کوئی بات کیے۔

صباء کی موت کی خبر سن کر اس کا دل صدمے سے پھٹنے لگا۔ جی چاہا خود بھی مر

جائے۔ آنٹی سے بچھڑنے کا تو اس نے کبھی خیال میں بھی نہ سوچا تھا اور اب اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا اس اتنے بڑے صدمے کا سامنا کیسے کرے۔ جی چاہا ثناء اور فوزیہ کو گولی مار دے اسے یقین تھا یہی دونوں صباء کی موت کی ذمہ دار ہیں مگر سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی وہ کچھ نہ کر سکا البتہ جب رضوان نے اسے گلے سے لگایا تو وہ تلخ ہو گیا۔

''اب تو آپ خوش ہیں ماموں جان! آپ نے بھی اپنی محبت کا معاوضہ وصول کر لیا۔ آخر آنٹی ہی کو کیوں چنا آپ سب نے امتحان کے لیے، وہ نہیں آنا چاہتی تھیں کیونکہ یہاں ان کو اپنی موت نظر آتی تھی۔ مگر آپ زبردستی لے آئے۔ اب میں کیا کروں؟'' عمر سسک پڑا۔

''صبر کرو بیٹا خدا کے کاموں میں کسی کا دخل نہیں۔'' رضوان نے عمر کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ حالانکہ خود ان کا دل چیخ چیخ کر انہیں قاتل کہہ رہا تھا۔

''ماموں جان! انہیں مرنے کے لیے مجبور کیا گیا ہے۔'' عمر نے ساری حقیقت ان کے گوش گزار کر دی کہ کیسے آنٹی نے اسے فون کیا تھا کہ ''مجھے آ کر لے جاؤ ورنہ میں مر جاؤں گی۔''

''مگر اس نے یہ سب کچھ مجھ سے کیوں نہ کہا۔'' رضوان دکھ سے بولے۔

''آپ سے پہلے کون سا وہ کچھ کہتی تھیں۔'' عمر بچوں کی طرح رو دیا۔



ثناء نے ڈائری بند کی اور رونے لگی۔ ہائے پھپھو جان یہ میں نے کیا جرم کیا ہے۔ آپ نے کیوں مجھے اتنی ڈھیل دے دی تھی۔

دل میں عجیب سی تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ روتی ہوئی پھر باہر لان میں آ گئی۔ ایک تو دسمبر کا مہینہ اس پر ہلکی ہلکی بارش بھی ہو رہی تھی۔ ثناء بارش میں کھڑی دل کی آگ بجھانے لگی کہ اچانک برآمدے کی لائٹ آن ہوئی پھر فوزیہ باہر آئی پریشانی سے بارش میں بھیگتی ہوئی ثناء کو دیکھا۔

''ثناء تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے تم اتنی رات گئے یہاں بارش میں کیوں بھیگ رہی ہو۔''

''ممی! کمرے میں گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ نیند نہ آئی تو میں باہر چلی آئی۔'' ثناء نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا۔

''کمرے میں گھبراہٹ ہو رہی تھی؟'' فوزیہ نے اسے دیکھتے ہوئے کہا پھر نفرت سے بولی۔ ''ارے وہ مرنے کے بعد بھی تمہارے پیچھے کیوں پڑ گئی ہے۔ خدا خدا کر کے اس کے منحوس وجود سے گھر پاک ہوا ہے اور اب وہ بھوت بن کر چلی آئی، چلو آؤ تم میرے کمرے میں آ جاؤ۔''

''نہیں ممی۔'' ثناء نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ ''کمرے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں۔'' وہ مزید ماں کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے بھاگ کر کمرے میں آئی اور پھر آج ہی ملنے والا خط کھول کر پڑھنے لگی وہ خط جس کو پڑھ کر وہ ایک ہی دن میں بلکہ ایک ہی لمحے میں اتنا بدل گئی تھی۔

''محترمہ صباء بھابی! آداب

آپ حیران تو ہوں گی کہ جب آپ نے شادی ہی نہیں کی تو پھر بھابی کیسے بن گئیں۔ کیونکہ ماں اور بھابی کا درجہ تو شادی کے بعد ہی ملتا ہے مگر میں آپ کو بھابی ہی کہوں گا۔ کیونکہ میرے دوست آفاق اور آپ نے جو زندگی ایک دوسرے کی نذر کی وہ ایسی ہی تھی۔ سنیے، آپ سے ملنے کی تڑپ لیے آفاق اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔ میں نہیں جانتا آپ نے خط کا جواب کیوں نہیں دیا۔ فون کیوں نہ کیا۔ آفاق کی آخری خواہش کی تکمیل کیوں نہ کی۔ مگر یہ ضرور آپ کو بتاتا چلوں وہ آخری لمحوں تک آپ کے قدموں کی آہٹ محسوس کرتے رہے۔ تڑپتے رہے اور پھر وہ کہانی ختم ہو گئی۔ جس کا آغاز بہت سال پہلے ایک آرٹ گیلری میں ہوا تھا۔ آپ کو یہ خط اس لیے لکھ رہا ہوں کہ آفاق نے اپنی تمام جائیداد اور بینک بیلنس آپ کے نام چھوڑا ہے میں ان کی ڈیڈ باڈی لے کر ۳۰ مارچ کو پاکستان آؤں گا۔ مجھے امید ہے آپ ایئر پورٹ پر موجود ہوں گی۔ اور اگر کسی وجہ سے ایئر پورٹ نہ آ سکیں تو گھر کا ایڈریس لکھ رہا ہوں۔

والسلام، آفاق کا دوست، وسیم''

ثناء نے خط بند کیا اور پھر ڈائری کے آخر میں لکھا ہوا قطعہ پڑھنے لگی۔ یہ قطعہ صباء نے اسلام آباد سے واپسی پر یعنی مرنے سے پہلے ایک رات قبل لکھا تھا اور اس ایک قطعہ

میں اس نے اپنی گزری ہوئی پوری زندگی کی عکاسی کی تھی۔ کتنی عجیب بات تھی۔ اس نے ڈائری کا آغاز بھی قطعے سے کیا تھا اور اختتام بھی۔ ثناء نے ایک نظر قطعے پر ڈالی لکھا تھا۔

زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں
میں نے پلکوں سے در یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

یہ تھی صباء کی زندگی کی آخری تحریر ثناء نے چوم کر آنکھوں سے لگائی اور پھر آفاق کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس کا انتقال دس مارچ کو ہوا تھا یعنی جس روز صبا اپنے بے چین دل کو سنبھالتے ہوئے اسلام آباد سے لاہور آئی تھی۔ اسی روز پیر کو آفاق ملک عدم کی تیاری کر چکا تھا اور اگلے روز گیارہ مارچ کو صباء بھی اس کی تلاش میں نکل گئی۔ ثناء نے ایک بار پھر خط کو پڑھا۔ ایئر پورٹ جانے کی تاریخ گزر چکی تھی۔ وہ اب گھر کا ایڈریس ہی تلاش کر سکتی تھی اور اس نے فیصلہ کیا وہ صبح وسیم کے گھر ضرور جائے گی اور مطمئن ہوگئی۔



رات جیسے تیسے کٹ گئی تھی اور جب اگلی صبح کا سورج طلوع ہوا تو ثناء بھی نئی سوچوں جذبوں کے ساتھ تیار ہو کر بیگ کاندھے پر ڈالے باہر آئی تو فوزیہ اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

''کیوں سنی، آج ناشتہ کرنے کا پروگرام نہیں؟''

''ممی! مجھے بھوک نہیں۔'' ثناء نے گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

''ناشتے میں بھوک کی کیا ضرورت، اور کچھ نہیں تو کم از کم چائے ہی پی لو۔'' فوزیہ کہتی رہ گئی۔ مگر ثناء ان کو نظر انداز کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اب وہ ممی کو کیا بتاتی کہ کل سے اس کا جینا دوبھر ہو چکا ہے۔ حلق میں گویا پھانس سی چبھ گئی ہے۔ یہ کیسی سزا تھی جو اس نے خود کو دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ خط پڑھتے ہی وہ بدل کیوں گئی تھی؟ شاید اس لیے کہ سچ کبھی نہ کبھی اپنا آپ منوا لیتا ہے۔ رہ رہ کر صباء نظروں کے سامنے گھومنے لگتی۔ اس کا دل چیخ چیخ کر فریاد کرنے لگتا کاش ایک بار صباء زندہ ہو جائے۔ مگر یہ ناممکن بات تھی۔

وسیم کا گھر تلاش کرنے میں کچھ زیادہ دقت نہ ہوئی تھی۔ کال بیل دبا کر کے وہ سوچنے لگی میں بات کیسے کروں گی۔ وسیم مجھے پھپھو کی ہمدرد سمجھے گا اور میں اسے یہ نہ بتا

سکوں گی کہ میں ہمدرد نہیں قاتل ہوں ان کی۔ میں نے انہیں مرنے پر مجبور کیا تھا۔

دروازہ کھلا ملازم نے اس کے بارے میں دریافت کیا اور واپس چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر آیا اور ثناء کو ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ثناء بیٹھ گئی تو ملازم ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ ثناء نے ایک نظر اسے دیکھا اور ڈرائنگ روم کا جائزہ لینے لگی۔ کافی کشادہ ڈرائنگ روم تھا۔ آمنے سامنے دو صوفے لگے تھے۔ ایک طرف چاندنی بچھا کر گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ دوسری سائیڈ پر دریچہ تھا۔ جس کے باہر عشق پیچاں کی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے نیلے پھول زندگی کا بھرپور اظہار کر رہے تھے۔ دریچے کے قریب ایک ایزی چیئر پڑی تھی۔ جس پر ''ساحر کی تلخیاں'' پڑی تھی۔ شاید کوئی ابھی ابھی پڑھتے ہوئے اٹھ کر گیا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت اور شاہکار پینٹنگ آویزاں تھیں۔

اچانک وسیم کمرے میں داخل ہوا اور ثناء چونکتے ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

''جی فرمایئے؟'' وسیم نے غور سے ثناء کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے ثناء رضوان کہتے ہیں اور میں صباء کی بھتیجی ہوں۔'' ثناء نے بمشکل یہ لفظ ادا کیے۔

''اچھا۔'' وسیم نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ کچھ دیر ہونٹ بھینچ کر سوچتا رہا پھر پوچھا۔ ''وہ خود کیوں نہیں آئیں۔''

''جی وہ۔'' آواز ثناء کے حلق میں پھنس گئی۔

وسیم نے اچٹتی نظر اس پر ڈالی اور کہا۔ ''مس! میرے پاس زیادہ وقت نہیں، میں نہیں جانتا وہ خود کیوں نہیں آئیں۔ بہر حال میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ وہی آئیں گی تو بات ہوگی۔''

''مگر وہ تو......'' ثناء نے ہاتھ ملتے ہوئے بھیگی آواز میں کہا۔ ''گیارہ مارچ کو ان کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے وہ نہیں آئیں وہ زندہ ہوتیں تو جس حال میں بھی ہوتیں خود ہی آتیں مگر وہ تو......'' ثناء آنسو ضبط کرنے لگی۔

''کیا واقعی؟'' وسیم کچھ دیر حیرت میں غوطہ زن رہا پھر پوچھا۔ ''کیا واقعی ان کا انتقال ہو گیا؟''

''جی ہاں۔'' ثناء نے دکھ سے کہا۔ ''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کا خط لیٹ ملا ورنہ میں خود ایئر پورٹ پر آتی اور...... اور اس ہستی کا دیدار کرتی جس کی خاطر

میری پھپھو نے اذیت بھری زندگی کا انتخاب کیا۔ آپ یقین کریں میں خود انہیں دیکھنا چاہتی تھی مگر......'' ثنا سسک پڑی کچھ دیر کے لیے ماحول پر خاموشی سی چھا گئی۔ دونوں اپنی، اپنی جگہ کچھ سوچنے لگے پھر وسیم ہی بولا۔

''اچھا تو اب آپ جائیداد کے سلسلے میں آئی ہوں گی۔''

''نہیں انکل۔'' ثناء نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔ ''مجھے پیسے کی ضرورت نہیں، خدا کا دیا ہمارے پاس سب کچھ ہے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔''

''پھر......؟'' وسیم نے ایک نظر اسے دیکھا۔

''دیکھیے میں تو انکل آفاق کی آخری آرام گاہ کا پتہ پوچھنے آئی ہوں اور اگر آپ ان کے بارے میں مزید کچھ بتا سکیں تو آپ کی مہربانی ہوگی۔''

وسیم نے کوئی جواب نہ دیا۔ خلا میں یوں گھورتا رہا جیسے ضبط کی کوشش کر رہا ہو۔ آخر طویل سانس لے کر بولا۔

''ان کی داستان ہجر سن کر اب تم کیا کرو گی؟ جو گزرنی تھی وہ گزر گئی۔ ان دونوں کی قسمت میں یہی کچھ لکھا تھا۔ آؤ قبرستان چلتے ہیں۔'' اور ثناء اٹھ کھڑی ہوئی۔

ثناء، وسیم کے ساتھ قبرستان آئی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ صباء کے پہلو میں آفاق کی قبر تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک قبر کو دیکھتی رہی۔ یقین ہی نہ آیا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر ایسا ہوا تھا اور اس وقت وہ اسی مقام پر کھڑی تھی۔

''انکل!'' وہ وسیم کو صباء کی قبر کا بتاتے ہوئے بولی۔ ''زندگی جن کے لیے ہجر کا پیغام تھی۔ موت ان کے لیے وصل کی راحت بن کر آئی۔ دنیا نے جن کو ملنے نہ دیا، موت نے ملا دیا۔ طویل جدائی کے بعد محبوب لوٹ کر آیا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا پھپھو ان کے استقبال کو موجود نہ ہوتیں۔ وہ تو ان کے آنے سے پہلے ہی یہاں پہنچ گئی تھیں۔ مجھے یقین ہے انکل آفاق کی روح انہیں یہاں دیکھ کر بہت خوش ہوئی ہو گی۔'' ثناء پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو وسیم بولا۔

''جانتی ہو بیٹی! آفاق کو کینسر ہو گیا تھا اور ان دنوں اس کی حالت دیکھنے کے قابل نہ تھی۔ آخری لمحوں میں وہ صباء کی دید کو بہت ترسا اس سلسلے میں اس نے صباء کو ایک خط بھی لکھا۔ مگر نہ جانے کیا مجبوری تھی جو صباء خط کا جواب تک نہ دے سکی۔''

مجبوری، ثناء نے دل میں سوچا۔ 'ہم نے تو انہیں گھر چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا وہ یہاں ہوتیں تو جواب دیتیں۔ فون کرتیں اور یہ سب نہ ہونے کی ذمے دار بھی میں ہوں۔ صرف میں۔' اب وہ ہر معاملے میں خود کو مجرم سمجھ رہی تھی۔

''تمہیں معلوم ہے ثناء؟'' وسیم آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ''آفاق، صباء سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی صباء سے جدا ہونے کے باوجود صباء اور خود میرے کہنے کے باوجود اس نے شادی نہ کی۔ وہ کسی طور پر بھی صباء کے علاوہ کسی اور کا نہ ہونا چاہتا تھا...... اور بالآخر صباء کا ہو کر ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔''

''اور شاید اسی لیے رخصت ہوتے ہی وہ پھپھو کو آ کر لے گئے۔ اب اور جدا رہنا ان کو پسند نہیں تھا۔''

پھر فاتحہ پڑھ کر وہ قبرستان سے باہر آ گئی۔ جائیداد کے بارے میں اس نے وسیم سے کہہ دیا وہ ''صباء آفاق ٹرسٹ'' قائم کر دے۔ اس کے خیال میں آفاق کی دولت کا یہی صحیح استعمال تھا اور وسیم اس پر رضامند ہو گیا تھا۔

قبرستان سے سیدھی وہ گھر آئی تھی۔ یونیورسٹی جانے کا تو آج سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا اور پھر وہ اس علم کو حاصل کر کے کیا کرتی جس نے اسے بڑوں کا احترام نہ سکھایا تھا۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو فوزیہ پریشان سی سلاد بنا رہی تھی۔ ثناء کو دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان سا اتر آیا۔ تاہم اس نے تھوڑی سختی سے پوچھا۔

''کہاں سے آ رہی ہو اس وقت؟''

''کہاں سے آ سکتی ہوں اس وقت؟'' ثناء نے اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا تھا اور ایسا شاید زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔

''یہ تو طے ہے کہ تم آج یونیورسٹی نہیں گئیں۔'' فوزیہ نے سلاد والا برتن رکھتے ہوئے کہا۔ اب وہ پوری طرح ثناء کی طرف متوجہ تھی۔

''آپ کو کیسے پتہ چلا؟'' ثناء نے متحیر ہو کر پوچھا۔

''سہیل نے فون کیا تھا۔'' فوزیہ کے لہجے میں پیار سمٹ آیا اور ثناء کو ایک دم غصہ آ گیا۔

''اس کو فون کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں یونیورسٹی جاؤں یا کہیں اور وہ کون ہوتا ہے میرے معاملات میں مداخلت کرنے والا۔ میری جاسوسی کرنے والا؟''

"سنی! یہ تم کہہ رہی ہو، وہ تمہارے لیے پریشان تھا۔ تم جانتی ہو وہ تم سے کس قدر محبت کرتا ہے۔" فوزیہ نے حیران ہو کر اسے سمجھایا۔

ثناء نے سوچا۔ 'ہاں وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں بھی اس سے محبت کرتی ہوں۔ نہیں، میرا خیال ہے میں محبت کرتی تھی، کرتی ہوں نہیں۔ مگر اس کو کیا معلوم کہ ایک ہی خط نے ایک ہی رات میں یہ محبت، نفرت میں بدل دی ہے۔ وہ تو دور کی بات، مجھے تو خود اپنے آپ سے گھن آنے لگی ہے مگر اس کو کیا معلوم ہونہہ...... نہیں معلوم تو معلوم ہو جائے گا۔' اس نے لاپرواہی سے سوچا۔

"کیا سوچ رہی ہو سنی! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے بیٹی تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" فوزیہ نے تشویش سے ثناء کو دیکھا کیونکہ ہمیشہ اٹینشن رہنے والی ثناء آج کچھ ڈھیلی ڈھالی لگ رہی تھی۔

"ہوں..... ہاں میں۔ مجھے تو کچھ نہیں ہوا ممی! آپ خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔ بالکل ٹھیک۔" ثناء نے چونک کر جواب دیا اور دل میں سوچا میں ایک دم کارروائی کر کے کسی کو سزا نہیں دوں گی۔ جس طرح پھپھو آہستہ آہستہ ان کے دیئے ہوئے دکھ سہتی رہی تھیں۔ بالکل اسی طرح میں بھی ان کے دکھوں کے بدلے کا آغاز کروں گی۔ میں اسی طرح ان لوگوں کا سکون چھین لوں گی۔ جس طرح ان لوگوں نے میری پھپھو کا چھینا تھا۔

"سنی! کب ٹھیک ہو بیٹی!" فوزیہ غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر بولی۔ "دیکھو سنی! اگر تم نہیں بتانا چاہتیں تو نہ سہی مگر بیٹی آئندہ جب کہیں جانا ہو تو مجھے بتا کر جایا کرو، ورنہ میں سارا وقت پریشان رہتی ہوں۔"

"جی بہتر ممی۔" ثناء نے کہا اور صباء کے کمرے میں چلی آئی۔ جس کی ملکیت کے حقوق اب اس کے نام تھے۔

ثناء نے بیگ سائیڈ میز پر رکھا اور جوتا اتارتے ہوئے ماں کی پریشانی کے متعلق سوچنے لگی۔ وہ ذرا سا گھر سے باہر رہی تو فوزیہ بے چین ہو گئی۔ تب ثناء کو یاد آیا۔ تیسرے اٹیک کے بعد جب صباء پھپھو کو ہوش آیا تھا تو ان کے منہ سے جو لفظ نکلا تھا وہ تھا "ماں!" دادی بھی اسی کمرے میں ایک طرف خاموش کھڑی تھیں۔ صباء کی آواز سن کر وہ تڑپ گئیں۔ بے ساختہ قدم اٹھایا مگر اچانک فوزیہ کو دیکھ کر رک گئیں جس کی آنکھوں میں ناگواری کے

تاثرات صاف دیکھے جا سکتے تھے۔ دادی نے سوچا ہو گا جہاں ساری عمر بہو کو دکھانے کے لیے نفرت کی ہے وہاں اب آخری لمحوں میں محبت جتانے کا فائدہ۔ وہ اجنبیوں کی طرح دور ہی کھڑی رہیں۔ جیسے صباء ان کی سگی نہیں سوتیلی بیٹی ہو۔ ثناء نے اگرچہ یہ بھی دیکھا تھا صباء کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے جنہیں صاف کرتے ہوئے پاپا بار بار کہہ رہے تھے۔ "صباء! رومت، بس تم ایک بار اچھی ہو جاؤ۔ صرف ایک بار اچھی ہو جاؤ صباء! پھر دیکھنا۔" پاپا پتہ نہیں کیا کہنا چاہتے تھے۔ جواب میں صباء نے کچھ کہنے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر آواز نے ساتھ نہ دیا اور خود ثناء اس نے آخری لمحوں میں بھی صباء کو اذیت پہنچانے سے گریز نہ کیا تھا۔ منہ بنا کر کیسی ناگواری سے اسے دیکھتی ہوئی باہر آئی تھی۔

"اف۔" ثناء گلا مسلتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "پھپھو جان! میں تو آخری لمحوں میں بھی آپ کو دکھ دینے سے باز نہ آئی تھی میں کس قدر ظالم ہوں مجھے معاف کر دیجیے گا۔ پھپھو جان! پھپھو جان!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

جب جی بھر کر رو چکی تو باتھ روم میں گھس گئی۔ وضو کیا اور آ کر قرآن مجید پڑھنے لگی کیونکہ دل تھا کہ کسی پل قرار نہ پا رہا تھا۔ اور خدا کو یاد کرنے سے دل کو سکون ملتا ہے۔ ویسے بھی وہ صباء پھپھو کو بہت کچھ پڑھ کر بخشنا چاہتی تھی۔ شاید اسی طرح وہ اپنی سفاکیوں کا کفارہ کرنا چاہتی تھی۔

چار بجے کے قریب وہ کمرے سے باہر آئی تو رضوان لان میں بیٹھے خالی جھولے کو یوں دیکھ رہے تھے۔ جیسے صباء بھی وہاں موجود ہو۔ ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی اداسی دیکھ کر ثناء پہلے بھی ان کے دکھ کا اندازہ نہ کر پاتی مگر اب یہی دکھ خود اس کے اندر سرایت کر چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے قریب آ گئی۔

"پاپا جان! آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں آپ کی طبیعت تو [illegible]ک ہے؟" ثناء نے دکھ سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"طبیعت!" رضوان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "اب شاید کبھی ٹھیک نہ ہو۔"

"کیوں پاپا؟" ثناء نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بن کر پوچھا۔

"کچھ نہیں بیٹیا۔" رضوان نے سنبھل کر کہا اور سوچا جو بات میرے لیے دکھ کا باعث ہے وہی بات ان ماں، بیٹی کی خوشیوں کا باعث ہے پھر انہیں کچھ بتانے کا فائدہ؟ اور صباء تم

نے اتنی گہری خاموشی کیوں اختیار کی کہ تمہیں دیکھنے والے کبھی کچھ نہ سمجھ سکے۔ جس ہستی کے لیے تم نے جان دی ہے۔ کبھی اس کا ذکر مجھ سے تو کیا ہوتا، مجھے کچھ تو بتایا ہوتا میں سارے رسم و رواج ختم کر کے، تمہاری خوشیاں دلا دیتا۔ صباء میں اپنی جان پر کھیل کر بھی تمہاری جھولی خوشیوں سے بھر دیتا۔ مگر تم نے تو کبھی کچھ کہا ہی نہیں اور مجھ سے، مجھے کبھی اتنی توفیق نہ ہوئی کہ خود تم سے کچھ پوچھتا، اب یہ پچھتاوا اور آفاق کا آخری خط مجھے ساری زندگی چین سے نہ جینے دے گا اور نہ سکون سے مرنے دے گا۔''

ثناء ان کی حالت کو سمجھ رہی تھی۔ وہ انہیں تسلی دینا چاہتی تھی۔ بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اچانک سہیل لان میں داخل ہوا۔

''کیوں بھئی سنی! آج یونیورسٹی کیوں نہیں آئیں؟'' اس نے پوچھا۔

''یونہی، کوئی خاص وجہ نہیں۔'' ثناء اس سے زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے مختصراً جواب دیا۔ ورنہ دل میں تو آیا پوچھے 'کیا تم میرے باڈی گارڈ ہو' مگر وہ چپ رہی۔

''کوئی نہ کوئی وجہ تو ضرور ہوگی؟'' سہیل نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے دو تین بار تمہارے لیے فون کیا مگر معلوم ہوا تم سو رہی ہو۔ یہ بات میرے لیے بڑی حیرت انگیز تھی۔ دن میں تم سو جاؤ یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔''

ثناء نے سوچا۔ 'اب اگر میں تمہارے سر پہ جوتے مارنے شروع کر دوں تو یہ بات بھی کچھ کم حیرت کا باعث نہیں ہوگی تمہارے لیے۔'

''ہاں بھئی اصل وجہ بتاؤ۔'' سہیل نے ہنس کر کہا اور جھولے میں بیٹھ گیا۔

''پلیز سہیل۔'' ثناء نے گھور کر اسے دیکھا۔

''کیا مطلب؟ اگر جھولے کا کہہ رہی ہو تو میرا خیال ہے اب یہ لاوارث......''

''اوہ شٹ اپ۔'' ثناء غصے سے چیخی اور سہیل گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ رضوان نے بہت ہی حیرانی سے ثناء کی جانب دیکھا بھلا یہ کیسے ممکن ہے مگر آج انہیں واقعی ثناء کچھ بدلی بدلی لگ رہی تھی۔

''ثناء! یہ شٹ اپ تم نے مجھ سے کہا؟'' سہیل چونک کر پوچھنے لگا۔

ثناء کو شدید غصہ آیا۔ دل میں آیا اب پاؤں سے جوتا بھی اتارے مگر اس نے سوچا ابھی نہیں، مجھے تھوڑا انتظار کرنا چاہیے۔ اسی لیے انجان بن کر بولی۔ ''کیا کہا میں نے؟''

''یعنی تم بھول بھی گئیں کہ تم نے کیا کہا ہے؟'' سہیل بغور اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

شک کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ صباء سے ثناء کی نفرت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔

وہ کچھ دیر اسے دیکھ کر سر ہلاتا رہا پھر کہنے لگا۔

''پھپھو نے ٹھیک ہی کہا تھا تمہارے بارے میں۔''

''کیا کہا تھا؟'' ثناء نے بے ساختہ پوچھا۔

''یہی کہ تمہاری حالت ٹھیک نہیں، تم آج بڑی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو۔'' ثناء کو دل میں بڑے زور کی ہنسی آئی مگر وہ چپ چاپ یوں سہیل کی جانب دیکھتی رہی جیسے کچھ بھی نہ سمجھی ہو حالانکہ وہ جانتی تھی۔ ممی نے کن باتوں کو بہکا بہکا کہا ہے۔

''سنی! کیا تم کچھ پریشان ہو بیٹا؟'' رضوان نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا کیونکہ اس کے چہرے پر ہمیشہ چھائی رہنے والی شوخی کی جگہ ایک عجیب سا کرب تھا۔ حالانکہ وہ تو اس دن بھی اداس نہ ہوئی تھی۔ جب صباء اس دنیا سے رخصت ہوئی تھی۔ مگر آج اس کے چہرے کی یہ اداسی رضوان کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔

اور ثناء کے جی میں آیا آج باپ کے گلے لگ کر اتنا روئے کہ پھر کبھی رونے کی خواہش نہ رہے مگر اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں سوچتے ہوئے اس نے ارادہ بدل دیا کیونکہ اسے معلوم تھا۔ اس طرح یہ سب کرنا، پاپا کی شامت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا اور فوزیہ ہر الزام ان پر رکھے گی جبکہ وہ صرف خود مجرم رہنا چاہتی تھی۔

''تم نے بتایا نہیں سنی؟'' رضوان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

''پاپا! سر میں شدید درد ہے پتہ نہیں کیوں ذہن بوجھل بوجھل سا ہے اور تو کوئی خاص بات نہیں۔'' ثناء نے انہیں مطمئن کیا۔

''ٹیبلٹ لی ہوتی۔'' رضوان نے شفقت سے کہا۔ وہ لاکھ بدتمیز سہی مگر ان کا اپنا خون تھی۔

''جی پاپا! ابھی، ابھی لے کر آئی ہوں۔'' ثناء نے مسکرا کر کہا۔

''اچھا بھئی سہیل تم بیٹھو میں اندر جا رہا ہوں۔'' رضوان اٹھ گئے۔

''کیوں بھئی سنی یہ سب کیا تھا؟'' سہیل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اور ثناء کے لہجے میں پہلے والی نرمی عود کر آئی۔ ''پلیز سہیل۔ برا مت محسوس کرنا ابھی

پاپا، صباء پھپھو کی وجہ سے بہت اداس ہیں اور میں نہیں چاہتی کہ ہم ابھی سے جھولے پر بیٹھنا شروع کر دیں اور پاپا کو اذیت ہو، میں سب کے ساتھ بدتمیزی کر سکتی ہوں مگر پاپا کے ساتھ نہیں۔'' ثناء نے بڑی خوبصورتی سے وضاحت کی۔

''اچھا تو یہ بات تھی خیر چھوڑو اس قصے کو، چلو کہیں گھومنے چلتے ہیں۔''

''نہیں سہیل، میرے سر میں شدید درد ہے تم کہو تو میں آرام کر لوں۔'' قبل اس کے کہ سہیل کوئی جواب دیتا۔ فوزیہ جو قریب آتے ہوئے سب کچھ سن چکی تھی۔ بولی۔

''ارے بھئی چلی جاؤ گھومنے دیکھنا سب درد، ورد جاتا رہے گا۔''

''نہیں ممی! گھومنے پھرنے سے تو اور بھی درد ہو سکتا ہے۔ کیوں سہیل؟'' اس نے اپنی بات کی تائید چاہی۔

''ہاں، ہاں۔'' سہیل نے جلدی سے کہا۔ وہ ان دونوں کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی اور دروازہ بند کر لیا یہ سوچ کر کہ کہیں سہیل بھی اس کے پیچھے نہ آ جائے۔

چہلم تک کا عرصہ اس نے کیسے گزارا، یہ تو وہ خود ہی جانتی تھی۔ ہر پل اذیت دیتا تھا۔ دل کی خلش چین نہ لینے دیتی تھی۔ صباء کی بے مقصد زندگی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی اور وہ تڑپ اٹھتی۔

بہت دفعہ اس کے جی میں آیا عمر فاروق کو فون کرے کیونکہ صباء کے بعد وہ صباء ہی کی نشانی تھی۔ مگر نہ جانے کیا سوچ کر ہاتھ رک جاتے۔

چہلم کا دن جوں جوں قریب آ رہا تھا۔ اس کے اندر کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ فوزیہ نے ایک بار بھی تو چہلم کی بات نہ کی تھی۔ ثناء جانتی تھی ممی کی وجہ سے پاپا چہلم پر کسی کو نہیں بلائیں گے۔ چند دیگیں پکائیں گے اور یتیم خانے بجھوا دیں گے کیونکہ ایسا کرنے سے فوزیہ ان کو نہیں روک سکتی تھی۔ مگر ثناء یہ نہیں چاہتی تھی، یہی وجہ تھی کہ چہلم کی تیاری اس نے خود پاپا سے کہہ کر کروائی تھی۔



اس دن فوزیہ گھر پر نہیں تھی اور ثناء نے سوچا پاپا سے بات کرنے کا یہ ایک اچھا موقع ہے۔ اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہی سوچ کر وہ ان کے کمرے میں چلی آئی۔ پاپا کوئی خط پڑھ رہے تھے۔ ثناء کو دیکھ کر چونک پڑے، جلدی سے خط بند کیا اور بولے۔

''آؤ بیٹے کیسے آنا ہوا؟''

''پاپا......'' اس نے کچھ کہنا چاہا مگر آواز حلق میں پھنس گئی اور وہ دروازے میں کھڑی پاگلوں کی طرح پاپا کو دیکھتی چلی گئی۔

''ثنی، ثنی کیا ہوا؟'' رضوان جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب آئے۔

''پاپا......'' اس نے بمشکل کہا اور پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو دی۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیسے پاپا کو بتائے کہ صباء پھپھو کا دکھ اس کے دل میں اتر گیا ہے۔ وہی صباء پھپھو جو ان کی نفرت میں جل جل کر راکھ ہوئی تھیں۔ اب ثناء ان کی محبت میں جل جل کر راکھ ہو رہی تھی۔ مگر زبان ساتھ دیتی تو وہ کچھ بتاتی۔

''ارے، ارے۔'' رضوان اس کے رونے پر گھبرا گئے۔ ''کسی نے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''پھر رو کیوں رہی ہو؟'' رضوان پریشانی سے بولے۔

''پاپا! آپ کو پھپھو صباء کے چہلم کی تیاری نہیں کرنی۔'' اس نے اپنی پوری قوت یکجا کر کے کہا اور جب رضوان نے متحیر ہو کر اسے دیکھا تو وہ سر جھکا کر چپ ہو گئی۔

''ثنی! کیا تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟'' رضوان کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

''جی ہاں پاپا! میں نے آپ سے پھپھو صباء کے چہلم کی تیاری کو کہا ہے۔ ان کی روح کو ہم اپنے گھر سے ثواب پہنچانا چاہتے ہیں۔''

''ثنی! تمہیں تو بہت نفرت تھی اپنی پھپھو سے پھر یہ محبت کیسی؟'' رضوان نے حیرت سے اس کو دیکھا۔ اور وہ ان سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رضوان اس کو تو چپ کیا کرواتے، خود بھی رو پڑے۔

''پاپا، پاپا میں بہت بدتمیز ہوں۔ بہت بری ہوں۔ پاپا میرا گلا گھونٹ کر مار دیجیے۔ مجھ سے اب صباء پھپھو کی موت کا دکھ برداشت نہیں ہوتا۔ پاپا میں صباء پھپھو کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔'' وہ روتی ہوئی کہہ رہی تھی۔

اور رضوان حیرت سے اسے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ سنبھل گئے۔ بیٹی کے آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔

''جو وقت گزر گیا بیٹا! اب اس کو کوئی واپس نہیں لا سکتا۔ تاہم یہ کیا کم ہے کہ گزرتے

ہوئے وقت نے تمہارے دل میں محبت کے بیج بو دیئے۔'' اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔

''ٹھیک ہے پاپا۔ اب آپ چہلم کی تیاری کیجیے اور سب پھپھیوں کو آپ خود ان کے گھر جا کر دعوت دیں گے اور تاکید کریں گے کہ وہ سب ضرور آئیں۔''

''مگر بیٹا! تم تو جانتی ہو تمہاری ممی کا سلوک ان سب کے ساتھ کیسا ہوتا ہے اور پھر فوزیہ شاید نہ مانے۔'' ثناء کا ردعمل جاننے کے لیے انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''ممی کی آپ فکر مت کیجیے پاپا! اب ان سب کی دیکھ بھال میری ذمہ داری ہو گی۔'' رضوان تو خود بھی یہی چاہتے تھے۔

یوں اندر ہی اندر چہلم کی تیاری مکمل ہوئی اور پھر چہلم کے ایک روز قبل آفس جاتے ہوئے رضوان نے فوزیہ کو بتایا۔

''سنو بھئی کل صباء کی رسم چہلم ہے۔ سب مہمان آئیں گے۔ آج گھر کی صفائی اچھی طرح کروا لینا۔'' فوزیہ نے گھور کر ان کو دیکھا اور سخت لہجے میں پوچھا۔

''آپ نے یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا؟''

رضوان نے ثناء کو دیکھا اور پروگرام کے مطابق وہ منہ بناتی ہوئی بولی۔

''ممی! اس میں ہمیں بتانے والی کیا بات تھی۔ یہ پاپا کی بہن کا چہلم ہے۔ ظاہر ہے انہی کو کرنا ہے۔ ہمیں کیوں بتاتے۔'' ثناء نے جو اس کارروائی کے لیے خود کو تیار کر چکی تھی۔ یہ سب کہہ کر باپ کو پریشانی سے بچا لیا۔ مگر فوزیہ کہاں پیچھا چھوڑنے والی تھی۔ نفرت سے بولی۔

''بے شک بہن کا چہلم ہے مگر مجھے تو بتاتے اور پھر یہ مہمان کیا سب ایک بار پھر آئیں گے؟''

ثناء نے دکھ سے سوچا صرف تین بہنوں کو آنا ہے اور ممی کہہ رہی ہیں ''کیا وہ سب؟'' دو بہنیں تو رہتی ہی امریکہ میں تھیں۔

''بھئی سنی! تم خود ہی ساری تیاری کر لینا۔'' رضوان خود پیچھا چھڑا کر چلے گئے اور ثناء ماں کو سمجھانے لگی۔ مگر فوزیہ کہاں سمجھنے والی تھی۔ پہلے تو خوب بولتی رہی اور ثناء اسے اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اور پھر اس ایک ہی دن میں فوزیہ نے بھی اپنے سب عزیزوں کو دعوت کا پیغام بھیج

دیا اور چہلم والے روز رضوان کی بہنوں کی آمد سے پہلے ہی فوزیہ کے دور اور نزدیک کے رشتے داروں سے گھر بھر چکا تھا۔ کیونکہ یہ فوزیہ کی عادت تھی۔ جب بھی گھر میں کوئی چھوٹی یا بڑی تقریب ہوتی وہ اپنے سب آگے پیچھے کے چھوٹے بڑے رشتے داروں کو بلا لیتی۔

ثناء جانتی تھی یہ سب ضرور ہوگا کیونکہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا آیا تھا۔ فوزیہ کے رشتے دار صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھتے اور جن کے بھائی کا گھر تھا۔ وہ مسافروں کی طرح کبھی کہیں جگہ ڈھونڈتے اور کبھی کہیں اور فوزیہ کے رشتہ دار آرام سے بیٹھے مسکراتے رہتے۔

پہلے تو ثناء بھی ان سب لوگوں کے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ مگر آج ان سب کو دیکھ کر ثناء کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ برآمدے میں آئی اور بڑے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تلخی سے بولی۔

''اس پر آپ میں سے کوئی بھی نہیں بیٹھے گا۔'' بات ختم کر کے وہ جیسے ہی مڑی اندر داخل ہوتے ہوئے میجر عمر فاروق، کرنل انوار اور پھپھو پروین پر نظر پڑ گئی۔ پہلی آمد ان لوگوں سے ہوئی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ پاپا، کرنل سے مصافحہ کر کے بات کرتے ہوئے انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئے تھے اور عمر، ماں کے ساتھ برآمدے میں چلا آیا تو ثناء ایک طرف ہٹ گئی۔

''ابھی تو شاید تمہاری کوئی آنٹی بھی نہیں آئی؟'' پروین نے اِدھر اُدھر صوفوں اور کرسیوں پر براجمان فوزیہ کے عزیزوں کو دیکھ کر عمر سے کہا۔

''جی ممی! لگتا تو یہی ہے۔'' عمر نے جواب دیا۔ وہ صباء کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں کبھی وہ بڑی بے تکلفی سے آیا جایا کرتا تھا۔ مگر اب اس کمرے میں اس کا داخلہ ممنوع ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تو وہ رخ موڑتے ہوئے بولا۔

''او۔ کے ممی! آپ یہاں بیٹھیں، میں پاپا کے پاس جاتا ہوں۔'' وہ چلا اور ثناء سوچنے لگی۔ آنٹی کی محبت میں عمر کتنی ناگوار باتوں کو برداشت کرتا رہا اس گھر میں۔

عمر گیا تو پروین اسی صوفے کی جانب بڑھی جہاں ثناء نے کسی کو نہ بیٹھنے کا حکم دیا تھا لیکن ابھی پروین پوری طرح بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ ثناء کی ممی کی ممانی ان کے برابر بیٹھ گئیں۔ ثناء مارے غصے کے آگے بڑھی جاتے ہوئے عمر نے ایک نظر اس کو دیکھا اور نفرت

سے منہ پھیر لیا۔

"میں اسی قابل ہوں عمر! تم جتنی بھی نفرت کرو کم ہے۔' ثناء نے دل میں سوچا پھر صوفے پر بیٹھی ہوئی خاتون سے مخاطب ہوئی۔

"آپ نے غالباً سنا نہیں تھا۔ میں نے کہا تھا اس صوفے پر کوئی نہیں بیٹھے گا۔ اور بھی بہت ساری جگہیں خالی پڑی ہیں۔" ثناء کی بات پر نہ صرف وہ خاتون گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ بلکہ پروین بھی۔

"پلیز آپ بیٹھ جائیں۔" ثناء نے ادب سے پھپھو کو سلام کرتے ہوئے کہا۔ پروین نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور بیٹھ گئی اتنے میں دوسری پھپھیاں بھی آ گئی تھیں۔ ثناء نے باری باری سب کو سلام کیا اور پھر سہیل کی آواز سن کر چلی گئی۔

"ارے یہ ثناء ہی تھی؟" زاہدہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"تھی تو ثناء ہی مگر یہ سلام، یہ احترام۔ میں تو خود بہت حیران ہوں۔" پروین نے عائشہ کو پیار کرتے ہوئے کہا پھر بولی۔ "فری اور راہی کے الگ الگ خط آئے تھے آپ لوگوں کو بھی کیا آئے ہیں؟"

"ہاں۔" زاہدہ اور نسرین ایک ساتھ بولیں۔ "انہوں نے لکھا ہے جانے والی تو چلی گئی اب آنے کا کیا فائدہ وہ اپنے پروگرام کے مطابق ہی واپس آئیں گی۔ تاہم انہوں نے یہ شکوہ ضرور کیا ہے کہ جب صباء کی طبیعت خراب تھی تب ہی اطلاع کر دی ہوتی۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" وہ سب بہنیں صباء کے ذکر پر ایک بار پھر افسردہ ہو گئی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" ثناء نے نہایت ضبط سے پوچھا۔ ورنہ اس کو سہیل کا یوں آواز دے کر بلانا ذرا پسند نہ آیا تھا۔

"ان لوگوں کو کس نے بلایا ہے؟" سہیل کا اشارہ عمر کی جانب تھا۔

"کن لوگوں کو؟" ثناء نے انجان بن کر کچھ تلخی بھرے لہجے میں پوچھا۔

"میں عمر کی بات کر رہا ہوں۔ وہ ڈرائنگ روم میں بڑے اعزاز کے ساتھ بیٹھا ہے۔"

"بھئی پاپا کے رشتے دار ہیں، وہی ان کو بلاتے ہیں، ورنہ ہم تو۔" اچانک پیچھے سے نکل کر عمر سامنے آ گیا۔ ثناء کی بات وہ سن چکا تھا۔ ایک لمحہ کے لیے رک کر زہر خند سے اسے دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

عمر کو دیکھ کر ثناء کی بات ادھوری رہ گئی وہ شاید وضو کرنے جا رہا تھا۔ ثناء اس کو دیکھتی رہ گئی۔

"تم دیکھ رہی ہو اس کمینے کو۔" سہیل نے دانت پیس کر کہا۔ "یہ ہمیں بارش میں بھیگتا ہوا چھوڑ گیا تھا اور اب تمہیں کس طرح دیکھتا ہوا گزرا ہے۔"

"دیکھنے دو، اس کے دیکھنے سے ہمارا کیا جاتا ہے، وہ صرف دیکھ سکتا ہے۔" ثناء نے بات ختم کی۔

"ہاں، وہ صرف دیکھ سکتا ہے۔" سہیل مسکرایا۔ "اور میں چھو بھی سکتا ہوں۔"

"شٹ اپ۔" ثناء نے نفرت سے کہا اور فوراً اندر چلی گئی اور سہیل ہکا بکا اسے دیکھتا رہ گیا۔

وہ واپس برآمدے میں آئی تو فوزیہ اپنے عزیزوں کے ساتھ بیٹھی باتوں میں مشغول تھی۔ دفعتاً ثناء کی نظر واش بیسن کے سامنے کھڑے ہوئے عمر پر پڑی وہ جلدی سے اٹھی اور بھاگ کر اپنا تاول نومی کو دیتے ہوئے بولی۔

"جاؤ نومی، جلدی سے عمر کو دے آؤ۔ اسے اس کی ضرورت ہے۔"

"عمر کو یا سہیل بھائی کو؟" نومی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ایڈیٹ! عمر کو۔" ثناء نے دانت پیس کر آہستہ سے کہا۔ نومی چلا گیا مگر تھوڑی دیر بعد ہی تولیہ لیے واپس آ گیا۔

"دیا نہیں انہیں تولیہ؟" ثناء نے غرا کر پوچھا۔

"دیا تھا۔ وہ کہتے ہیں مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" نومی نے معصومیت سے بتایا۔

"اچھا۔" ثناء تولیہ لیے بوجھل بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور رونے لگی۔ 'عمر، تمہاری نفرت کب ختم ہوگی؟' وہ روتی رہی بلکہ باہر چہلم کا ختم شروع ہوا اور پھر ختم بھی ہو گیا مگر وہ روتی رہی اور کہتی رہی۔ "پھپھو جان! کاش آپ ایک بار واپس آ سکتیں تو میں اپنے ہر جرم کا کفارہ ادا کرتی۔ میری اچھی پھپھو! جب میں ہوش میں آئی ہوں تو آپ موجود نہیں ہیں۔ پھپھو آج آپ کی روح اس گھر سے رخصت ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے، آپ نے مجھے معاف کر دیا ہوگا کیونکہ آپ ساری زندگی لوگوں کو معاف کرتی رہی ہیں۔ مگر میں خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ ہاں پھپھو اپنے جرم کی میں خود کو سزا دوں گی۔ "

اچانک سہیل کی آواز سن کر وہ باتھ روم میں گھس گئی۔ ٹھنڈے پانی سے جب منہ دھو کر باہر آئی تو وہ اطمینان سے بیڈ پر لیٹا تھا۔ ثناء کو دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے اٹھ بیٹھا۔

''آؤ بھئی کھانا کھائیں۔''

''کھانا؟'' ثناء نے اس کا لفظ دوہرایا۔ پھر چونکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا باہر کھانا شروع ہو گیا؟''

''ہاں بھئی، اسی لیے تو میں تمہیں لینے آیا ہوں۔'' سہیل نے اٹھتے ہوئے کہا۔ مگر ثناء وہاں کب تھی۔ وہ بھاگ کر باہر آئی۔ سب مہمان کھانا کھا رہے تھے اور ان میں اس کے پاپا کی بہنیں بھی شامل تھیں۔ ثناء ان کے پاس آ گئی گوشت کے ڈونگے بھرے بھرے آ رہے تھے اور فوزیہ کے رشتے دار چیلوں کی طرح جھپٹ کر پکڑے جا رہے تھے اور اپنی من پسند کی بوٹیاں نکال کر کھا رہے تھے۔

ثناء نے خود آگے بڑھ کر دو ڈونگے اپنی پھپھیوں کو دیئے اور پھر جس، جس چیز کی کمی ہوتی رہی وہ خود آگے بڑھ کر پیش کرتی رہی اور وہ سب بہنیں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کر کے پوچھتی رہیں۔ ''کیا ثناء کا دماغ خراب ہو گیا ہے یا صحیح؟'' مگر یہ بات کوئی بھی طے نہ کر سکا کہ دماغ پہلے خراب تھا یا اب خراب ہوا ہے۔

ثناء ان کی نظر بازی کو دیکھ چکی تھی۔ مگر انجان بن کر دل ہی دل میں مسکراتی رہی۔ وہ کھانے سے فارغ ہو گئیں تو ثناء نے اطمینان کی سانس لی۔

''ثنی! تم نے کھانا نہیں کھایا؟'' فوزیہ نے پوچھا۔

''ممی! مہمانوں کے آنے سے پہلے ہی میں نے کھانا کھا لیا تھا اب جب بھوک نہیں تو کھانا کیسے کھاتی۔'' ثناء نے اپنی طرف سے انہیں مطمئن کر دیا۔ مگر فوزیہ مشکوک انداز میں اسے دیکھتی ہوئی واپس چلی گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر سب مہمان پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ رضوان ایک دو بار اندر آئے، بہنوں کو دیکھا اور اشارے سے ثناء سے پوچھا۔ ''سب ٹھیک ہے؟'' اور ثناء نے اشارے میں ہی بتا دیا کہ سب ٹھیک ہے اور وہ چلے گئے۔

''بھئی فوزیہ! تم نے تو کہا تھا، چہلم کا اہتمام سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں کریں گے مگر یہاں تو تم نے فوج کی فوج بلا لی۔'' ثناء کی نانی اچانک باتیں کرتی کرتی اس کی

پھپھیوں کی جانب دیکھ کر بولیں۔

ثناء کو نانی کی بات سن کر شدید غصہ آیا۔ فوزیہ کے جواب دینے سے پہلے ہی ترکی بہ ترکی جواب دیتی ہوئی بولی۔

''نانی جان! غلط کہا ہے آپ نے کہ پاپا نے فوج کی فوج بلائی ہے۔ فوج تو ممی نے بلائی ہے۔ یہ بے چارے تو بیچ میں یرغمال لگ رہے ہیں۔ کیوں ممی؟'' اس نے بھنویں اچکا کر ہنستے ہوئے پوچھا۔

فوزیہ نے گھور کر اسے دیکھا مگر چپ رہی کیونکہ بیٹی کے بدلے، بدلے تیور اچھی طرح دیکھ رہی تھی۔ البتہ پروین، بہنوں کو دیکھ کر مسکرا دی اور ثناء کی نانی یوں چپ ہو گئیں۔ جیسے روزہ رکھ لیا ہو مگر ان کی آنکھوں میں ابھرتی ہوئی حیرت کو صاف دیکھا جا سکتا تھا اور پھر یہ ہوا کہ بجائے اس کی پھپھیوں پر طنز کرنے کے وہ سب اپنی اپنی باتیں کرنے لگے۔

ثناء کچھ دیر بیٹھی ان سب کی باتیں سنتی رہی اور جب دیکھا ماحول پُرسکون ہو گیا ہے تو اٹھ کر ٹی۔ وی لاؤنج میں چلی آئی۔ ٹی وی لاؤنج میں جا کر اس نے ملازمہ کی مدد سے سب پھپھیوں کے بستر وہاں لگائے پھر بولی۔

''جاؤ جا کر پاپا کی سب بہنوں کو بلا لاؤ۔'' اور خود وہ دروازے میں کھڑی ہو گئی۔ اچانک سہیل کی ممی ادھر آ نکلیں۔

''ارے بھئی یہاں کس کے سونے کا اہتمام ہوا ہے؟'' انہوں نے قرینے سے لگے ہوئے بستر دیکھ کر پوچھا۔ ظاہر ہے یہ سب تیاری ثناء انہی کی خاطر کر سکتی تھی۔ مگر ثناء بولی۔

''کوئی بھی سو جائے۔''

''اچھا'' سہیل کی ممی اندر داخل ہونے لگیں۔ تو ثناء نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''پلیز ممانی! آپ باہر چلی جائیں یہاں میری سب پھپھیاں سوئیں گی۔'' اتنے میں وہ سب بہنیں بھی آ گئیں اور سہیل کی ممی ماتھے پہ بل ڈالے باہر نکل گئیں۔

ثناء نے لاپرواہی سے شانے اچکائے اور کچن میں چلی گئی۔ چائے کے لیے پانی رکھا اور پھپھیوں کی حیرت کے بارے میں سوچنے لگی۔ پھر چائے بنا کر اس نے ملازمہ کے ہاتھ ٹی۔ وی لاؤنج میں بھیج دی۔

کرنل تو اپنے کسی کام کے سلسلے میں باہر چلے گئے تھے اور جاتے ہوئے کہہ گئے تھے

کہ وہ رات بھی گھر سے باہر رہیں گے۔ مگر عمر رہ گیا تھا۔ وہ اسی کا سوچ رہی تھی۔ آخر جھجکتی ہوئی ٹی۔وی لاؤنج میں آ گئی اور وہ سب جو اس تبدیلی پر پہلے ہی حیران تھے اسی حیرت میں غوطہ زن اسے دیکھنے لگے۔ جبکہ وہ خود عمر کو دیکھ رہی تھی جو عائشہ سے باتوں میں مصروف تھا۔ لگتا تھا اس کی آمد کی انہیں خبر ہی نہیں ہوئی۔

''آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟'' ثناء نے نظریں جھکائے جھکائے آہستہ سے پوچھا۔

''کسی اور چیز کی تو ضرورت نہیں مگر عمر کے لیے چائے بھیج دو۔'' پروین نے بھی پیار بھرے لہجے میں کہا۔ جب وہ معصوم بچی ہو کر بدل گئی تھی تو وہ کیوں دل میں نفرت رکھتیں۔ آخر وہ ان کے بھائی کا خون تھی۔

عمر نے پلٹ کر ثناء کو دیکھا اور ماں سے مخاطب ہوا۔

''ممی میں ذرا کام سے جا رہا ہوں۔ چائے بھی باہر ہی پی لوں گا۔ شکریہ۔'' اس نے یوں ثناء سے کہا جیسے کہہ رہا ہو اب یہاں سے دفعہ ہو جاؤ اور ثناء یہ سوچتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی کہ یقیناً اس نے کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا اور اب شاید کھانا کھانے ہی جا رہا ہے۔

آج رضوان بہت خوش تھے۔ وہ رات گئے تک بہنوں کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے اور بہنیں بھی بھائی کا رویہ دیکھ کر خوش ہو گئیں۔



ثناء آ کر لیٹی تو تھکن کی وجہ سے جلد ہی نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ رات کا ایک بجا ہو گا جب اس کی آنکھ کھل گئی اور وہ عمر کا سوچ کر جلدی سے باہر آئی۔ پتہ نہیں وہ کہاں سویا ہو گا کیونکہ ٹی۔وی لاؤنج میں تو اب اور کسی کی گنجائش نہ تھی۔ وہ باہر آئی سب جگہ دیکھا مگر کہیں بھی عمر نظر نہ آیا۔

'کیا وہ واپس چلا گیا؟' ثناء نے اپنے دل میں سوچا۔ 'مگر نہیں وہ واپس کیسے جا سکتا ہے۔ جبکہ پھپھو پروین ابھی یہیں ہیں۔'

یونہی ایک خیال اس کے دل میں آیا اور وہ ڈائننگ روم میں چلی آئی اور کھانے والی میز پر لیٹا ہوا عمر نظر آ گیا۔ ثناء کے دل میں درد کی ٹیس سی اٹھی۔ اگرچہ اپریل کا مہینہ تھا مگر کچھ دن قبل ہونے والی بارشوں کی وجہ سے سردی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا مگر اس کے پاس

نہ تکیہ تھا اور نہ کمبل۔ ایک بازو سر کے نیچے اور دوسرا آنکھوں کے اوپر رکھے وہ سو رہا تھا۔ پتہ نہیں سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔

ثناء کی سمجھ میں نہ آیا اب کرے تو کیا۔ کتنی دیر دروازے میں کھڑی وہ سوچتی رہی پھر آگے بڑھ کر لائٹ آن کر دی مگر عمر کی پوزیشن میں کوئی فرق نہ آیا وہ یونہی چت پڑا رہا تو ثناء خواہ مخواہ کھانسنے لگی۔ عمر نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر زہر خند سے اسے دیکھا اور ثناء مصنوعی غصے سے منہ بناتی ہوئی بولی۔

''کیا یہ سونے کی جگہ ہے؟ سب لوگ کھانا کھاتے ہیں یہاں بیٹھ کر آپ کو نہیں پتہ؟'' عمر نے پھر آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔ جیسے اس کی بات کی کوئی خاص اہمیت نہ ہو۔

''آپ نے سنا نہیں میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' ثناء کوشش کے باوجود اسے تم کہہ کر مخاطب نہ کر سکی۔

عمر نے آنکھوں سے بازو ہٹایا اور اس کو گھورتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جبکہ ثناء پلکیں جھپک جھپک کر اسے دیکھنے لگی۔ دل میں سوچا یہ بے چارہ شاید ڈر کر اٹھ گیا ہے۔ مگر اس وقت ساری خوش فہمی ہوا ہو گئی جب عمر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''تمہیں کیا تکلیف ہے مس رضوان! جاؤ دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔''

ثناء نے اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کی۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے وقت کی اس ستم ظریفی پر اسے دیکھتی رہی۔ وہ عمر جس نے کبھی اس کی طلب کی تھی۔ وہ جو کبھی اس کا محبوب تھا مگر اب وقت بدل گیا تھا۔ ثناء کی جگہ عمر نے لے لی تھی اور عمر کی جگہ ثناء نے۔ عمر کی محبت اس کے دل میں اتر گئی تھی جبکہ اس کی نفرت اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ عمر کے دل میں بس گئی تھی۔ وقت بھی کیسے کیسے کھیل دکھاتا ہے ثناء کو تو خیال بھی نہیں تھا کہ وہ کبھی عمر کی محبت کی اسیر ہو جائے گی اور وہ کبھی صباء پھپھو کے لیے یوں دکھی ہو گی اور اسے یوں سہیل اور اس کے گھر والوں سے نفرت ہو جائے گی۔ اس کی خوبصورت شامیں اور سہانی راتیں یوں اذیت ناک بن جائیں گی۔ یہ اس نے کب سوچا تھا۔ مگر یہ لمحے تو چپکے سے اس کی زندگی میں داخل ہو چکے تھے۔ اس کی راتیں بے خواب ہو گئی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس وقت وہ عمر کے سامنے چپ چاپ کھڑی تھی۔ وہ عمر جس کی ایک بات کے جواب میں وہ دس دس باتیں سناتی تھی مگر آج زبان حیرت سے گنگ ہو گئی تھی۔

"سنا نہیں، تم چلی جاؤ یہاں سے۔" وہ رات کا خیال کر کے دبے دبے لہجے میں چیخا اور ثناء گھبرا کر باہر نکل آئی۔ تاہم لائٹ اس نے آف نہیں کی تھی۔ کچھ دیر باہر کھڑی وہ اس مسئلے کا حل سوچتی رہی۔ کوئی ایسی بات، کوئی ایسا حل...... جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ پھر ایک ترکیب اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایک تکیہ اور کمبل لیا مگر جب واپس آئی تو لائٹ پھر آف تھی۔ ثناء نے آگے بڑھ کر لائٹ آن کی تو عمر پہلے والی پوزیشن میں لیٹا ہوا نظر آیا۔ لائٹ آن ہونے پر عمر نے بازو کے نیچے ہی سے اس کو دیکھا۔ وہ سوئچ بورڈ کے قریب خاموش کھڑی تھی۔

"اب کیا تکلیف ہے؟" عمر نے جھلا کر پوچھا اور اٹھ بیٹھا۔

"میں یہ......" ثناء کچھ کہنا چاہتی تھی مگر عمر اس کی بات کاٹ کر دھاڑا۔

"اگر تم یہ سب کسی ہمدردی میں لائی ہو تو لے جاؤ میں یوں بھی سو سکتا ہوں۔"

"آپ سے کس نے کہا یہ سب میں آپ کے لیے لائی ہوں۔" ثناء نے جان بوجھ کر لہجے کو طنزیہ بنا لیا۔

"پھر یہاں کس خوشی میں کھڑی ہو، کیا تمہیں معلوم نہیں مجھے تمہاری صورت سے شدید نفرت ہے۔ اپنی یہ منحوس صورت لے کر میرے سامنے مت آیا کرو۔" اس کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔

"اونہہ، آپ آخر خود کو سمجھتے کیا ہیں۔ مجھے خود بار بار آپ کے سامنے آنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں تو آپ کو یہ بتانے آئی تھی کہ آپ کی آنٹی نے مر کر بھی اس کمرے کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کمرے کے اندر کوئی چل رہا ہو، سرگوشیاں کر رہا ہو، میں اپنی ممی کے کمرے میں سونے جا رہی ہوں۔ آپ کو اگر آنٹی سے ملنے کا شوق ہو تو آپ اس بھوت خانے میں جا سکتے ہیں۔" پھر وہ بھاگ کر آئی اور ساتھ ہی بنے ہوئے باتھ روم میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد ہی عمر باہر آیا اور سیدھا صباء کے کمرے میں چلا گیا جبکہ ثناء ڈائننگ روم میں آ گئی تکیہ میز پر رکھا اور کمبل اوڑھ کر وہیں لیٹ گئی۔ جہاں سے عمر اٹھ کر گیا تھا اور وہ رات اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے سپنے دیکھتے ہوئے گزار دی۔ وہ سپنے جس میں عمر کی نفرت ختم ہو گئی تھی اور وہ اس کو اپنی بانہوں میں لیے اپنی محبت کا یقین دلاتا رہا اور قسمیں کھاتا رہا۔

صبح سب سے پہلے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ کمبل پھینک کر وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔ آج کی صبح اسے بڑی سہانی لگ رہی تھی۔ منہ ہاتھ دھو کر سیدھی کچن میں آئی۔ ملازمہ کے ساتھ مل کر ناشتہ بناتے ہوئے وہ اپنے ناراض محبوب کے بارے میں سوچنے لگی اور مسکرانے لگی۔

'میری چال کامیاب رہی جناب کی رات بڑے آرام سے کٹی ہو گی۔'

ناشتہ تیار کر کے اس نے ڈائننگ ٹیبل پر لگایا اور ملازمہ سے کہا وہ ان سب کو بلا لائے۔ پھر جب تک دوسرے مہمان اٹھے وہ ان سب کو ناشتہ دے چکی تھی۔ سوائے عمر کے، عمر چونکہ نماز کا پابند تھا اس لیے وہ صبح اٹھتے ہی مسجد جا چکا تھا اور یقیناً جان بوجھ کر مسجد میں ہی ٹھہر گیا تھا۔ شاید وہ اب ان کے گھر سے کچھ کھانا نہیں چاہتا تھا۔ ثناء انہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھی کہ فوزیہ کی تلخ آواز سن کر چونک پڑی۔

"ان لوگوں کو ناشتہ کس نے دیا؟" وہ غصے سے بھری پوچھ رہی تھی۔ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر ثناء کو بہت سکون ملا۔ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے اس نے ماں کے غصے سے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

"سنا نہیں تم نے، میں پوچھتی ہوں۔ ناشتہ کس نے دیا ان لوگوں کو؟" فوزیہ ملازمہ پر برس پڑی۔ اس کا بس چلتا تو ان سب کے حلق میں انگلیاں ڈال کر سب کچھ باہر کھینچ لیتی۔

"ممی! آپ اس قدر ناراض کیوں ہو رہی ہیں۔ ناشتہ میں نے دیا تھا ان لوگوں کو۔"

"تم نے؟" فوزیہ نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا۔

"ممی! پوری بات تو سن لیں میں نے ناشتہ اس لیے جلدی دیا تا کہ یہ لوگ جلد چلے جائیں۔" ثناء نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا اور فوزیہ مشکوک نظروں سے دیکھتی ہوئی چپ ہو گئی۔ اسی دم ثناء کی نظر عمر پر پڑی وہ باہر سے آ کر ٹی۔وی لاؤنج کی طرف جا رہا تھا اس نے شاید ایک بار پھر اس کی بات سن لی تھی۔ ثناء نے اس کے غصے سے پھولے ہوئے چہرے کو ایک نظر دیکھا اور بے ساختہ مسکرا دی۔ فوزیہ نے اس کی یہ مسکراہٹ دیکھی تو آگ بگولہ ہو کر بولی۔

"کیوں، اس کو دیکھ کر مسکرانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ممی! آپ نے دیکھا نہیں وہ کتنا احمق لگ رہا تھا۔" ثناء نے ہنس کر کہا تو فوزیہ کو تھوڑا سا سکون ملا۔ تاہم اس کے باوجود منہ بناتے ہوئے بولی۔

''جاؤ، دیکھو ان لوگوں کا دفعہ ہونے کا پروگرام ہے کہ نہیں۔'' مگر ثناء کے دیکھنے سے پہلے ہی عمران سب کے ساتھ واپس آتا دکھائی دیا۔ شاید وہ لوگ جا رہے تھے۔ اندر ہی اندر ثناء کے دل کو کچھ ہو گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا رضوان کہیں بھی نظر نہ آئے۔

'اف یہ پاپا کہاں چلے گئے ہیں جبکہ میں نے کہا بھی تھا ان سب کو خود رخصت کیجیے گا۔' ثناء کو شدید غصہ آ رہا تھا اور اسی وقت رضوان بھی اچانک پیچھے سے نکل کر باتیں کرتے ہوئے سامنے آ گئے۔

''دیکھو بھئی۔'' وہ ثناء کی کہی ہوئی بات دوہرانے لگے۔ ''یہ تمہارے بھائی کا گھر ہے۔ جب، جس کا جی چاہے چلی آنا۔ خون سے خون کبھی جدا نہیں ہوتا۔ باقی تو خاندانوں میں بہت کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ تاہم تم لوگوں کو کسی اور سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ صرف بھائی کا خیال ہونا چاہیے۔''

''اونہہ بھائی کا گھر ہے چلی آنا۔'' فوزیہ نفرت سے بڑبڑائی۔ ''سنی! تم دیکھ رہی ہو اپنے باپ کی حرکت، رضوان پہلے تو ایسے نہ تھے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ سارا گھر پاگل ہو گیا ہے یا ہونے والا ہے۔'' فوزیہ کا اشارہ ثناء کی جانب بھی تھا جسے سمجھ کر وہ مسکرا دی۔

رضوان کی بات سن کر سب بہنیں خوش ہو گئیں تو رضوان عمر سے بولے۔

''سنو بیٹا! اگرچہ اب صباء نہیں رہی مگر اس کے روپ میں تم زندہ ہو۔ بیٹا، ماموں سے ملنے کے لیے کبھی کبھار چلے آنا۔'' ان کی آواز گلوگیر ہو گئی تو عمر کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ بہنیں تو باقاعدہ رونے لگیں۔ رضوان ایک ایک بہن کو گلے سے لگا کر چپ کروانے لگے۔ ثناء کا جی چاہا وہ بھی ایک ایک پھپھو کے گلے مل کر روئے۔ آنسو باہر آنے کے لیے مچل رہے تھے مگر محض ماں کی وجہ سے ضبط کیے کھڑی رہی جبکہ دادی جان برآمدے میں کھڑی بے آواز اور بے آنسو روتی رہیں۔ یہ ثناء کے دل نے محسوس کیا تھا۔

پھر وہ سب لوگ چلے گئے اور ثناء تھکی تھکی سی بوجھل قدموں سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کو یقین تھا کہ عمر اب کبھی پلٹ کر نہیں آئے گا۔ یہی وجہ تھی جو وہ باہر ضبط کا دامن پکڑے کھڑی تھی۔ اپنے کمرے میں آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ساری رات تو ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ اب روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

جبکہ باہر فوزیہ اپنے عزیزوں کو ناشتہ کرواتے ہوئے رضوان کی بہنوں کو برا بھلا کہتی رہی۔

اس کو ثناء پر بھی شدید غصہ آ رہا تھا۔ جو ان سب کو ناشتہ کروا کے اب اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

رضوان بھی بہنوں کے جاتے ہی آفس چلے گئے تھے اور وہ غصے سے کھولتی ہوئی دانت پیس رہی تھی۔

وقت گزر رہا تھا یا تھم گیا تھا۔ ثناء اب اس احساس سے عاری ہو گئی تھی۔ دن رات کو سوچیں تھیں یا پھر عمر کی یاد۔

یادوں میں گم سمجھ میں نہیں آتا تھا کرے تو کیا کرے۔ وہ کوئی ایک فیصلہ کرنا چاہتی تھی مگر کر نہ پا رہی تھی۔ ایک تو وہ عمر کی وجہ سے پہلے ہی بے سکون تھی۔ دوسرے یونیورسٹی میں سہیل کی حرکتوں سے تنگ آ چکی تھی۔ حالانکہ یہی حرکتیں کبھی اس کو پسند تھیں کیونکہ اس وقت اسے ان حرکتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سہیل اس سے محبت کرتا تھا۔

کوئی چارہ نہ تھا۔ جبکہ دل دیوانہ ہر دم اب ایک ہی بات کی رٹ لگائے جاتا تھا۔

'عمر نہیں آیا تو کیا ہوا تم خود اس کے پاس چلی جاؤ۔ مگر کیسے چلی جاؤں؟ وہ تو میری صورت سے بھی نفرت کرتا ہے۔ وہ مجھے دیکھنا تو دور کی بات، میری آواز سننا بھی پسند نہیں کرتا۔'

'اف اللہ میں کیا کروں؟' وہ کب سے کتاب سامنے رکھے انہیں خیالات میں گم تھی کہ اچانک سہیل نے آ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ثناء کو گویا کرنٹ لگ گیا ہو۔

''کیا بات ہے؟'' ثناء نے تحمل سے پوچھا۔ ورنہ اس کا جی چاہا کاندھے پر رکھا ہوا سہیل کا ہاتھ کاٹ کر پھینک دے لیکن ابھی تک تو وہ نارمل رول ادا کر رہی تھی۔

''کن خیالوں میں گم تھیں کہ میری آمد کا احساس تک نہ ہو سکا؟'' سہیل نے مسکرا کر پوچھا۔

''کیسے خیال، میں تو کتاب پڑھ رہی تھی۔'' ثناء نے صاف جھوٹ بولا۔

''خیر چھوڑو چلو کینٹین میں چلتے ہیں۔'' سہیل نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔

''کوئی ضروری بات ہے کیا؟'' ثناء نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''ضروری سے کیا مطلب؟ مابدولت کی تو ہر بات ضروری ہوتی ہے۔'' سہیل کے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ بکھر گئی۔

ثناء نے دانت پیستے ہوئے دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہا اور پھر کتاب پر جھک گئی۔

"اٹھو بھئی۔ یہ پڑھائی وڑھائی بعد میں کر لینا۔" سہیل نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"پلیز سہیل! یہ یونیورسٹی ہے۔" ثناء نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ یونیورسٹی ہے۔" سہیل چڑ کر بولا۔ "اور باہر اب تم ملتی کب ہو۔ حد تو یہ ہے کہ تم نے ہمارے گھر آنا بھی چھوڑ دیا اور اگر میں تمہارے گھر آتا ہوں تو وہاں بھی تنہائی نہیں ملتی۔ تم کسی نہ کسی بے مقصد کام میں لگی رہتی ہو۔"

"تنہائی میں تمہیں کیا کہنا ہے۔" ثناء کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی مگر اس نے ضبط کی آخری کوشش کی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو ثناء؟" سہیل کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کیا تمہیں شک ہے؟" ثناء بے رخی سے بولی۔

"ہاں، مجھے شک ہے ثناء! تم اتنی کیوں بدل گئی ہو؟ یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم میری منگیتر ہو یہ بات تمہیں یاد رکھنی چاہیے۔ میرا حق ہے تم پر۔"

ثناء کوشش کے باوجود ضبط نہ کر سکی، چیخ کر بولی۔ "ہاں، ہاں منگیتر ہوں مگر بیوی نہیں تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔ آئندہ تمیز سے بات کرنا ورنہ۔" مارے غصے کے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ورنہ تم کیا کر لو گی؟" سہیل کو بھی غصہ آ گیا۔

"میں۔" ثناء سفاکی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ منگنی توڑ دوں گی۔"

"منگنی توڑ دو گی؟" سہیل حیرت میں ڈوب کر بولا۔ مگر وہ اس کا جواب سننے کے لیے وہاں رکی کب تھی۔

آج جمعرات کا دن تھا۔ وہ پھول اور اگربتیاں لے کر سیدھی قبرستان چلی گئی۔

مگر صباء کی قبر سے کچھ دور ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ قبر پر اگربتیاں سلگ رہی تھیں اور کوئی بڑے احترام سے پھول ڈال رہا تھا۔ ثناء وہیں ایک طرف کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی وہ کوئی اور نہیں، میجر عمر فاروق تھا۔ ثناء کو یاد آیا۔ جب سے صباء کی اس پر حقیقت کھلی تھی وہ ہر جمعرات کی شام کو قبر پر آتی تھی۔ تب یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوتی تھی۔ یہ کون ہے جو اس کے آنے سے قبل ہی قبر پر پھولوں اور اگربتیوں کے علاوہ خوشبو بھی چھڑک جاتا تھا۔ پہلے اس کے ذہن میں عمر کا خیال آیا تھا۔ مگر پھر اس نے سوچا وہ بھلا اتنی دور سے کیوں آنے لگا

مگر آج وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ یوں بھی عمر کو دیکھنے کے لیے دل ہر دم مچلتا تھا اور اس وقت وہ اس کے روبرو تھا اور وہ سوچ رہی تھی۔ عمر کو نہیں معلوم ساتھ والی قبر آفاق کی ہے۔ ورنہ وہ وہاں بھی پھول ضرور ڈالتا۔ خوشبو چھڑکتا۔

اچانک دعا ختم کر کے عمر نے منہ پر ہاتھ پھیرا اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ ثناء تب تک وہاں کھڑی رہی۔ جب تک جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز نہیں آئی۔

اور پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ سب سے پہلے اس نے آفاق کی قبر پر پھول ڈالے اور پھر صباء کی قبر پر اور کچھ دیر بعد وہ دعا ختم کر کے واپس آ رہی تھی اور دل میں خیال آ رہا تھا۔ کاش ایسا ہو وہ جیسے ہی گھر جائے عمر سامنے لان میں بیٹھا ہوا نظر آئے مگر وہ جانتی تھی ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ عمر اب کبھی ان کے گھر نہیں آئے گا۔

وہ تھکی تھکی سی گھر آئی تو لان میں بجائے عمر کے اس کی نانی بیٹھی تھیں۔ نانی کو دیکھتے ہی اس کا موڈ آف ہو گیا۔ وہ سیدھی اپنے کمرے کی جانب بڑھی تو فوزیہ نے آواز دی۔

"ثنی! کیا تم تمیز بھول گئی ہو؟"

"جی ممی، کیا کیا ہے میں نے؟" ثناء ان کی بات سمجھ کر بھی انجان بن گئی۔

"تمہیں دکھائی نہیں دیا۔ تمہاری نانی جان آئی ہیں۔"

"اچھا" ثناء نے پلٹ کر نانی کو دیکھا۔ "پھر کیا کروں ممی؟"

"سلام کرو نانی جان کو۔" فوزیہ اس کے انجان بننے پر دانت پیس کر بولی۔

"او۔ کے ممی میں سلام کرتی ہوں ان کو مگر آج ذرا ایک بات تو بتائیں کیا نانی کو سلام کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔"

"ثنی؟" فوزیہ نے سخت لہجے میں پکارا۔

"جی ممی، کیا میں نے کچھ غلط کہا ہے؟" ثناء نے تیزی سے ڈرائی فروٹ کھاتی ہوئی نانی کو دیکھا۔ اس عمر میں بھی ان کے دانت اتنے مضبوط تھے کہ بادام اپنے ہی دانتوں سے توڑ رہی تھیں۔

"ثنی، ثنی تم اپنی بگڑتی ہوئی عادتیں درست کر لو۔ یونیورسٹی میں تم نے سہیل سے کیا کچھ نہیں کہا۔ تمہیں شرم آنی چاہیے، ایسی باتیں کرتے ہوئے۔"

"مگر ممی! میں نے تو سہیل سے کچھ بھی نہیں کہا۔"

''تم نے یہ نہیں کہا کہ تم منگنی توڑ دو گی۔''

''ہاں یہ تو میں نے کہا ہے۔ میں مانتی ہوں۔'' ثناء نے بڑے فخر سے کہا۔

''اور ابھی تم کہتی ہو تم نے کچھ نہیں کہا۔'' فوزیہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ ''میں پوچھتی ہوں اس کے بعد باقی کیا رہ جاتا ہے۔ یہ تمہیں دن بہ دن کیا ہوتا جا رہا ہے ثنی! میں تمہارے لیے بہت پریشان ہوں۔''

''ممی! شاید میری عقل داڑھ نکل رہی ہے۔'' ثناء نے نانی کے سامنے رکھی ہوئی باداموں والی چھوٹی ٹرے اٹھالی۔

''عقل داڑھ نکل رہی ہے اور اثر اس کا الٹ ہو رہا ہے۔'' فوزیہ نے اسے گھورا۔

''نہیں ممی!'' ثناء بادام توڑ کر گری منہ میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے ایسا محسوس کیا ہے ورنہ اثر تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہو رہا ہے میرے خیال میں۔''

''دیکھا امی آپ نے یہ، یہ ثنی۔'' فوزیہ نہ جانے اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتی تھی کہ ثناء ٹرے تھامے انہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ پھر صباء کے بارے میں سوچنے لگی۔

''پھپھو، آپ نے یہ سب اتنا عرصہ کیسے برداشت کیا۔ میرا تو دم گھٹنے لگا ہے اس ماحول میں۔ مگر میں کیا کروں کوئی راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ آپ کے وہ عمر تو میری شکل سے بھی نفرت کرتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود پھپھو میرا آپ سے وعدہ ہے۔ شادی ہو گی تو عمر سے ورنہ میں بھی ساری عمر یونہی تنہا گزار دوں گی۔'' اس نے انگلی میں پہنی منگنی کی انگوٹھی اتار دی اور صباء کے ہاتھ سے اتری ہوئی انگوٹھی پہن لی وہ انگوٹھی جو آفاق کی نشانی تھی اور وہ دونوں اس انگوٹھی کو چھوڑ کر ملک عدم جا چکے تھے۔ ثناء نے انگوٹھی چوم کر آنکھوں سے لگائی اور پھر نومی کی آواز سن کر چونک پڑی۔

''آپی! ممی آپ کو بلا رہی ہیں۔'' نومی دروازے میں کھڑا تھا۔

''تم جاؤ میں آتی ہوں۔'' ثناء نے کہا اور آرام سے بستر پر لیٹ گئی۔ ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ فوزیہ نے خود آواز دی تو وہ یوں اکڑ کر باہر آئی جیسے یہ بھی ان کے سر کوئی احسان کر رہی ہو۔ مگر یہ کیا باہر تو اب سہیل بھی موجود تھا۔ بلیک پینٹ اور میرون ٹی شرٹ میں ملبوس بقول ثناء ''سہیل یہی ڈریس زیادہ پہنا کرو، یہ تم پر خوب سجتا ہے۔'' اور آج وہ سج

کر آیا تھا۔ ثناء کو بڑے زور کی ہنسی آئی۔ 'مسٹر سہیل اب تم کچھ بھی کر لو، سونے کے بھی بن جاؤ تو میں تمہاری نہیں ہو سکتی۔' وہ خاموشی سے آ کر ان کے قریب کھڑی ہو گئی تو فوزیہ نے پوچھا۔

''ثنی! یونیورسٹی سے تو تم ایک بجے ہی آ گئی تھیں مگر گھر تم ابھی کچھ دیر قبل آئی ہو، کہاں رہیں اتنی دیر؟''

''یہ بتانا کیا بہت ضروری ہے۔'' ثناء نے زہرخند سے کہا۔

سہیل نے بے چارگی سے اسے دیکھا اور پریشان سا بولا۔ ''دیکھا پھپھو، پتہ نہیں اسے کیا ہوتا جا رہا ہے۔ آپ ہی کچھ بتائیں میری اپنی سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔''

''میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں پاگل ہوں مگر تمہیں سمجھنے کی کوئی ضرورت نہیں مجھے۔'' ثناء نے تلخ لہجے میں کہا۔ اسے ان سب کی پریشانی دیکھ کر اندر ہی اندر خوشی ہو رہی تھی۔

سہیل ابھی تک اس کی نفرت کو نہیں سمجھ سکا تھا۔ کیونکہ وہ خود تو اب بھی ثناء سے ویسی ہی محبت کرتا تھا جیسے پہلے کرتا تھا۔ اب یہ اور بات تھی کہ ثناء بدل گئی تھی۔ سہیل بے وقوفی سے بولا۔

''پھپھو جان! جب سے یہ صباء کے کمرے میں سونے لگی ہے تب سے۔''

''تمیز سے نام لو وہ میری پھپھو تھیں۔'' ثناء نے غصے سے چیخ کر کہا۔ وہ بہت ضبط کرنا چاہتی تھی مگر کر نہ پا رہی تھی۔

ثناء کی بات پر فوزیہ نے چونک کر اسے دیکھا اور سوچنے لگی۔ 'مجھ سے کہاں غلطی ہوئی جو اپنوں کی محبت ثناء کے دل میں جاگ رہی ہے۔ میں نے تو اس کی پرورش زیادہ تر نانی کے گھر میں کی اور اس گھر میں بھی اٹھتے بیٹھتے اس کی نانی، ماموں اور ممانی ہی کی باتیں کرتی رہی مگر اس کے باوجود کہیں نہ کہیں غلطی ضرور ہوئی ہے۔ مجھ سے مگر کہاں؟' وہ سر جھٹک کر سوچنے لگی پھر اسے سہیل کی بات سچ لگی کہ جب سے وہ صباء کے کمرے میں سونے لگی ہے۔ اگر یہ بات ہے تو اب میں اسے اس کمرے میں نہیں سونے دوں گی۔ ہو سکتا ہے اس کمرے میں لیٹ کر اسے صباء کی ناکام زندگی کا خیال آتا ہو۔ ہاں یہ صحیح ہے۔

''پھپھو جان! آپ کیا سوچنے لگیں؟'' سہیل نے اسے مخاطب کیا۔ ''اور ثنی تم بھی پلیز بیٹھ جاؤ۔''

''نہیں بیٹھتی میں۔ کیا کر لو گے تم میرا؟'' ثناء نے بدتمیزی سے کہا۔

فوزیہ نے شدید غصے سے اسے دیکھا۔ ''ثنی تمہارا دماغ ٹھیک ہونے والا ہے۔''

''جی ممی، وہ بھی کر کے دیکھ لیجیے۔'' ثناء لاپرواہی سے کاندھے اچکا کر بولی۔

''تم بہت بدتمیز ہوگئی ہو ثنی، اور کسی کا نہیں تو سہیل کا لحاظ تو کرو یہ تمہارا منگیتر ہے۔''

''اچھا۔'' ثناء نے چونک کر سہیل کو دیکھا یوں جیسے سوتے میں جاگ پڑی ہو پھر ایک دم بدلی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آپ نے پہلے ہی بتا دیا ہوتا ممی...... کیا مجھے باقاعدہ ان سے معافی مانگنا ہوگی۔'' اس نے ایک ٹک سہیل کو دیکھتے ہوئے کہا...... اور سہیل گھبرا گیا۔

''پھپھو جان! اس کو کسی اچھے اسپیشلسٹ کو دکھائیں۔ میرے خیال میں تو یہ خود بھی نہیں جانتی کہ یہ کیا کہہ رہی ہے، کیا کر رہی ہے۔''

ثناء نے گھور کر اسے دیکھا اور بال درست کرتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور ایسے میں اچانک فوزیہ اور سہیل کی نظر ایک ساتھ ثناء کے ہاتھ پر گئی۔ جہاں منگنی کی انگوٹھی غائب تھی اور اس کی جگہ وہ انگوٹھی تھی جو صبا ہر وقت اپنی انگلی میں پہنے رہتی تھی۔

''منگنی کی انگوٹھی کہاں ہے؟'' فوزیہ نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ممی! وہ تو میں نے اتار کے رکھ دی۔'' ثناء نے معصومیت سے بتایا۔

''ثنی! فوراً وہ انگوٹھی پہن لو ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' فوزیہ غصے سے ہانپنے لگی۔

''جی بہتر ممی!'' ثناء مسکراتی ہوئی مڑی۔

''اور سنو۔'' اسے نرم دیکھ کر فوزیہ پُر رعب لہجے میں بولی۔ ''اب تم صباء کے کمرے میں نہیں رہوگی۔ یہ سارا اسی کا اثر ہے تم پر۔ جو تم اس قسم کی حرکتیں کر رہی ہو۔ ارے مر کر بھی اس ڈائن نے......''

''ممی پلیز......!'' ثناء نے احتجاج کیا۔ ''آپ نے انہیں جینے تو آرام سے نہیں دیا مگر مرنے کے بعد تو کوئی الزام مت دیجیے ورنہ میں۔''

''ہائیں، ہائیں۔'' فوزیہ آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی۔ ''یہ تم بول رہی ہو؟'' مگر ثناء نے کوئی تردید نہ کی۔ انہیں اسی حالت میں چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور فوزیہ بے بسی کی تصویر بن کر بولی۔

''دیکھو بیٹا، وہ اپنے حواس میں نہیں، اس کو نہیں معلوم وہ کیا کر رہی ہے۔ تم کچھ خیال نہ کر لینا۔''

''جی بہتر پھپھو جان۔'' سہیل نے کہا اور فوزیہ ثناء کے بارے میں سوچنے لگی۔

کوشش کے باوجود اب ثناء سے ضبط نہیں ہو رہا تھا۔ وہ کھل کر ہر بات کرنا چاہتی تھی۔ کہنا چاہتی تھی اور عمر کے پاس جانا چاہتی تھی۔ مگر کوئی حل نظر نہ آ رہا تھا۔ عمر کا خیال آتے ہی اس نے ان کے نمبر ڈائل کیے اور ریسیور کانوں سے لگا لیا۔

''ہیلو۔ میجر عمر فاروق۔'' ماؤتھ پیس میں اس کی آواز ابھری اور ثناء چپ چاپ اس کے نام کی ٹھنڈک اپنے دل میں اتارنے لگی۔

''ہیلو۔'' اس نے دو ایک بار کہا اور فون بند کر دیا۔ ثناء سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ بولتی بھی تو کیا۔ اس نے دوبارہ نمبر ڈائل کیے۔

''ہیلو میجر عمر فاروق! ہیلو ہیلو......'' اس نے دوبارہ کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ ثناء نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ تیسری باری فون کیا اور اس کی جھلائی ہوئی آواز سن کر مسکرا دی۔

''ہیلو میجر عمر اسپیکنگ۔''

''بیٹا کون تنگ کر رہا ہے۔'' ثناء نے قریب ہی پھپھو پروین کی آواز سنی۔

''معلوم نہیں ممی۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ثناء نے چوتھی بار نمبر ڈائل کیے، کافی دیر گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے ریسیور نہ اٹھایا اور ثناء نے مسکراتے ہوئے خود ہی فون بند کر دیا۔

صبح ناشتہ اس نے اپنے کمرے میں کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح صباء کیا کرتی تھی اور جب یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو کر باہر آئی تو فوزیہ، رضوان کے قریب پریشان، پریشان سی کھڑی تھی۔

''ثنی!'' رضوان نے پیار سے آواز دی۔

''جی پاپا۔'' اس نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ویسے وہ سمجھ گئی تھی کیا معاملہ درپیش ہے۔

''بیٹے! یہ آپ کی ممی کیا کہہ رہی ہیں؟'' رضوان نے انجان لہجے میں کہا۔ حالانکہ انہیں خوشی تھی کہ جو کام وہ اپنا گھر بسانے کی وجہ سے نہ کر سکے۔ اس کو ثناء نے اب اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

''مجھے کیا معلوم پاپا کہ ممی کیا کہہ رہی ہیں۔ میں غیب کا علم نہیں جانتی۔'' فوزیہ نے گھور کر اسے دیکھا مگر چپ رہی۔

"بیٹے! ان کو آپ سے شکایت ہے۔ آپ نے کل سہیل کے ساتھ برا سلوک کیا ہے اور نانی جان کو سلام بھی نہیں کیا۔"

"پاپا! سلام کرنا کیا صرف نانی جان کے لیے لازمی ہے۔ پھپھیاں بھی تو اسی گھر میں آتی تھیں۔ تب تو ممی نے کبھی نہیں کہا تھا کہ انہیں سلام کرو۔" ثناء نے طنزیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔

"دیکھا! دیکھا آپ نے۔ یہ کل سے اسی قسم کی باتیں اور حرکتیں کر رہی ہے۔" فوزیہ رو دینے کے قریب تھی۔

"دیکھو ثنی! ممی کو خواہ مخواہ پریشان نہیں کرتے۔" رضوان نے اوپری دل سے اسے سمجھایا۔

"میں کب پریشان کرتی ہوں پاپا! ممی کو خود ہی میری باتیں بری لگنے لگی ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اب گھر میں کوئی اور ایسی ہستی نہیں جس پر برس کر ممی اپنا غصہ نکال سکیں۔"

"رضوان!" ثناء کا طنز سمجھ کر فوزیہ نے احتجاج کیا۔

"ممی! پاپا کو کیوں بیچ میں لا رہی ہیں؟" ثناء نے انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی کو گھماتے ہوئے کہا۔ اور انگوٹھی دیکھ کر فوزیہ کی جان جل گئی۔ وہ پھر صباء کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھی۔

"رضوان! دیکھ لیجیے، اس نے منگنی کی انگوٹھی بھی اتار دی ہے۔" فوزیہ نے بڑی لاچاری سے رضوان کو دیکھا اور رضوان کو بھی اس پر ترس آ گیا۔ بولے۔

"ثنی! جاؤ پہلے جا کر منگنی کی انگوٹھی پہن کر آؤ پھر یونیورسٹی جانا۔"

"کیوں پاپا! کیا انگوٹھی اتارنے سے منگنی ٹوٹ جاتی ہے؟"

"جو کہا ہے وہی کرو ثنی۔ انگوٹھی بدل کر آؤ۔" رضوان نے کچھ سخت لہجے میں کہا کیونکہ وہ فی الحال بات کو زیادہ الجھانا نہیں چاہتے تھے۔ یوں بھی اگر بات بڑھتی تو انہیں آفس کی دیر ہو جاتی۔

ثناء چپ چاپ اپنے کمرے میں گئی اور منگنی کی انگوٹھی پہن کر واپس آ گئی۔ منگنی کی انگوٹھی دیکھ کر فوزیہ کو تھوڑا سا اطمینان ہوا اور اس نے سوچا۔ 'ابھی ثناء سدھر سکتی ہے۔ میں سختی کی بجائے نرمی سے کام لوں گی۔'

"پاپا! آپ کو میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے تھی۔" ثناء نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے غصیلے لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری بات سمجھتا ہوں ثنی، مگر جو گزر گیا۔ اس کو ہم واپس نہیں لا سکتے اور پھر بیٹا......"

"پاپا! آپ نہیں جانتے جو گزرا ہے، کس اذیت سے گزرا ہے۔ مجھے حیرت ہے پاپا اس گھر میں ہوتے ہوئے بھی آپ نے پھپھو کے لیے کچھ نہ کیا۔ آپ نے ان سے کچھ نہ پوچھا۔ آپ کیسے بھائی تھے پاپا؟"

"پتہ نہیں بیٹا میں کیسا بھائی تھا۔ بعض دفعہ انسان حالات کے سامنے بہت مجبور ہوتا ہے۔"

"نہیں پاپا! انسان اگر کچھ کرنا چاہے تو اس کے راستے میں کوئی مجبوری حائل نہیں ہو سکتی۔ ہماے گھر میں ہمارے اس گھر میں جہاں دن رات قہقہے برستے ہیں۔ ایک ہستی نے عمر قید با مشقت گزاری اور ہم نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ تم نے کیا جرم کیا تھا جس کی تمہیں یہ سزا ملی۔ حالانکہ اس ہستی نے تو کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ جرم تو ہم سب نے کیے تھے پاپا! مگر سزا ایک بے گناہ کو ملی۔ اس کا جرم کیا تھا پاپا! صرف یہ کہ باپ نہیں کماتا تھا اور بھائی؟ پاپا اپنے گھر کے لوگوں کی خوشیوں کے لیے ایک انسان تمام آرزوؤں سے منہ موڑ لیتا ہے۔ مگر وہ گھر والے، پاپا آپ کو معلوم ہے؟" ثناء انہیں آفاق کے بارے میں بتاتے بتاتے چپ ہو گئی اور رضوان اسے نم آنکھوں سے یونیورسٹی ڈراپ کر گئے۔ وہ اس کے کسی ایک سوال کا بھی تو جواب نہ دے سکے تھے۔

گاڑی سے اتر کر وہ حیرت سے سہیل کی جانب دیکھنے لگی جو پہلے ہی سے اس کی آمد کا منتظر تھا۔ ثناء نے بھی کوئی ناخوشگوار بات نہ کی۔ چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگی۔



وقت تھوڑا اور آگے بڑھ گیا تھا۔ یونیورسٹی میں وہی باتیں وہی ہنگامے تھے مگر خود ثناء کا دل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ اب تو پڑھنے کو بھی اس کا دل نہیں چاہتا تھا۔ اپنے سابقہ رویے کو یاد کر کے وہ سوچتی۔ ڈگریاں لینے سے انسان تعلیم یافتہ تو بن جاتا ہے۔ انسان نہیں بنتا۔ ڈگریاں رکھتے ہوئے بھی جس کے دل میں بزرگوں کے لیے احترام نہ ہو۔ چھوٹوں کے لیے

پیار نہ ہو۔ اس کے لیے ڈگری کا ہونا یا نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کلاس میں ہوتے ہوئے بھی وہ کبھی لیکچر دھیان سے نہ سن پاتی۔

آخری پیریڈ کی حاضری لگوا کر وہ باہر آئی تو سہیل اس کا منتظر تھا۔ شاید اس کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ آج کل لیکچر مس کرنے لگی ہے۔

''کیوں بھئی، یہاں کس خوشی میں کھڑے ہو؟'' ثناء نے اخلاقاً پوچھ ہی لیا۔

''میں یہاں کب کھڑا تھا۔'' سہیل نے بوکھلا کر جواب دیا۔ ''میں تو یہاں سے جا رہا تھا تمہیں دیکھا تو رک گیا۔'' اس نے بات بنائی تو ثناء دل ہی دل میں ہنس پڑی۔

''تم شاید گھر جا رہی ہو؟'' سہیل نے ایک نظر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں اگر اعتراض ہے تو نہیں جاتی۔''

''نہیں۔ میں نے تو اس لیے کہا ہے کہ اگر تمہیں جانا ہے تو چلو ساتھ ہی چلتے ہیں۔'' سہیل نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''اچھی بات ہے چلو چلتے ہیں۔'' ثناء ٹھنڈی آہ بھر کر بولی اور سہیل خوش ہو گیا۔

وہ اس کو چھوڑنے گھر ضرور آیا مگر اب وہ بھی محتاط ہو چکا تھا۔ اس لیے کوئی ایسی ویسی حرکت کرنا تو دور کی بات اس نے کوئی بات بھی نہ کی۔ گھر کے سامنے گاڑی روک کر اس نے پلٹ کر یوں ثناء کو دیکھا گویا پوچھ رہا ہو۔ ''میں بھی اندر چلوں؟''

ثناء اس کا مطلب سمجھ گئی اور فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولی۔ ''سلو! تم اندر نہیں آؤ گے؟''

اور سہیل خوشی سے پاگل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ بہت دنوں بعد اس نے سلو کہا تھا ورنہ وہ تو اب خشک لہجے میں 'سہیل' کہہ کر مخاطب کرنے لگی تھی۔ جلدی سے گاڑی لاک کر کے وہ ثناء کے ساتھ ہی اندر آیا۔ اگر ثناء کی محبت نفرت میں بدل گئی تو الگ بات تھی وہ تو اب بھی ثناء سے پہلے جیسی محبت کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ ثناء پھر سے ویسی بن جائے مگر اس کو نہیں معلوم تھا وہ ہمیشہ کے لیے بگڑ چکی ہے اور اب سہیل کی بجائے عمر کی دال گلنے لگی تھی۔

وہ دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور دونوں کو پھر سے ایک ساتھ دیکھ کر فوزیہ خوشی سے نہال ہو گئی۔ بلکہ صبح والی تلخی بھی بھول گئی۔

''کھانا لگاؤں؟'' اس نے دونوں کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''فومی، نومی آ گئے ہیں کیا؟'' ثناء نے بیگ ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ لوگ تو ابھی نہیں آئے۔'' فوزیہ نے نرم لہجے میں کہا۔

''تو ٹھیک ہے جب وہ دونوں آئیں گے تب ہم سب مل کر کھانا کھائیں گے کیوں سلو؟'' ثناء نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''ہاں، ہاں ٹھیک ہے۔'' سہیل نے جلدی سے کہا اور ثناء اپنا بیگ پکڑ کر اٹھتی ہوئی بولی۔ ''اچھا تو تب تک میں ذرا منہ ہاتھ دھو لوں۔'' وہ چلی گئی اور فوزیہ سہیل کو دیکھنے لگی۔

''تم اسے لائے ہو یا وہ خود تمہارے ساتھ آئی ہے۔'' فوزیہ نے آہستہ سے پوچھا۔

''پھپھو! میں نے اسے آفر کی تھی ڈراپ کرنے کی، جسے اس نے مان لیا۔'' سہیل نے راز داری سے بتایا۔

''اچھا۔'' فوزیہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''ویسے تم فکر مت کرو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ صبح اس کے پاپا نے اسے ڈانٹ پلائی تھی۔ بس تم ذرا فائنل ایئر سے فارغ ہو جاؤ پھر شادی کر دیں گے بعد میں ثناء پڑھے یا نہ پڑھے خود اس کی اپنی مرضی ہو گی۔ ہماری فکر تو دور ہو جائے گی۔ آج کل تو میں بہت پریشان ہوں۔''

''ہاں پھپھو جان! میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' سہیل نے خوش ہوتے ہوئے کہا اور فوزیہ بھی سر ہلانے لگی۔



"ارے واہ یہ آج سہیل بھائی یہاں کیسے؟" نومی نے انہیں دیکھتے ہوئے ہنس کر پوچھا اور وہ دونوں۔ جو اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے، نومی کی آواز سن کر چونک پڑے۔ پھر فوزیہ نے گھور کر نومی کو دیکھا اور ڈانٹ کر کہا۔ "کیوں، کیا پہلے سہیل یہاں کبھی نہیں آیا جو تم یہ بات کہہ رہے ہو؟"

"ممی! آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں۔" نومی نے لاپرواہی سے انہیں دیکھا۔ "اس سے قبل سہیل بھائی آتے تھے۔ آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا۔" نومی، سہیل کے ساتھ لگ کر صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ بذات خود آئے ہیں یا لائے گئے ہیں۔ آپس کی بات ہے بتا دینے میں کوئی حرج نہیں، ہاں۔" اس نے کان سہیل کے منہ کے سامنے کیا اور سہیل قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ یہ قہقہہ بھی اس نے بہت دنوں بعد لگایا تھا۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا سہیل بھائی!" نومی ہنستے ہوئے بولا۔

"نومی! کیا بکواس کیے جا رہے ہو۔ ثنی اسے خود لائی ہے، دوپہر کے کھانے کے لیے۔" فوزیہ نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"آپی لائی ہیں۔ یعنی ثناء آپی، سہیل بھائی کو یہاں لائی ہیں، ناممکن۔ میں تو حیران ہوں۔ وہ ایسا کبھی نہیں کرسکتیں۔ آپ جھوٹ کہہ رہی ہیں کیوں سہیل بھائی؟"

"نومی! تمہیں شرم آنی چاہیے ماں کو جھوٹی کہتے ہوئے۔ میں جھوٹ بول رہی ہوں تمہارے خیال میں، کیوں؟ کیا تم میری کوئی بزرگ ہستی ہو جس سے میں ڈر گئی ہوں۔ تم لوگ بات کرنے کی تمیز بھی بھولتے جا رہے ہو۔" فوزیہ نے غصے سے کہا۔

"ممی! یہ بات نہیں۔ آپ غلط سمجھی ہیں۔ میں تو اس خیال سے کہہ رہا تھا کہ آپ کو

معلوم ہے۔ پھپھو صباء کے چہلم پر جب عمر بھائی، وضو کرنے گئے تھے تو ثناء آپی اپنا ناول مجھے دیتے ہوئے بولی تھیں۔ "نومی، پلیز جلدی سے جاؤ اور یہ ناول عمر کو دے آؤ۔ اسے اس کی ضرورت ہے۔"

"کیا؟" فوزیہ کا دل دھک سے رہ گیا اور سہیل بھی چونک پڑا "تمہیں یقین ہے اس نے ایسا ہی کہا تھا ہوسکتا ہے اس نے سہیل کا کہا ہو اور تم سے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔"

"نہیں ممی۔" نومی راز داری سے آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ "میں نے خود ان سے پوچھا تھا۔ 'آپی، سہیل بھائی کو یا عمر بھائی کو؟' اس پر وہ مجھے جھڑک کر بولی تھیں گدھے 'عمر کو' مگر ممی! آپ جانتی ہیں جب میں ناول عمر بھائی کے پاس لے کر گیا تو انہوں نے کیا کہا تھا۔"

"کیا کہا تھا؟" سہیل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور فوزیہ بھی ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"انہوں نے کہا تھا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ شکریہ۔"

"کیا واقعی، اس نے ایسا کہا تھا؟" فوزیہ نے جلدی سے پوچھا۔

"جی ممی! انہوں نے بالکل یہی کہا اور ثناء آپی ناول لے کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ممی مجھے تو سہیل بھائی کے لیے۔"

"نومی! بکواس مت کرو مجھے معلوم ہے ایسا نہیں ہوا ہوگا۔ تم یہ سب جھوٹ کہہ رہے ہو۔" فوزیہ نے سہیل کی وجہ سے کہا۔ ورنہ اسے یقین تھا بالکل ایسا ہی ہوا ہوگا۔ کیونکہ ان کی بھاوج نے بھی شکایت کی تھی کہ ثناء نے اسے ٹی۔ وی لاؤنج میں یہ کہہ کر جانے سے روک دیا تھا کہ یہاں اس کی پھپھیاں سوئیں گی اور پھر جس طرح اس نے بھری محفل میں نانی کو لاجواب کیا تھا وہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ اس نے یہ کہہ کر ان کی خاطر مدارات کی کہ وہ لوگ جلدی چلے جائیں۔ اف میں کند ذہن پہلے ہی کیوں نہ یہ سب کچھ سمجھ گئی؟ مگر وہ سہیل کے سامنے یہ سب نہیں کہنا چاہتی تھی کہ کہیں اس کے دل میں میل نہ آئے۔ یہی وجہ تھی، وہ نومی کو ڈانٹنے لگی کہ یہ سب جھوٹ ہے۔

"یہ جھوٹ نہیں ہے ممی، لیجیے آپی آگئیں آپ انہی سے پوچھ لیں۔" نومی نے سامنے آتی ہوئی ثناء کی جانب اشارہ کیا۔

"کیا پوچھنا ہے بھئی؟" اس نے سہیل کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ حالانکہ وہ سب کچھ سن چکی تھی اور اس وقت فوزیہ اور سہیل کی شکلیں دیکھ کر اسے دل ہی دل میں ہنسی

آ رہی تھی۔

''کچھ نہیں سنی۔'' فوزیہ نے موقعے کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے فوراً بات ختم کرنے کی کوشش کی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ثناء کسی بات سے انکار نہیں کرے گی۔ اس لیے اس نے بات ختم کرنی ہی مناسب سمجھی۔

''یہ فومی ابھی تک نہیں آیا؟'' ثناء نے گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیجیے میں حاضر ہوں۔'' فومی اپنی موٹر سائیکل کی چابی ہوا میں اچھالتا ہوا ان کے سامنے آ گیا۔ ''آہا آج تو سہیل بھائی بھی براجمان ہیں۔ کیا صلح ہو گئی؟'' اس نے ثناء کی جانب دیکھتے ہوئے شرارت سے پوچھا۔

''فومی! یہ کیا تم نے آتے ہی فضول بکواس شروع کر دی؟'' فوزیہ نے اسے سختی سے ڈانٹا۔

''ارے بھئی ہماری لڑائی کب ہوئی تھی جو صلح کا موقعہ آتا۔'' ثناء ماں کی کیفیت بھانپ کر مسکراتی ہوئی بولی۔

''اچھا تو یہ بات ہے؟'' فومی نے حیرانگی سے اسے دیکھا اور ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

''جی جناب یہی بات ہے۔'' ثناء نے ہنس کر کہا۔

''پھر تو سہیل بھائی آج آپ کو ہمیں کچھ کھلانا پلانا چاہیے۔''

''مثلاً؟'' سہیل جو ثناء کی بات پر پھول کر کپا بن گیا تھا۔ مسرور لہجے میں بولا۔

''دیکھیے سہیل بھائی! چونکہ آپ دونوں کے مزاج اب ٹھنڈے ہو چکے ہیں اس لیے ہمیں بھی ٹھنڈی ٹھنڈی آئس کریم کھلائیے۔'' فومی نے فوراً کہا۔

''اوہ یس یس۔'' نومی نے فومی کی بات کی تائید کی اور سہیل بٹوہ نکال کر پیسے دینے لگا۔

''اوکے ممی۔'' فومی نوٹ پکڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں یوں گیا اور یوں آیا۔'' اس نے چٹکی بجائی۔ ''آپ میرے آنے تک کھانا لگوائیے۔'' وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار چلا گیا۔ اور فوزیہ بھی کھانا لگانے کے لیے اٹھ گئی۔

''چلو نومی! تم بھی لباس تبدیل کر لو۔'' ثناء نے کہا اور جب نومی اٹھ کر چلا گیا تو سہیل نے سوچا۔ 'شاید پھر سے ثناء کا پہلے والا رومانی موڈ بن رہا ہے۔' تاہم وہ محتاط تھا۔ اپنی طرف سے پہل کر کے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ سو چپ چاپ بیٹھا رہا اور ثناء بھی کسی گہری سوچ میں گم انگلی میں پڑی منگنی کی انگوٹھی گھماتی رہی۔

''چلو بھئی بچو کھانا لگ گیا ہے۔'' فوزیہ کی آواز پر ان دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر ثناء مسکرائی اور سہیل نے بھی دانت نکال دیئے۔

اتنے میں فومی بھی آئس کریم لے کر آ گیا اور وہ سب لوگ کھانے کی میز پر آ گئے۔

کھانا کھاتے ہوئے وہ سب بے تحاشہ باتیں کر رہے تھے۔ ایک جمود سا تھا جو بہت دنوں بعد ٹوٹا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب نے آئس کریم کھائی۔ پھر سہیل مسکراتا ہوا اجازت لے کر چلا گیا کیونکہ اس کے خیال میں آج کے دن کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اسی لیے اس نے جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھی تھی اور ثناء نے بھی اس کو نہیں روکا تھا۔

پھر فوزیہ برتن اٹھوا کر میز صاف کروانے لگی اور ثناء اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ وارڈ روب سے سفری بیگ نکالا اور اس میں اپنے کپڑے رکھنے لگی۔ کپڑوں کے بعد اس نے آفاق کے خطوط، صباء کی ڈائری اور انگوٹھی بھی بڑی احتیاط سے سنبھال کر رکھی اور پھر بیگ بند کر کے وہ بستر پر لیٹ گئی اور اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں سوچنے لگی۔ فوزیہ کے ردعمل کے بارے میں غور کرنے لگی۔

پانچ بجے وہ نہا دھو کر بالکل فریش ہو گئی اور بیگ اٹھائے اپنے کمرے سے باہر آئی تو فوزیہ، دادی جان کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ ثناء کو دیکھا تو مسکرا کر پوچھا۔

''کہاں جانے کی تیاری ہے بھئی، ابھی تو موسم گرما کی تعطیلات میں کچھ روز باقی ہیں؟'' فوزیہ سمجھی شاید وہ مری جانے کے لیے ماموں کے گھر جا رہی ہے حالانکہ اسے یہ بھی حیرت تھی کہ اگر ان کا پروگرام تھا تو سہیل نے کیوں نہیں بتایا۔

ثناء آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ماں کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی اور بڑے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''ممی! میں اسلام آباد جا رہی ہوں۔''

فوزیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سر پر بم مار دیا ہے۔ تاہم خود کو تسلی دینے کے لیے اس نے سوچا ہو سکتا ہے یہ مری جانا چاہتی ہو۔ یہ بات اس نے خود کو تسلی دینے کے لیے سوچی تھی ورنہ ذہن میں تو جھکڑ چلنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود اس نے دنیا بھر کا پیار اپنے لہجے میں سمیٹ کر پوچھا۔

''سنی جان! تم کہاں جانے کی بات کر رہی ہو؟''

"ممی! شاید آپ نے سنا نہیں میں اسلام آباد جا رہی ہوں۔" اس نے لاپرواہی سے انہیں دیکھا۔

"اسلام آباد۔" فوزیہ کے حلق میں گویا کانٹا سا چبھ گیا مگر اس کے باوجود اس نے ایک بار اور پوچھنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

"سنی تم اسلام آباد کس کے پاس جاؤ گی؟" اگرچہ وہ جانتی تھی کہ وہ کہاں جائے گی۔

"ممی! میں اسلام آباد، پھپھو پروین کے گھر جاؤں گی۔" ثناء نے ایک ایک لفظ چبا کر ادا کیا۔ اور فوزیہ کا رنگ ایک دم پیلا ہو گیا۔ یوں لگا جیسے بلندی سے کسی نے زمین پر پٹخ دیا ہو۔ اب تک کی گئی محنت رائیگاں ہوتی ہوئی نظر آئی۔ مگر وہ بہت چالاک اور شاطر عورت تھی۔ جان گئی کہ خطرہ سر پر آ گیا ہے ایسے میں اس نے سختی کرنے کی کوشش کی تو بات بگڑ سکتی ہے جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے دل پر پتھر رکھ کر نرمی سے پوچھا۔

"سنی! یہ تمہیں آج وہاں جانے کا خیال کیسے آ گیا؟"

"بس خیال ہی ہے جب بھی آ جائے۔" ثناء نے لاپرواہی سے کہا۔

"ہوں۔" فوزیہ کچھ سوچنے لگی کہ اب کیا کیا جائے۔ ثناء کو اس نے سر چڑھایا تھا۔ اس لیے وہ جانتی تھی کہ ثناء اپنی ہی من مانی کرے گی تاہم بہت سوچنے کے بعد اس نے ایک راستہ نکالا اور کہا۔ "بیٹا پاپا سے تو اجازت لے لی ہوتی۔"

"پاپا! اونہہ، پہلے کبھی کسی نے اس گھر میں پاپا سے اجازت لی ہے جو میں اس نئی رسم کا آغاز کروں۔ یوں بھی مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ بس میں جانا چاہتی ہوں۔" ثناء نے بگڑ کر کہا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے باپ کے سر کوئی الزام آئے۔ حالانکہ پاپا سے کہہ کر ہی اس نے ریزرویشن کروائی تھی۔

"سنی! کیا تمہارا آج ہی جانا بہت ضروری ہے جبکہ تمہیں ان کے گھر کا ایڈریس بھی معلوم نہیں۔"

"میں جانتی ہوں ممی مگر اس کے باوجود میں آج ہی جاؤں گی۔" ثناء نے دادی کو دیکھا جو حیرت سے منہ کھولے بیٹھی تھیں۔ شاید یہ بات ان کے لیے بھی انہونی تھی کہ ثناء اور کسی پھپھو کے گھر جائے۔ چہ جائیکہ وہ گھر آئی ہوئی پھپھیوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ فوزیہ سوچ رہی تھی، اگر ثناء کو جانا ہی ہے تو وہ اسے اکیلی ہرگز نہیں جانے دے گی۔

ساتھ نومی یا فومی کو جاسوسی کے لیے ضرور بھیجے گی۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اس نے سوچا اور بولی۔

"ٹھیک ہے سنی تم جانا چاہتی ہو تو بے شک جاؤ مگر فومی یا نومی کو ضرور لے جاؤ تاکہ تمہیں پریشانی نہ ہو۔ ورنہ اکیلے میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔ اب فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔"

"ممی! مجھے جانا ہی ہے بلکہ ابھی، اور جاؤں گی بھی اکیلی۔ میں بچی نہیں کہ فومی یا نومی کی انگلی پکڑ کر چلوں۔" اس نے ترچھی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ "آپ میرا وقت ضائع نہ کریں۔"

فوزیہ جانتی تھی کہ سیلاب کے پانی کو کبھی کوئی نہیں روک سکا اور بھڑکتی ہوئی آگ پر بھی اگر پانی ڈالا جائے تو وہ اور بھڑک اٹھتی ہے آج اگر وہ بھی ثناء کو روکتی تو یہ آگ کچھ زیادہ ہی بھڑک اٹھتی۔ موقع محل کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس نے یہی بہتر جانا کہ آج اس کو جانے دے، باقی سب کچھ بعد میں دیکھا جائے گا۔ اس لیے نرم لہجے میں بولی۔ "اچھا سنی جاؤ مگر یہ تو بتاؤ واپس کب آؤ گی؟"

"آپ فکر مند کیوں ہوتی ہیں۔ میں وہاں مستقل رہنے نہیں جا رہی۔ جلد ہی آ جاؤں گی۔" وہ ہر بات کا تلخ اور الٹا جواب دے رہی تھی۔

"مگر آپی! یہ آپ کو وہاں جانے کی اچانک کیا سوجھی؟" فومی جو چپ چاپ کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ پوچھ بیٹھا۔ کیونکہ آج ہی سہیل سے صلح ہوئی تھی اور آج ہی وہ اسلام آباد جا رہی تھی۔ یعنی بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں، اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"تم بکواس مت کرو۔ چلو مجھے ایئرپورٹ چھوڑ کر آؤ۔ میری فلائٹ نہ نکل جائے۔" ثناء نے ڈانٹ کر کہا۔

"آیئے۔" فومی نے منہ بگاڑ کر کہا اور ثناء خود ہی بیگ اٹھائے باہر چلی آئی۔



اس کے جاتے ہی فوزیہ نے سوچ لیا۔ "اب شادی کو دیر کرنا فضول ہو گا کچھ بھی ہو ثناء کے آتے ہی یہ شادی ہو جانی چاہیے۔ ورنہ یہ بغاوت بڑھی تو بڑھتی ہی جائے گی۔ قبل اس کے کہ ثناء ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دینی چاہیے۔ ہاں ٹھیک ہے اور بھائی جان کو اس جلدی پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہو گا۔ یہی سوچ کر اس نے ماں اور

بھائی کو فون کیا اور ماں کو پوری تفصیل کے ساتھ حالات سے آگاہ کرتے ہوئے بولی۔

''ثنی ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہے، اب دیر کرنا فضول ہے آپ خود بھائی جان سے بات کریں اور آج ہی رات تاریخ لینے آ جائیں وقت کا تقاضہ یہی ہے۔''

''تم فکر مت کرو۔'' سب کچھ سن کر فوزیہ کی ماں بولی۔ ''ہم سب لوگ آج ہی رات کو آئیں گے تمہارے بھائی کو بھی اس جلدی پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا اور سہیل تو بہت خوش ہو گا یہ سن کر۔'' ماں کی بات سن کر فوزیہ نے فون بند کر دیا اور رضوان کے بارے میں سوچنے لگی کہ ان سے کیا کہنا ہے۔ یہ ثناء کس قدر مکار ہو گئی ہے۔ آج دوپہر وہ سہیل کے ساتھ آئی اور میں بھی کتنی بے وقوف ہوں کہ ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر خوشی سے نہال ہو گئی۔ مگر اس وقت وہ ساری خوشی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔

جب تک رضوان نہیں آئے وہ سارے گھر میں بولائی، بولائی پھرتی رہی۔ وہ جتنا بھی سوچتی اتنا ہی الجھ جاتی۔ وہ اس بات کو سمجھنے میں ناکام رہی کہ یہ ثناء کے دل میں اچانک اپنوں کی محبت کیسے جاگ اٹھی، ان لوگوں کے لیے جن سے وہ شدید نفرت کرتی تھی۔ ''مجھ سے بغاوت کرنے لگی۔''

شام کو رضوان آئے تو فوزیہ چپ چاپ اداس سی بیڈ پر لیٹی تھی۔ رضوان اس کی اس حالت کے لیے پہلے ہی تیار ہو کر آئے تھے۔ مگر انہیں حیرت تھی کہ بجائے غصے میں اِدھر اُدھر گھومنے کے وہ اداسی کی مورت بنی بیڈ پر پڑی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ثناء جا چکی ہو گی اور وہ ثناء کے جانے پر بے انتہا خوش تھے۔ انہوں نے اپنے روز کے معمول کے مطابق بریف کیس رکھا اور ٹائی کی گرہ کھولتے ہوئے فوزیہ کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیوں بھئی کیا بات ہے، موڈ کچھ آف لگ رہا ہے؟'' ٹائی کھول کر وہ اس کے قریب آ بیٹھے۔

''آپ کو معلوم ہے ثنی اسلام آباد چلی گئی۔''

''اچھا، مگر ابھی تو چھٹیوں میں بہت دن تھے پھر پہلے کیوں چلی گئی؟'' انہوں نے بے خبر بن کر کہا۔

رضوان دل ہی دل میں مسکرائے مگر بظاہر ناگواری سے بولے۔ ''بھئی وہ مری جائے یا اسلام آباد، مقصد تو تفریح ہے۔ اس میں چیخ کر بولنے کی کیا بات ہے۔'' فوزیہ نے بے

بسی سے انہیں دیکھا اور دانت پیستی ہوئی بولی۔

''اسلام آباد پروین کے گھر گئی ہے۔''

''اسلام آباد، پروین کے گھر؟'' رضوان نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟''

''میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔'' فوزیہ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر اٹھ بیٹھی۔

''مگر تم نے کیوں جانے دیا اسے؟'' رضوان کچھ غصے سے بولے۔

''میں اگر روکتی بھی تو وہ رکنے والی کہاں تھی۔ اسی لیے جانے دیا ورنہ......'' فوزیہ نے دانت پیسے۔

''غلطی تو تمہاری ہے۔'' رضوان اسے ڈانٹتے ہوئے بولے۔ ''تم نے مجھے فون کر دیا ہوتا میں خود آ کر اسے روک لیتا، یہ بتاؤ اکیلی گئی ہے یا ساتھ بھی کسی کو بھیجا ہے؟''

''میں نے کہا تھا کہ ساتھ فومی یا نومی کو لے جاؤ مگر وہ مانی ہی نہیں تو میں کیا کرتی۔'' فوزیہ بے بسی سے بولی۔

''یہ لڑکی تو بہت بدتمیز ہو گئی ہے۔'' رضوان نے بظاہر غصے سے کہا مگر دل میں سوچا میری بیٹی تو بہت عقلمند ہو گئی ہے، فوزیہ کو شوہر کی باتوں سے کچھ تسلی ہوئی تو بولی۔

''چھوڑیئے اب اس بات کو اسے جانا تھا وہ چلی گئی۔ مگر اب بھائی، بھابی امی آ رہی ہیں۔'' فوزیہ نے اطلاع دی تو رضوان بولے۔

''وہ کیوں آ رہے ہیں؟''

''شادی کی تاریخ طے کرنے، ثناء کے آتے ہی یہ شادی ہو گی میں مزید کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتی۔''

''مگر اتنی جلدی کس بات کی ہے؟'' رضوان اسے پریشان دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

''جلدی ہے، جلدی کیوں نہیں؟'' فوزیہ بگڑ کر بولی۔ ''آپ جانتے ہیں وہ شروع ہی سے بڑی بے باک اور بدتمیز ہے اس کو روکنے یا منع کرنے کی ہر کوشش بے کار ہو گی۔''

''اگر تمہارا خیال ہے کہ وہ اتنی بگڑ چکی ہے تو کیا یہاں آ کر چپ چاپ شادی کر لے گی، ذرا سوچو اگر اس نے عین موقع پر انکار کر دیا تو ہماری کیا پوزیشن ہو گی؟'' رضوان بہر حال ابھی اس شادی کو روکنا چاہتے تھے۔

''وہ انکار نہیں کرے گی کیونکہ جب وہ آئے گی تو شادی میں صرف ایک دو دن کا وقفہ ہوگا اور پھر آپ کس لیے ہیں آپ کا خیال تو ہر حال میں کرے گی وہ۔''

''مگر فرض کرو، اس نے ایسا نہ کیا تو؟''

''اس کو ایسا کرنا ہوگا۔'' فوزیہ، رضوان کی بات سن کر چلائی۔

''آہستہ بولو بھئی، یہ بات آہستہ بھی ہو سکتی ہے۔'' رضوان نے کچھ ناگواری سے کہا۔

''آپ میری مشکل کو سمجھتے کیوں نہیں؟'' فوزیہ بے بسی سے رونے لگی وہ جس نے اس گھر کے ہر فرد پر حکمرانی کی تھی اب بیٹی کے ہاتھوں پریشان تھی۔ ''دیکھو رضوان! ابھی وقت میرے ہاتھ میں ہے لیکن اگر میں نے کچھ دیر کی تو پھر کچھ بھی باقی نہ بچے گا۔''

''اوکے بھئی جیسے تمہاری مرضی۔'' رضوان زیادہ بحث کر کے مجرم بننا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے وہ چپ ہو گئے۔



ایئر پورٹ سے ثناء ٹیکسی میں بیٹھی تھی اور ٹیکسی والا بجائے اس کی مدد کرنے کے یہ کہہ کر یہاں اتار گیا تھا کہ اس لائن میں آپ کو آپ کا مطلوبہ گھر مل سکتا ہے۔ تلاش کر لیجیے۔

شام ہو رہی تھی۔ ثناء نے بجائے خود پریشان ہونے کے بہتر یہ جانا کہ کسی سے پوچھ لیا جائے۔ جہاں وہ اتری تھی وہیں ایک گیٹ کے سامنے تین لڑکے کھڑے باتوں میں مصروف تھے۔ ثناء ان کو مخاطب کر کے بولی۔

''بات سنیے۔'' اس نے کہا تو وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگے۔

''یہ ایڈریس۔'' ثناء نے کاغذ کا پرزہ ان کے سامنے کر دیا۔

''کرنل انوار۔'' وہ لڑکا پڑھتے ہوئے بولا۔ ''دیکھیے آپ اس لائن میں سیدھی چلی جائیں۔ وہ سامنے جو وہائٹ گیٹ ہے انہی کا ہے۔''

''شکریہ۔'' ثناء کاغذ پرس میں ڈالتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

''رکیے رکیے۔'' وہ لڑکا چونکتے ہوئے بولا۔ ''ادھر پارک میں عمر بھی ہے۔ میں ابھی اس کو بلاتا ہوں۔''

''جی نہیں شکریہ یہ وہ سامنے ہی تو گھر ہے، میں چلی جاؤں گی۔'' ثناء نے جلدی سے کہا اور سوچا کہ عمر تو اسے یہیں سے واپس کر دے گا۔ وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی چل دی۔

گیٹ پر موجود چوکیدار نے ایک نظر اسے دیکھ کر کچھ پوچھا اور پھر اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ گیٹ کی کھڑکی سے وہ اندر داخل ہوئی پھر جھجک کر رک گئی۔ پورچ کے سامنے ہی بڑا سا خوبصورت سرسبز لان تھا اور لان میں اس وقت کرنل اور پھپھو پروین چائے پی رہے تھے۔ وہ کتنی دیر پورچ میں کھڑی سوچتی رہی۔ کتنی عجیب بات ہے۔ آج میں بن بلائے خود چل کر آئی ہوں۔ جبکہ ایک بار پھپھو پروین نے ان سب کو دعوت بھی دی تھی۔ اپنے گھر آنے کی اور اس پر ثناء نے بڑے غرور سے کہا تھا۔''

''پھپھو! آپ جو چیز مجھے دکھانا چاہتی ہیں وہ میں پہلے ہی دیکھ چکی ہوں شکریہ۔''

اس کی بات پر جہاں پھپھو افسردہ ہو گئی تھیں وہاں فوزیہ نے فخر سے بیٹی کو دیکھا تھا جس نے اسے جواب دینے کی زحمت سے بچا لیا تھا اور آج وہ خود بے عزتی کے ساتھ بغیر دعوت، بغیر اجازت کے ان کے گھر میں موجود تھی۔ پتہ نہیں پھپھو پروین مجھ سے کیسا سلوک کریں، وہ دل میں ڈرتی ہوئی سوچ رہی تھی۔ قدم اٹھانے کی خود میں طاقت نہیں پا رہی تھی۔

اچانک چائے پیتے ہوئے کرنل کی نظر اس پر پڑی۔ ''ارے سنی بیٹا آپ! آؤ آؤ وہاں کیوں کھڑی ہو۔'' انہوں نے کچھ حیران ہو کر شفقت بھرے لہجے میں پکارا تو پروین نے گردن گھما کر گیٹ کی جانب دیکھا اور وہاں کھڑی ثناء کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔

''سنی تم؟'' وہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آئیں اور ثناء بیگ پھینک کر ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

''سنی تم؟ مجھے یقین نہیں آتا میری بچی کہ تم آئی ہو، اپنی پھپھو کے گھر۔ کیسے خیال آیا تمہارے دل میں پھپھو کا؟''

''پھپھو...... پھپھو جان! میں تو بہت پہلے آنا چاہتی تھی مگر...... مگر ڈر لگتا تھا کہ آپ......'' وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔

''ڈر کیسا میری بیٹی!'' کبھی کوئی پھپھو اپنی بھتیجی سے نفرت نہیں کرتی کیونکہ وہ تو اس کا خون ہوتی ہے۔ اس کے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ پھپھو، بھتیجی میں تو کوئی فرق نہیں ہوتا۔ میں تمہاری ممی کے لیے بیگانہ سہی اور وہ میرے لیے غیر سہی۔ مگر تم تو خون ہو میرے خاندان کا، تمہیں تو بہت پہلے یہاں آنا چاہیے تھا ثناء مگر تم نے دیر کر دی بہت دیر کر دی۔'' صباء کا خیال کر کے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"مجھے معاف کر دیں پھپھو، میں بہت بدتمیز اور بری تھی۔" وہ اور بھی زور زور سے رونے لگی۔

"ارے بھئی بیگم! کب تک آپ کا وہاں کھڑے رہنے اور بچی کو رلانے کا پروگرام ہے۔ بچی تھکی ہوئی ہوگی بجائے اس کے کہ اسے تسلی دیتیں خود بھی ساتھ چل کر رونے لگیں۔"

"سوری!" کرنل کے احساس دلانے پر پروین نے ثناء کے آنسو پونچھے اور اسے ساتھ لیے چائے کی میز پر گئیں۔ ثناء نے کرنل کو سلام کیا اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ پروین نے ملازمہ کو آواز دی کہ وہ بیگ اٹھا کر لے جائے پھر چائے بنا کر ثناء کو دی۔

"بیٹا ایڈریس تلاش کرنے میں پریشانی تو ہوئی ہوگی؟" کرنل نے خالی کپ ٹرالی میں رکھتے ہوئے محبت سے پوچھا۔

"ایسا تو ہونا ہی تھا پھپا جان۔ پہلی بار جو آئی ہوں۔" ثناء نے آہستہ سے کہا۔

"تم اگر اطلاع کر دیتیں تو عمر تمہیں ریسیو کرنے آجاتا۔" کرنل سگار سلگاتے ہوئے بولے۔

"جی پھپا جان! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ دراصل پروگرام بالکل اچانک بنا اور پھر آنے کی خوشی میں مجھے کچھ بھی خیال نہ رہا۔" ثناء نے کہا اور دل میں سوچا۔ اگر میں اطلاع کر دیتی تو عمر مجھے ریسیو کرنے ضرور آتا مگر وہیں سے سی آف بھی کہہ دیتا۔ میں احمق ہی ہوتی اگر اپنے آنے کی اطلاع کرتی۔ ویسے مجھے دیکھ کر اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ خوش ہوگا۔ نہیں، اس کے دل نے مایوسی سے نفی کی، جھنجلا جائے گا؟ ہاں پھپھو، پھپا کے سامنے غصے کا اظہار کرنے سے تو رہا، اس کا دل اندر ہی اندر سہما جا رہا تھا۔ اسے عمر سے برے سے برے سلوک کی امید رکھنا چاہیے تھی جس کے لیے وہ اپنے آپ کو تیار کر رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو ثنی؟" پروین نے محبت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں پھپھو جان۔" ثناء نے چائے کا کپ اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ بھائی جان اور باقی گھر والے کیسے ہیں؟"

گھر کے نام پر ثناء کو فوزیہ یاد آ گئی۔ پتہ نہیں اس وقت ممی بے چاری کی کیا حالت ہوگی؟ اس نے دل میں سوچا اور مسکرا کر بولی۔ "وہ سب ٹھیک ہیں پھپھو جان!" پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں دفعتاً پروین اٹھتی ہوئی بولی۔

"جاؤ کرنل صاحب کو اطلاع کر دو۔" حیرت ہے یہ لوگ عمر کا انتظار کیے بغیر ہی کھانا

شروع کر رہے ہیں۔ ثناء نے دل میں سوچا اور بولی۔

"پھپھو جان! وہ...... وہ......" ثناء چپ ہوگئی سمجھ میں نہ آیا بات کیسے مکمل کرے۔

"ہاں بیٹی کہو کیا بات ہے؟" پروین نے حوصلہ دیا تو اس نے کہہ دیا۔

"پھپھو! آپ لوگ عمر کا انتظار نہیں کریں گے میرا مطلب ہے عمر تو ابھی آئے نہیں اور آپ......" اس کی بات سن کر پروین اداس ہوگئی۔

"عمر کی بات چھوڑو ثنی؟ وہ جب آئے گا تب خود ہی کھا لے گا ہم اس کا انتظار نہیں کرتے۔" پروین چپ ہوگئیں۔

"مگر کیوں پھپھو جان؟"

"اب میں تمہیں کیا بتاؤں ثنی! جب سے صبا فوت ہوئی ہے۔ تب سے وہ کام میں ہی گم ہو گیا ہے نہ کھانے کا ہوش ہے نہ پہننے کا، کچھ کہتی ہوں تو کہتا ہے۔ فوجی آدمی ہوں پہلے وطن کا سوچوں گا پھر اپنے آپ کا۔ پہلے تو جب وہ اس قسم کی حرکتیں کرتا تھا تو میں صباء سے شکایت کرنے کی دھمکی دے کر اس سے اپنی بات منوا لیتی تھی۔ مگر اب تو، اب تو صبا بھی نہیں رہی۔" پروین رونے لگی اور ثناء تو آج کل خود رونے کے بہانے ڈھونڈتی تھی۔ ان کے ساتھ مل کر خود بھی رونے لگی۔ ایک بار پھر صباء کی یاد تازہ ہوگئی تھی۔

"تم چپ ہو جاؤ ثنی!" اسے روتا دیکھ کر پروین نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ "جاؤ اپنے پھپا کو بلا لاؤ۔"

"جی بہتر پھپھو جان۔" ثناء نے کہا اور باہر نکل گئی۔

کرنل موٹے شیشوں کی عینک آنکھوں پر چڑھائے کوئی موٹی سی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ثناء نے دستک دی اور کرنل پلٹ کر دیکھنے آئے تو بولی۔ "پھپا جان کھانا تیار ہے۔ آپ بھی آجائیے۔"

"اوہ اچھا۔" وہ اٹھے تو ثناء واپس آگئی۔



ڈرائنگ روم میں اس وقت فوزیہ کے میکے والوں کے علاوہ فوزیہ کی ساس اور دیور، عرفان بھی موجود تھا اور بات چیت چل رہی تھی۔ فوزیہ کے بھائی ریحان کسی طرح بھی اتنی جلدی اس شادی کے حق میں نہیں تھے۔ اسی طرح رضوان بھی دل ہی دل میں اس شادی

کے خلاف تھے۔

''فوزیہ سمجھنے کی کوشش کرو، تین مہینے بعد سہیل کے فائنل ایگزام ہیں اگر شادی ہوگئی تو وہ ایگزام کس طرح دے سکے گا؟ تم ایسا کرو ایگزام کے فوراً بعد شادی رکھ لو یعنی جس دن ایگزام ختم ہوں۔ اسی دن رات کی بارات رکھ لیتے ہیں۔''

فوزیہ کھل کر بھائی کو کچھ نہ بتا سکتی تھی۔ کیونکہ اس طرح اور گڑ بڑ ہو جاتی۔ مگر شادی بھی وہ لیٹ کرنا نہیں چاہتی تھی کیونکہ تین ماہ کا طویل عرصہ ثناء کو آزاد کرنے کے لیے کافی تھا۔ وہ بس ابھی قابو میں آسکتی تھی اس لیے فوزیہ بولی۔

''بھائی جان! آخر آپ کو اعتراض کیوں ہے۔ سہیل بہت ذہین بچہ ہے۔ شادی کے باوجود وہ ایگزام دے لے گا آپ اس کی فکر چھوڑ کر اپنی بات کیجیے۔''

''مگر تم بھی تو یہ بتاؤ آخر ایسی کیا بات ہوگئی جو تم شادی کر دینے پر تل گئی ہو۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں بھائی جان؟'' فوزیہ نے ترشی سے پوچھا۔

''بھئی میں کیا کہوں گا؟ یار رضوان تم ہی اسے کچھ سمجھاؤ یہ بیٹھے بٹھائے اس کے ذہن میں شادی کی کیا سما گئی۔ ارے بھئی یہ شادی ہے گڈے گڈی کا کھیل نہیں۔'' ان کے لہجے سے بےزاری عیاں تھی۔

''ریحان ٹھیک کہہ رہے ہیں فوزی۔'' رضوان اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔ کیونکہ وہ خود دل سے اس شادی کے خلاف تھے۔

''یہ آپ کہہ رہے ہیں؟'' فوزیہ نے گھور کر انہیں دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں، میں ایسا کیوں چاہتی ہوں پھر بھی آپ ریحان بھائی کا ساتھ دے رہے ہیں۔

''ارے بھئی اگر ریحان بھائی کہہ رہے ہیں تو مجھے بھی کہنا پڑ رہا ہے۔'' رضوان نے بےزاری سے کہا۔

''بھابی! آپ کیوں چپ بیٹھی ہیں آپ بھی تو کچھ بولیے اور امی آپ سے میں نے کہا بھی تھا آپ سمجھائیے نا ریحان بھائی کو۔''

''فوزی! میں کوئی بچہ نہیں جو امی مجھے سمجھائیں گی، یہ بالکل بے تکی سی بات ہے۔ کیوں آنٹی جان؟'' انہوں نے فوزیہ کی ساس کو مخاطب کیا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں بیٹا تم لوگ جو مناسب سمجھو وہی فیصلہ کرو۔'' انہوں نے یہ کہہ کر اپنا دامن چھڑا لیا۔

''پھر مناسب تو یہی ہے کہ سہیل کے ایگزام ختم ہونے کا انتظار کریں۔'' ریحان فیصلہ کن لہجے میں بولے۔

''بھائی جان! آپ یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ سہیل کی شادی ثناء سے کرنا ہی نہیں چاہتے۔'' فوزیہ نے آخری وار کیا جو کاری ثابت ہوا۔

''میں نے یہ کب کہا؟'' ریحان بوکھلا کر بولے۔

''کہنے کی اب آپ نے گنجائش ہی کہاں چھوڑی ہے۔ ٹھیک ہے میں ثناء کی شادی اب باہر کہیں کروں گی۔'' وہ باقاعدہ رونے لگی اور ریحان کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔

پھر تاریخ خوش اسلوبی سے طے کر کے وہ لوگ واپس چلے گئے۔ جو ایک ہفتہ سے زیادہ کی نہ تھی ان کے جاتے ہی فوزیہ خوشی سے کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

''میں اب شادی کی تیاری شروع کر دیتی ہوں اور آپ کل صبح کارڈ چھپنے کے لیے دے دیجیے، شادی میں ایک ہفتہ ہے مگر آپ دیکھیے گا میں یہ شادی کس دھوم دھام سے کرتی ہوں۔ بس آپ کارڈ چھپوا کر لائیں اور کل بینک سے پیسے نکلوا کر لے آئیں۔''

''بہت بہتر۔'' رضوان نے مایوس دل سے کہا اور خود بھی اٹھ گئے۔ انہوں نے شادی کی مخالفت اس لیے زیادہ نہ کی تھی کہ ان کا خیال تھا، فوزیہ کے بھائی کسی طرح بھی اتنی جلدی شادی کے لیے رضامند نہ ہوں گے۔

بہرحال فوزیہ جیسی شاطر عورت کے لیے یہ کوئی مشکل بات نہ تھی۔ اس نے آخری پتا جس یقین کے ساتھ پھینکا تھا رضوان اسی وقت سمجھ گئے تھے اب جیت فوزیہ کی ہوگی اور وہی ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ کمرے میں آکر لیٹ گئے۔



عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر ثناء ابھی اٹھی ہی تھی کہ راہداری میں عمر کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ جائے نماز تہہ کرتی ہوئی خوف سے کانپ گئی۔ پتہ نہیں وہ اس کے ساتھ کیا سلوک کرے گا، کیا کہے گا؟ جب سے اس نے عمر سے پیار کرنا شروع کیا تھا تب سے وہ نماز کی بھی پابند ہوگئی تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ عمر جب مرد ہوتے ہوئے نماز کا

پابند ہے تو اس کی نماز سے غفلت کیسے برداشت کرے گا حالانکہ یہ بہت بعد کی بات تھی۔ اس وقت تو وہ خوف سے سہمی کانپتی جائے نماز تہہ کرنے کے باوجود کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

اپنے کمرے کے ساتھ ہی عمر نے صباء کا کمرہ بنوایا تھا اور جب سے صباء فوت ہوئی تھی۔ یہ کمرہ زیادہ تر بند ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھی جب عمر کا دل بہت اداس ہوتا تو وہ کمرہ کھول کر اس میں بیٹھ جاتا اس کے علاوہ نہ کبھی کرنل نے کمرے کو کھولنے کی ضرورت محسوس کی تھی اور نہ ہی پروین نے، مگر آج جب عمر راہداری میں داخل ہوا تو صباء کے کھلے کمرے سے باہر آنے والی روشنی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسی حیرت میں وہ چند قدم آگے آیا تو کمرے کے وسط میں کھڑی صباء کو دیکھ کر متحیر انداز میں پلکیں جھپکانے لگا۔ پھر وہ یہ بھول ہی گیا کہ صباء مر چکی ہے۔ والہانہ انداز میں آگے بڑھتے ہوئے آنٹی جان کہہ کر اس نے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

مگر اگلے ہی لمحے وہ ثناء کا چہرہ دیکھ کر یوں اچھل کر پیچھے ہٹا جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ ثناء نے صباء ہی کی سبز گولڈن کناروں والی شال اوڑھ رکھی تھی۔ وہ شال جو عمر نے خود اپنی پسند سے انہیں لے کر دی تھی کچھ دیر کے لیے عمر سمجھ ہی نہ سکا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔ مگر جیسے ہی حقیقت کا احساس ہوا وہ غصے سے بھر گیا۔

''تم اور یہاں، کیوں؟'' عمر نے غرا کر پوچھا۔

ثناء خوف سے کانپ گئی۔ مگر کوئی جواب نہ دے سکی۔

''میں پوچھتا ہوں کہ تم یہاں کیا لینے آئی ہو، بولو کیوں آئی ہو؟'' وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا اور ثناء کی قینچی کی طرح چلنے والی زبان کو آج گویا تالا لگ گیا تھا۔

''تم نے سنا نہیں میں نے کیا پوچھا ہے۔ کیوں آئی ہو تم یہاں؟ تمہاری جرأت کیسے ہوئی یہاں آنے کی؟ کیا آنٹی کے بعد اب میری جان لینے کا ارادہ ہے؟''

''خدا نہ کرے۔'' ثناء نے بے ساختہ سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ثناء نے کچھ کہنا چاہا مگر ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ وہ کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر دھاڑا۔

''جواب کیوں نہیں دیتیں؟ تمہارے خیال میں، میں بکواس کر رہا ہوں۔''

''نہ نہ..... نہیں۔'' ثناء نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

''تم۔'' وہ اسے گھورنے لگا۔ ''تمہیں اس کمرے میں رہنے کی اجازت کس نے دی، کس کی اجازت سے تم نے یہ کمرہ کھولا۔ یہ تمہارا گھر نہیں تھا جو تم اپنی من مانی کرتیں۔''

ثناء کے جی میں آیا کہے۔ احمق یہاں پھپھو کے علاوہ کون مجھے رہنے کی اجازت دے سکتا ہے۔ مگر اس کے خوفناک غصے کے سامنے اس نے چپ رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

عمر بغور اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ بول پڑا۔ ''یہ شال، یہ شال بھی آنٹی کی ہے۔ میں نے تو لے کر دی تھی انہیں..... ہاں یہ شال میری پیاری آنٹی کی ہے۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر شال کھینچ لی پھر غرایا۔ ''کیا تم چپ کا روزہ رکھ کر آئی ہو۔ کیا بولنا منع ہے تمہیں اور اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے چپ رہنے سے میں تمہیں معاف کر دوں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔''

پھر وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا دانت پیس کر بولا۔ ''باہر نکلو اس کمرے سے، یہ کمرہ تو میری مقدس آنٹی کا تھا اور تم۔'' وہ خود ہی ثناء کو بازو سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لایا اور اتنے میں شور و غل کی آواز سن کر گاؤن کی ڈوریاں کستی ہوئی پروین بھی آ گئی۔

پھر جو منظر اس نے دیکھا وہ بڑا دردناک تھا۔ شال عمر کے ہاتھ میں تھی اور ننگے سر اور ننگے پیر وہ ثناء کو کمرے سے نکال کر باہر راہداری میں کھڑا کر چکا تھا۔ پروین کو بے ساختہ ثناء پر پیار بھی آیا اور ترس بھی۔ وہ تو چہلم پر ہی ثناء کی اس تبدیلی کو محسوس کر چکی تھی اور اس وقت وہ ثناء جو کسی کو منہ لگانا پسند نہ کرتی تھی، اس بے عزتی پر بھی چپ چاپ سر جھکائے کھڑی تھی اور پاس ہی کھڑا عمر اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''عمر! یہ کیا بدتمیزی ہے؟ تم ایک ذمہ دار آفیسر ہو اور حرکتیں بچوں سے بھی گئی گزری کرتے ہو۔ یہ سب کیا ہے۔'' پروین نے صورتحال سمجھ کر غصے سے ثناء کی جانب اشارہ کیا۔

''یہی سب کچھ تو میں آپ سے پوچھنے والا تھا، یہ فوزیہ کی بیٹی اور سہیل کی منگیتر ہمارے یہاں کیا لینے آئی ہے۔'' وہ غصے سے دھاڑا۔

پروین نے سوچا ثناء کو صباء کا کمرہ دے کر ان سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ عمر کو سمجھانے کے لیے نرم لہجے میں بولیں۔

''ہوش کی دوا لو عمر، گھر آئے ہوئے مہمان کو ایسا نہیں کہتے۔ آدھی رات کو یوں شور و غل کرتے ہو تمہیں شرم آنی چاہیے تھی۔''

''ممی! آپ یہ سب مجھ سے کہہ رہی ہیں۔ اس سے کیوں نہیں پوچھا کہ یہ کیوں آئی ہے ہمارے گھر، میری سب سے عزیز ہستی کو تو یہ چھین چکی ہے اب...... اب کیوں آئی ہے؟'' عمر نے غصے سے پوچھا۔

''بیٹا! کہتے ہیں گھر آئے ہوئے دشمن کو بھی معاف کر دینا چاہیے یہ تو پھر تمہاری کزن ہے۔''

''جب میں نہیں مانتا تو پھر یہ میری کزن کیسے ہوئی؟'' عمر کا لہجہ کٹیلا تھا۔

''بے وقوف مت بنو عمر! اگر تمہیں کچھ کہنا ہی ہے تو صبح کہہ لینا۔ چلو ثنی تم کمرے میں چلی جاؤ۔'' پروین نے معاملہ ختم کرنا چاہا۔

''نہیں ممی! یہ اس کمرے میں نہیں رہے گی، کیونکہ یہ میری آنٹی کا کمرہ ہے اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا ان کی جگہ لے۔'' عمر جنونی انداز میں بولا۔

''مگر اب وہ مر چکی ہے۔'' پروین کو بھی غصہ آ گیا، بدتمیزی کی انتہا تھی۔ ثناء کھڑی خوف سے کانپ رہی تھی۔

''ہاں وہ مر چکی ہیں...... ممی وہ مر چکی ہیں میں جانتا ہوں، مگر آپ کو معلوم نہیں یہ ان کی قاتل ہے۔ سنا ممی آپ نے میں اس قاتلہ کو آنٹی کے کمرے میں نہیں رہنے دوں گا۔'' وہ وحشی ہو رہا تھا۔

''عمر! تم بہت بدتمیز ہو مگر یاد رکھو یہ میرا گھر ہے، میں جس کو چاہوں، جہاں چاہوں رکھ سکتی ہوں۔ تم کون ہوتے ہو دخل اندازی کرنے والے۔''

''آپ بھول رہی ہیں ممی! یہ گھر آپ نے ضرور بنایا تھا۔ مگر یہ کمرہ آرمی جوائن کرنے کے بعد میں نے خود بنوایا تھا جانتی ہیں کیوں؟ کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا آنٹی کو کبھی یہ احساس ہو کہ یہ ان کے بہنوئی کا گھر ہے میں چاہتا تھا وہ اس کو اپنا گھر سمجھیں۔ اپنے بیٹے کا گھر سمجھیں مگر، مگر ابھی تو وہ جی بھر کر یہاں رہی بھی نہ تھیں کہ لوگوں نے انہیں مار دیا۔ ممی آپ نہیں جانتیں ان کو مرنے پر مجبور کیا گیا تھا۔ اور اب اگر یہ اس کمرے میں رہی تو میں مر جاؤں گا۔ ممی! آنٹی نہیں رہیں تو میں بھی نہیں رہوں گا۔'' وہ سسک پڑا بالکل کسی معصوم بچے کی طرح۔

ثناء کے دل پر ایک چوٹ سی پڑی۔ وہ جانتی تھی عمر کی ایک ایک بات سچ ہے۔ قبل

اس کے کہ پروین کچھ اور کہتی وہ بول پڑی۔

''پھپھو جان! میں یہاں اس کمرے میں نہیں رہوں گی۔ آپ مجھے کوئی دوسرا کمرہ دے دیجیے۔''

پروین، بیٹے کے درد کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ مگر پھر بھی ایسا کہنے پر مجبور تھی یہ سوچ کر کہ ثناء پہلی بار آئی ہے۔ وہ کیا سوچے گی۔ مگر اب جب ثنا نے خود ہی کہا تو پروین اس کو عمر کے سامنے والے کمرے میں لے گئی۔

''ثناء تم اس کمرے میں رہو، صبح میں یہاں کی ٹھیک سے صفائی کروا دوں گی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ عمر اتنا بگڑ جائے گا۔ ورنہ پہلے ہی تمہارے لیے یہ کمرہ صاف کروا دیتی۔''

''کوئی بات نہیں پھپھو جان، میں یہاں رہ لوں گی۔'' ثناء نے سر ہلایا۔

''ثنی! تم اس کی باتوں کا برا مت ماننا۔ اصل میں وہ اتنا پیار تو مجھ سے بھی نہیں کرتا ہے جتنا اپنی آنٹی سے۔ سارا سال ہمارے پاس رہتے ہوئے بھی وہ ان تین ماہ کا انتظار شدت سے کیا کرتا تھا۔ جو اس کو صباء کے پاس لے جاتے تھے۔ صباء سب بچوں میں چاہتی بھی تو عمر کو ہی تھی۔'' پروین چپ ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بولی۔ ''اصل میں وہ صباء کی موت کو برداشت نہیں کر پا رہا ہے۔ کہتا ہے اگر وہ لاہور نہ جاتی تو زندہ رہتی۔ اب اس پاگل کو کون سمجھائے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے جو کبھی آگے پیچھے نہیں ہوتا۔''

''ہاں، مجھے پورا یقین ہے اگر وہ لاہور نہ آتیں تو شاید زندہ رہتیں...... مگر خیر آپ گھبرائیے نہیں، میں عمر کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گی۔ میں عمر کی کیفیت کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔'' پھر وہ صباء کے کمرے میں آئی اپنا سامان اٹھایا، ایک طرف کھڑے لاتعلق سے عمر پر نظر ڈالی اور اپنے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر لیا۔ سامان رکھ کر اس نے کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھا عمر نے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر تالا لگا دیا تھا۔ پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

'مسٹر میجر! میں تمہاری محبت حاصل کرنے یہاں آئی ہوں۔ تم سے مقابلہ کرنے نہیں۔ تمہاری ہر بات، ہر ستم مجھے گوارہ ہے۔ دیکھو پہلے وقت میرے ہاتھ میں تھا اور اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ لیکن میرے محبوب میں پھر بھی ناراض نہیں ہوں۔' ثناء مسکرائی اور صباء کی ڈائری نکال کر پڑھنے لگی۔ اپنے فارغ وقت میں وہ ڈائری ہی پڑھا کرتی تھی۔

یہ رات ثناء کو بہت حسین اور دلکش لگ رہی تھی۔ ایک کمرے میں وہ بند تھی اور دوسرے کمرے میں اس کا روٹھا ہوا محبوب۔ اس کی زندگی کا ایک طویل عرصہ سہیل کے ساتھ گزرا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس نے کبھی کسی رات کو سہیل کا خواب نہ دیکھا تھا اور نہ ہی تنہائی میں کبھی اس کے لیے کوئی لطیف جذبہ محسوس کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ ان کا دن رات کا ساتھ تھا۔ مگر اب وہ محسوس کر رہی تھی۔ سہیل کو کسی احساس کے حوالے سے محسوس نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اسے ممی نے شروع ہی سے اس پر مسلط کر دیا تھا۔ یہ محبت نہیں صرف پسند تھی۔ جب کسی کا دن رات کا ساتھ ہو تو انسان اس چیز کا عادی ہو جاتا ہے وہ بھی سہیل کی عادی ہو گئی تھی۔ جبھی تو آج محسوس کر رہی تھی کہ وہ محبت نہیں ہے۔ محبت تو اسے اب عمر کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس کی کڑی کسیلی باتیں بھی شہد کی مانند لگ رہی تھیں، اس کی نفرت میں بھی محبت چھلکتی ہوئی نظر آتی تھی۔ شاید یہ اس کے دل کے محسوس کرنے کا انداز تھا جبکہ سہیل نے تو اس کی کسی بات سے کبھی اختلاف کیا ہی نہ تھا۔ انہی خیالات میں الجھی الجھی وہ سو گئی۔

صبح اس کی آنکھ عمر کا دروازہ کھلنے سے کھلی تھی۔ وہ اچھل کر بستر سے اتری، بھاگ کر دروازے کے قریب آئی اور کی ہول سے آنکھ لگا دی۔ سر پر ٹوپی اوڑھے وہ نماز پڑھنے مسجد جا رہا تھا۔ سفید شلوار سوٹ میں اس کا اجلا اجلا چہرہ ثناء کو زندگی کا احساس دلا رہا تھا۔ ثناء کو وہ بہت ہی اچھا لگا اس نے مسکرا کر سوچا۔ 'آج صبح کا آغاز تمہیں دیکھ کر کیا ہے۔ مجھے یقین ہے یہ دن بہت اچھا گزرے گا۔' پھر وہ خود بھی نماز کی تیاری کرنے لگی۔

دوسری بار اس کا سامنا ناشتے کی میز پر ہوا تھا۔ ثناء ڈرتے ڈرتے ڈائننگ روم میں داخل ہوئی اور کرنل کو سلام کر کے کن انکھیوں سے عمر کو دیکھتی ہوئی کرنل کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

عمر نے نظر اٹھا کر بھی اس کو نہ دیکھا۔ جیسے اس کی آمد سے بے خبر ہی رہا ہو۔ ناشتہ خاموشی سے شروع ہوا۔ ناشتے کے دوران میں کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ سب چپ چاپ یوں کھاتے رہے۔ جیسے کسی مرگ پر تقسیم ہونے والی روٹی کھا رہے ہوں۔ کمرے میں صرف چھری کانٹے اور پرچ، پیالیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں تھیں۔ شاید ان کے گھر کھانے پر بولنا منع تھا یا پھر ہو سکتا ہے چھوٹا بچہ نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہو۔ کیونکہ میز پر ایک کرنل اور دوسرا میجر تھا اور تیسری ہستی جو ایک عورت تھی۔ وہ اگر ایک کی بیوی تھی تو دوسرے کی ماں، پھر وہ

اس ڈسپلن کا خیال کیوں نہ کرتی۔ جبکہ ثناء کے گھر کھانے کی میز پر باتوں ہی باتوں میں باقاعدہ ایک بحث چھڑ جاتی تھی اور اگر کبھی ایسے میں سہیل ہوتا بلکہ اکثر وہ ہوتا ہی تھا۔ ایسے میں ثناء اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتی تھی، مگر آج وہ عمر کے ساتھ کرسی پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ وہ تو خود چپ تھا پھر اسے کیسے بولنے دیتا۔ ثناء خاموشی سے ناشتہ کرتے ہوئے ان سب کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا وہ بہت بولے بہت باتیں کرے مگر کس سے؟ اچانک عمر اٹھا اور وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی کیونکہ ناشتہ تو اس نے برائے نام ہی کیا تھا۔

''کیا بات ہے، بہت جلدی میں ہو؟'' پروین نے اسے اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

''جی ہاں کام بہت بڑھ گیا ہے ہمارا۔'' پھر وہ رکا نہیں باہر نکل گیا۔ ثناء کا جی چاہا بھاگ کر جائے اور جیپ تک اسے چھوڑ کر آئے۔ اس کی یہ سوچ ابھی ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ باہر جیپ اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور ثناء ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔ یہ سوچ کر کہ اب سارا دن کیسے کٹے گا۔

دن بھر وہ پھپھو کے ساتھ باتیں کرنے کے علاوہ ہلکا پھلکا کام بھی کرتی رہی اور جب اس نے کہا۔ ''پھپھو! میں عمر کے کمرے کی صفائی کر دوں۔'' تو وہ چونک کر بولیں۔

''نہیں بیٹی! تمہیں ان سب باتوں کی عادت کہاں؟''

''پھپھو! میں صفائی کر سکتی ہوں۔'' ثناء نے انہیں یقین دلانے کی کوشش کی۔

''سنی! اس کے کمرے کو صفائی کی ضرورت نہیں، وہ اپنا کمرہ خود ہی صاف رکھتا ہے۔'' پروین نے ٹالنے کی غرض سے کہا۔

''پھپھو! اگر میں آج صفائی کر دوں گی تو کیا ہو جائے گا۔'' ثناء بضد تھی۔

''بات یہ ہے سنی! تم نے اس کے کمرے کی صفائی کی تو وہ بگڑ جائے گا۔'' پروین کو اصل بات بتانا پڑی۔ کیونکہ عمر نے صبح اٹھتے ہی کہہ دیا تھا۔ ثناء میرے کمرے میں قدم نہ رکھے۔ ایسا نہ ہو افسانوی ہیروئنوں کی طرح صفائی کا جنون لیے میرے کمرے میں آئے۔ اگر اس نے ایسا کیا تو میں کمرے کا حلیہ بگاڑ دوں گا۔

''اوہ۔'' ثناء کا دل بجھ گیا مگر وہ مایوس نہ ہوئی اور کچن میں چلی آئی۔ اسے صرف شامی کباب بنانے آتے تھے وہ بڑے اہتمام سے بنائے۔ اس کا خیال تھا شاید وہ دوپہر

کے کھانے پر آئے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ وہ کھانے پر نہ آیا۔ پروین نے اس کی افسردگی دیکھی تو بولیں۔

"سنی! وہ آہستہ آہستہ نارمل ہو جائے گا۔" حالانکہ وہ جانتی تھیں ایسا کبھی نہ ہوگا۔ وہ بہت سخت مزاج تھا۔ صباء کی موت کو وہ کبھی فراموش نہیں کرے گا۔



چار دن یونہی چپ چاپ گزر گئے۔ وہ رات کس وقت آتا تھا اور صبح کس وقت جاتا تھا۔ ثناء کو معلوم ہی نہ ہو سکا ناشتہ کرنا بھی شاید اس نے چھوڑ دیا تھا۔ ثناء اس کو صباء کی چیزیں دینا چاہتی تھی مگر وہ ملتا تب نا۔

اگلے روز وہ صبح ناشتے کی میز کے گرد بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ کہ اس کے قدموں کی آہٹ ابھری اور آہستہ آہستہ اس کے قریب آ کر رک گئی۔

ثناء کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی، ڈرتے ڈرتے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ تو وہ کھڑا اس کو گھور رہا تھا۔ 'اب نجانے کیا جرم ہو گا' ثناء نے دل میں سوچا اور پوچھا۔

"جی؟"

"اٹھو یہاں سے۔" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

"مم...... مگر کیوں؟" ثناء نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے کھا جانے والی نظروں سے ثناء کو دیکھا اور دھاڑا۔ "کیوں کا کیا سوال؟ جب میں کہتا ہوں اٹھو یہاں سے تو بس اٹھ جاؤ۔"

"اور میں پوچھتی ہوں کیوں؟" ثناء رو دینے کے قریب تھی۔

"تم اس گھر کی مالکن ہو جو میں تمہارے سوالوں کے جواب دوں۔ اٹھو یہاں سے۔" اس نے پھر وہی بات دوہرائی اور اتنے میں پروین آ گئی اور ثناء نے تھوڑا سا اطمینان محسوس کیا۔

"عمر! یہ صبح صبح کیا بدتمیزی لگا رکھی ہے؟" پروین نے کچھ غصے سے پوچھا۔

"ممی آپ اپنی زبان میں اس کو یہاں سے اٹھا لے جائیں ورنہ میں اس کو گھر سے نکال دوں گا۔" اس نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"بکواس مت کرو۔" پروین کو اس کے چار دن بعد لیٹ آنے اور جلدی جانے پر

پہلے ہی غصہ تھا۔ بگڑ گئیں۔ "عمر! میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتی۔ اس کے کمرے میں کوئی نہ جائے، اس کی کرسی پر کوئی نہ بیٹھے، میں پوچھتی ہوں صباء تو اب مر چکی ہے۔ وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔ کیا وہ کمرہ اور یہ کرسی پوجا کے لیے اس گھر میں رکھے جائیں گے؟ حد ہوتی ہے کسی بھی بات کی۔"

عمر نے دکھ سے ان کی باتیں سنیں اور بولا۔ "ممی وہ آپ کی بہن پہلے تھیں اور میری آنٹی بعد میں، پھر آپ کی محبت کو کیا ہوا؟ آپ نے پوچھا ہے یہ کرسی اور کمرہ پوجا کے لیے رکھے جائیں گے تو جواب سن لیجیے۔ جی ہاں یہ اس وقت تک پوجا کے لیے رکھے جائیں گے جب تک اس گھر میں میری بیٹی شہر بانو آنکھ نہیں کھولتی ان سب چیزوں کی وارث وہی ہو گی ممی اور کسی کو اس کمرے میں رہنے کی اور اس کرسی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہو گی...... اور تم۔" وہ نرمی سے بات کرتے کرتے غصے سے چیخا۔ "ابھی تک یہیں بیٹھی ہو۔" پھر قبل اس کے کہ وہ کچھ اور بھی کہتا پروین آہستہ سے بولی۔

"سنی بیٹے! ادھر آ جاؤ میرے پاس، یہ صباء کی کرسی ہے۔ عمر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتا تھا۔ اس کو فکر رہتی تھی آنٹی کھاتی بہت کم ہے۔ میں تمہارے لیے مزید بحث ضرور کرتی مگر اب جب اس نے اپنی بیٹی کو ان چیزوں کا وارث قرار دے دیا ہے تو تم اٹھ جاؤ۔"

اور ثنا جلدی سے اٹھ گئی۔ اتنے میں کرنل بھی آ گئے جو ہر بات اور ہر ہنگامے سے بے خبر تھے اور بات ختم ہوگئی۔

"عمر تمہاری کزن آئی ہے۔" انہوں نے اخبار پر ہی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

"پھر؟" عمر نے ناگواری سے پوچھا۔

"ارے بھئی اپنی کزن کو گھمانے پھرانے کا ارادہ نہیں کیا؟" کرنل اس کے لہجے کی ناگواری محسوس نہ کر سکے۔

"پاپا! میں فارغ نہیں ہوں اور ویسے بھی۔" اس نے نجانے کیا سوچ کر بات ادھوری چھوڑ دی ورنہ لحاظ کرنے کا وہ عادی تو نہ تھا۔

ثناء اس کو دیکھتی رہ گئی۔ کتنی خوبصورتی سے وہ اپنا دامن بچا رہا تھا اور کتنی ناگواری سے اس کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے دیکھنے لگی۔ کیونکہ ناشتے کا آغاز ہو چکا تھا۔ مگر عمر کی نگاہ تو انجانے میں بھی اس پر نہیں پڑتی تھی وہ اس کی موجودگی میں یوں آنکھیں جھکا کر

بات کرتا گویا اسے دیکھنا گناہ کبیرہ ہو اس کے باوجود ثناء کے بے تاب دل میں عمر کی محبت اور جڑ پکڑ رہی تھی۔



وہ اسے صباء کی ڈائری اور آفاق کے خطوط کے بارے میں بتانا چاہتی تھی مگر ہمت نہ پڑ رہی تھی۔ اور وہ یونہی عجلت میں ناشتہ کر کے چلا بھی گیا۔

دوسری صبح ناشتے کے بعد وہ جانے کی بجائے اطمینان سے بیٹھا اخبار دیکھتا رہا اور ثناء اپنے دل میں عجیب سی خوشی محسوس کرتی رہی۔ کرنل اور پروین اٹھ کر چلے گئے مگر وہ وہیں بیٹھی رہی۔ کچھ دیر بعد ہی عمر نے اسے کمرے میں تنہا محسوس کیا ناگواری سے اٹھا اور کرسی کو ٹھوکر مار کر پرے کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ثناء کو اپنی شدید توہین کا احساس ہوا مگر کیا کہہ سکتی تھی۔

وہ باہر برآمدے میں کھڑی تھی جب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ آج اس کی تعطیل ہے۔ کیونکہ وہ تیار ہو کر کہیں جانے کے لیے باہر آیا تو پروین نے روک لیا۔

''عمر! آج تم فارغ ہو؟'' پروین نے محبت سے پوچھا۔

''جی ممی!'' اور پھر جیسے ہی وہ ان کی بات سمجھا تو منہ بگڑ گیا۔

''عمر تم کچھ سمجھتے کیوں نہیں؟'' پروین نے بے بسی سے کہا۔

''کیا ہوا ممی؟'' وہ جاتے جاتے رک گیا، ہلکے سبز شلوار سوٹ میں وہ اپنے دراز قد میں پرکشش لگ رہا تھا۔

''عمر اگر ثناء کو کہیں گھمانے لے جاؤ گے تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا؟''

''ممی! آپ کو اس کی فکر کیوں ستا رہی ہے۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں وہ یہاں کا چپہ چپہ اپنے منگیتر کے ساتھ گھوم چکی ہے۔'' اس نے تلخی سے جواب دیا اور ثناء کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکی۔

''کچھ بھی ہو بیٹا! وہ ہمارے یہاں تو پہلی بار آئی ہے اور تمہارا یہ فرض ہے کہ تم اسے گھماؤ اور......''

''سوری ممی۔'' وہ ان کی بات کاٹ کر تلخ لہجے میں بولا۔ ''مجھے کوئی دلچسپی نہیں آپ کی بھتیجی سے، آپ کو اگر اس کی کچھ زیادہ ہی فکر ہے تو یہ فریضہ خود ادا کیجیے میں یہ سب نہیں

کر سکتا۔'' اس نے لاپرواہی سے کاندھے اچکائے۔

''کیوں بھئی کس بات پر یہ بحث چل رہی ہے؟'' اچانک کرنل آ گئے اور پروین کو گویا ایک سہارا مل گیا۔

''آپ اس سے کہیں کہ یہ ثناء کو ذرا گھما لائے۔'' پروین نے موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''اوہ ہاں، آج تعطیل ہے۔ ارے سنی یہاں آؤ بیٹی!'' کرنل نے آواز دی اور ثناء جو برآمدے کے ستون سے لگی سب کارروائی دیکھ اور سن رہی تھی، تیزی سے ان کے قریب آئی۔ اسے دیکھتے ہی عمر جلدی سے جیپ کی جانب بڑھ گیا جیسے اگر اور رکا تو کرنل زبردستی ثناء کو اس کے ساتھ بھیج دیں گے۔ مگر پروین کب موقع گنوانے والی تھی جلدی سے بولی۔

''جاؤ سنی تم بھی بھاگ کر جیپ میں بیٹھ جاؤ۔'' کرنل نے حیران ہو کر پروین کی طرف دیکھا۔ جیسے کچھ نہ سمجھے ہوں اور ثناء نے وہی کیا جو پھپھو نے کہا تھا۔ اس نے ایسی تیزی دکھائی کہ عمر کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ بھاگ کر جیپ کے پاس چلی آئی۔

''بہت شوق ہے تمہیں گھومنے کا۔'' عمر غرایا۔ ''مجھے معلوم ہے گھومنے کے لیے تم کسی بھی مرد کے ساتھ جا سکتی ہو۔'' اس کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔ ثناء کا سارا جذبہ ساری خوشی مدھم پڑ گئی۔ وہ جیپ کے پاس کھڑی بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگی۔

''چلو بیٹھو۔'' عمر نے جیپ کا دروازہ کھول دیا اور ثناء جیپ میں بیٹھتے ہوئے سوچنے لگی۔ جب کسی سے سچے دل سے محبت کی جائے تو اس کی خاطر ہر بات برداشت کرنے کی عادت ہو جاتی ہے۔ شاید اس لیے کہ دل میں صرف اور صرف اسی کا خیال ہوتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ عمر ہر سال بے عزت ہونے کے باوجود ان سب کی تلخ اور سخت باتیں سننے کے باوجود صباء کی خاطر اس گھر میں چلا آتا تھا اور آج میں عمر کے لیے، عمر ہی کی نفرت سہنے پر مجبور ہوں۔

عمر نے ایک جھٹکے سے جیپ اسٹارٹ کی اور ثناء چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار نجانے جیپ کہاں بھگائے لے جا رہا تھا۔ ثناء اس کو دیکھتی رہی جو دانت پر دانت جمائے مسلسل سامنے دیکھتا جا رہا تھا نہ خود کوئی بات کر رہا تھا اور نہ بات سننے کے موڈ میں تھا۔ پھر جیپ رک گئی وہ کچھ دیر اسی پوزیشن میں بیٹھا پتہ نہیں کیا سوچتا رہا پھر یکدم مڑ کر پلٹا۔

''دکھائی نہیں دیا۔''

''کیا؟'' ثناء نے گھبرا کر ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہی کہ جیپ رک گئی ہے۔'' اس نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

''اچھا۔ مگر میں کیا کروں؟'' ثناء نے کچھ ڈر کر اور کچھ حیران ہو کر پوچھا۔ عمر نے گھور کر اسے دیکھا اور دانت پیستے ہوئے بولا۔

''نیچے اترو۔''

''اوہ......اچھا، اچھا۔'' ثناء چونک کر نیچے اترنے لگی مگر پھر کچھ سوچ کر رک گئی۔

''اب کیا تکلیف ہے۔'' عمر نے کڑی نظروں سے دیکھا۔

''پہلے آپ اتریں۔'' ثناء نے بھی ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

''کیوں؟'' اب حیران ہونے کی عمر کی باری تھی۔

''اگر میں پہلے اتری تو آپ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔'' ثناء کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ اتر گیا پھر ثناء بھی اتر آئی عمر نے جیپ لاک کی اور لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ اور ثناء اس کے پیچھے بھاگ بھاگ کر یوں چلنے لگی جیسے پھانسی کے لیے جا رہی ہو۔ اچانک وہ رکا اور ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ ثناء نے بھی خاموشی سے اس کی تقلید کی اور خاموش بیٹھ گئی۔

ایک گھنٹہ اسی حالت میں گزر گیا نہ عمر نے کوئی بات کی، نہ ثناء نے۔ گویا وہ تفریح پر نہیں فاتحہ پڑھنے آئے ہوں۔ تاہم اس کے باوجود وہ خوش تھی۔ یہ سوچ کر کہ عمر اس کے قریب ہے۔ وہ عمر جو اب اس کی چاہت تھا۔ جو اس کے دل و جان کا مالک تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ بیگانہ بھی۔

ثناء کبھی کبھار ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھ لیتی جو مسلسل زمین کو دیکھے جا رہا تھا۔ ثناء کو اس کی حالت پر ہنسی بھی آ رہی تھی اور خوش بھی ہو رہی تھی۔ وہ نظریں گھما کر آس پاس دیکھنے لگی۔

اچانک عمر اٹھ کھڑا ہوا اور ثناء بھی جلدی سے کھڑی ہو گئی اور دل میں سوچنے لگی۔ ''لوگ کہہ رہے ہوں گے یہ کتنا احمق جوڑا ہے جو بجائے خوش گپیوں کے تفکرات میں گم ہے۔''

عمر نے گردن گھما کر اسے دیکھا اور بگڑ کر بولا۔ ''تم یہیں بیٹھو۔''

''نہیں آپ مجھے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔'' ثناء نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

عمر نے گھور کر اسے دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''بے شک ایسا ہی کرتا مگر ممی کے کہنے پر لایا ہوں واپس بھی لے جاؤں گا۔'' بات ختم کر کے وہ آگے بڑھا تو ثناء پھر سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''مگر آپ جا کہاں رہے ہیں؟''

''تم سے مطلب؟ کہیں بھی جاؤں۔'' وہ اجنبی لہجے میں بولا۔

''پلیز عمر! مجھے بھی ساتھ لے جائیں، میں جیپ میں ہی بیٹھی رہوں گی۔'' ثناء نے پیشکش کی۔

''مجھے مشورہ دینے کی ضرورت نہیں۔ میں بہتر جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔'' اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے اگر آپ ساتھ لے جانا نہیں چاہتے تو نہ سہی مگر آپ آئیں گے کب؟'' ثناء نے ہار مان کر پوچھا۔

''معلوم نہیں۔'' اس نے لاپرواہی سے کہا اور چلا گیا۔

وہ نجانے کہاں گیا تھا۔ کئی گھنٹے گزر گئے مگر وہ نہ آیا۔ ثناء بیٹھے بیٹھے تھک گئی۔ بھوک بھی ستانے لگی تھی مگر وہ ظالم ابھی تک نہ آیا تھا۔ 'شاید وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا ہے۔' ثناء نے سوچا...... مگر نہیں، وہ کہتا تھا ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔ ثناء بجائے غصے کے پریشان ہونے لگی۔ خدا خیر کرے پتہ نہیں وہ کیوں نہیں آیا۔

ثناء ابھی تک وہیں بیٹھی تھی جہاں وہ اسے بٹھا کر گیا تھا۔ جیسے ماسٹر بچے کو سزا دے کر گیا ہو وہ ایسے ہی بیٹھی تھی۔

بیٹھے بیٹھے کمر دکھنے لگی تو وہ اٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ ایسے میں تین لڑکے اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ پہلے تو انہوں نے سیٹیاں بجا کر ثناء کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ پھر آوازے کسنے لگے۔ ''اللہ عمر اب تو آ جاؤ۔'' ثناء رو دینے کے قریب تھی۔ ''اتنی کڑی سزا مت دو عمر! میں تم جیسے ظرف کی مالک نہیں ہوں۔ خدا کے واسطے اب تو آ جاؤ پلیز آ جاؤ۔'' وہ بڑبڑائی۔

''ہیلو۔'' ان میں سے ایک لڑکے نے مسکرا کر بات کی اور ثناء گھبرا کر واپس وہیں آ

کر بیٹھ گئی جہاں عمر بٹھا کر گیا تھا۔ اور وہ لڑکے بجائے ڈرنے یا کہیں اور جانے کے کچھ فاصلہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ یہ فاصلہ بھی انہوں نے شاید اس لیے رکھا تھا کہ یہ فوجیوں کا شہر تھا اور دارالحکومت۔ ثناء کو تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ اس وقت اسلام آباد کے کسی پارک میں تھی یا باہر۔ وہ تو مسلسل عمر کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی شاید اسی لیے ان لڑکوں میں سے ایک نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''مس! آپ کچھ پریشان ہیں کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں۔''

''ارے بھئی صبح کی بیٹھی ہے وہ نہیں آئے جن کا انتظار تھا۔'' دوسرے نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''چچ چچ یار اگر وہ نہیں آئے تو کیا ہوا ہم تو ہیں۔'' تیسرے نے ہنس کر کہا۔ ثناء جل کر رہ گئی۔ جی چاہا اٹھ کر تینوں کو اتنے جوتے لگائے کہ سر پر ایک بھی بال نہ رہے۔ مگر وہ خوفزدہ سی بیٹھی رہی۔

''آپ یقین کریں وہ نہیں آئے گا، لیجیے ہم حاضر ہیں جس کو آپ پسند کریں۔'' ان تینوں نے کورس کے انداز میں کہا۔

''اوشٹ اپ۔'' ثناء غصے سے چیخ کر بولی۔

''ارے یہ تو بولتی بھی ہے میں تو سمجھا تھا۔'' بات ادھوری چھوڑ کر اس نے بے ہودہ قہقہہ لگایا تو باقی ساتھی کھی کھی کر کے ہنسنے لگے۔

''ایڈیٹ یو فول۔'' ثناء مارے غصے کے کھڑی ہو گئی۔

''ارے ارے کہاں چلیں محترمہ۔'' ان میں سے ایک نے ثناء کا آنچل تھامنا چاہا۔ ثناء نے گھبرا کر قدم پیچھے ہٹایا تو سامنے چٹان کی طرح عمر کھڑا تھا۔ ثناء کو یکدم حوصلہ مل گیا۔

''عمر...... عمر آپ کہاں چلے گئے تھے؟'' ثناء نے مضبوطی سے اس کا بازو تھام لیا۔ دل بھر آیا اور آنسو بہنے لگے اور خلاف توقع عمر بھی چپ رہا۔ تاہم ان لڑکوں کے حوصلے ذرا بھی کم نہ ہوئے۔

''مسٹر آنا تھا تو پہلے آتے اب تو یہ۔'' لڑکا بات ادھوری چھوڑ کر قلابازیاں کھاتا ہوا لڑھک گیا۔ عمر نے صرف لات چلائی تھی باقی لڑکے اپنے ساتھی کو دیکھنے لگے اور عمر بجائے دنگا فساد کے بازو چھڑا کر آگے بڑھ گیا اور ثناء بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی۔

''بہت دیر لگا دی آپ نے۔'' ثناء نے ڈرائیو کرتے ہوئے عمر کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

مگر عمر یوں جیپ چلاتا رہا جیسے بات سنی ہی نہ ہو۔ ثناء نے دو ایک بار اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی مگر جب عمر نظر انداز کرتا رہا تو وہ خود بھی چپ ہو گئی۔

شام ہو رہی تھی۔ جب وہ لوگ گھر آئے۔ پروین اس کے جانے سے بے انتہا خوش تھی۔ اب جب واپس آئے تو دیکھتے ہی پوچھا۔

''کہاں کہاں کی سیر کی ہے میری بیٹی نے۔''

''پھپھو جان! ایک جگہ ہو تو بتاؤں بھی، پتہ نہیں عمر کہاں کہاں لے کر گئے۔'' ثناء نے عمر پر اپنی بات کا ردعمل دیکھنے کے لیے نظر بھر کے اسے دیکھا۔ مگر وہ سپاٹ لہجے میں ماں سے مخاطب ہوا۔

''ممی کھانا دیجیے بھوک ستا رہی ہے۔''

''ہائیں تو کیا دن بھر میں کھایا کچھ بھی نہیں۔ ارے میری بچی سارا دن بھوکی رہی۔ تم تو فوجی ہو مگر وہ تو تم جیسی پتھر نہیں۔'' پروین نے گھور کر عمر کو دیکھا۔

ثناء کا جی چاہا چیخ چیخ کر روئے اور کہے۔ ''پھپھو جان! بڑا ظلم کیا ہے انہوں نے آج مجھ پر۔'' مگر وہ کہہ نہ سکی کیونکہ عمر نے تو آج ہی ظلم کیا تھا۔ وہ تو ہمیشہ ظلم کرتی آئی تھی۔ یہی سوچ کر بولی۔

''پھپھو جان انہوں نے خود کچھ نہیں کھایا میں تو سارا دن خوب کھاتی رہی ہوں۔''

پھر وہ اپنا جھوٹ نبھانے کے لیے بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ کیونکہ اگر وہ مزید وہاں کھڑی رہتی تو اپنے اس جھوٹ کو نبھا نہ پاتی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کھانا اس کے سامنے ہوتا اور وہ چپ چاپ برداشت کرتی رہتی۔

سارا دن بیٹھے بیٹھے وہ بے حد تھک گئی تھی۔ اسی لیے کمرے میں آتے ہی دوپٹہ اور کوٹ شوز اتار کر وہ سیدھی بیڈ پر لیٹ گئی اور سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ مگر بھوکے کو نیند کب آتی ہے۔ وہ بھی سونے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر جب معاملہ برداشت سے باہر ہو گیا تو اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کافی دیر دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ کچھ سوچتی رہی۔ پھر اٹھ کر دوپٹہ گلے میں ڈالا اور بغیر جوتا پہنے باہر نکل آئی۔ عمر کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور لائٹ جل رہی تھی۔ ثناء نے فوراً دل میں کوئی فیصلہ کیا اور واپس کمرے میں چلی آئی، کچھ دیر بعد جب

وہ دوبارہ باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں صباء کی ڈائری، انگوٹھی اور آفاق کے خطوط تھے۔ وہ بے آواز چلتی ہوئی عمر کے دروازے تک آئی اور بغیر دستک دیئے ہمت کر کے اندر داخل ہوگئی۔

عمر نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ شاید ڈائری لکھ رہا تھا۔ کیونکہ قلم اس کے ہاتھ میں تھا۔ ثناء کو دیکھ کر بولا۔ ''تم'' اور پھر جھک کر ڈائری بند کرنے لگا۔

''جی میں۔'' ثناء نے کہا اور وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔

''میرے کمرے میں آنے کی تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟'' وہ پھر غصے سے بھر گیا۔

''اب نیند نہیں آرہی ہوگی۔ بھوک لگی ہے تو کچن میں جاؤ۔ تمہارا کیا خیال تھا۔ میں وضاحت کروں گا کہ تم سارا دن بھوکی رہی ہو، تم تو مر بھی جاؤ تو میں تمہاری موت کی وضاحت نہ کروں۔ اب اگر جھوٹ بولا ہے تو ضبط بھی کرو اور یہاں سے چلی جاؤ میں تمہیں مزید برداشت نہیں کرسکتا۔ چاہو تو کچن میں بھی جاسکتی ہو۔'' اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''میں نے یہ کب کہا کہ آپ وضاحت کرتے۔'' ثناء نے شکوہ بھرے انداز میں کہا۔

''پھر یہاں کیا لینے آئی ہو؟ جاؤ یہاں سے۔'' اس نے بگڑ کر کہا۔

''عمر! میں بلا مقصد آپ کے کمرے میں نہیں آئی۔ دراصل میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''باتیں اور مجھ سے جاؤ میرا وقت ضائع مت کرو۔ جاؤ یہاں سے۔'' وہ آخر میں ''یہاں سے'' پہ زور دے کر بولا۔ مگر ثناء بھی ڈھیٹ بنی کھڑی رہی۔

''عمر! آپ پوچھیں گے نہیں کہ میں آپ کے گھر کیوں آئی ہوں جبکہ میں اپنے پاپا کے خاندان والوں سے شدید نفرت کرتی تھی۔ آپ یہ نہیں جاننا چاہیں گے کہ میری نفرت، محبت میں کیسے بدلی؟''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں کچھ پوچھنے کی یا جاننے کی۔'' عمر اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''حقیقت آپ بھی جانتے ہیں۔ جان بوجھ کر انجان بننے سے فائدہ؟ اب تو میں بھی جان گئی ہوں اور اسی لیے میں چاہتی ہوں۔''

''تم...... تم کیا جان گئی ہو اور اگر جان بھی گئی ہو تو غلط جگہ پر آئی ہو اور غلط وقت پر آئی ہو۔ میں کہتا ہوں چلی جاؤ میرے کمرے سے۔'' وہ چلایا۔

''مگر عمر میری بات تو سنیے۔'' ثناء نے کہنا چاہا لیکن وہ بالکل ہی بگڑ گیا۔

''میں کہتا ہوں دفعہ ہو جاؤ یہاں سے ورنہ......''

''ورنہ؟'' اسے چڑانے کے لیے ثناء نے مسکرا کر پوچھا۔

''تم جانتی ہو میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔'' عمر تلخ لہجے میں بولا۔

''تو کہہ دیجیے نا۔'' ثناء نے بدستور مسکراتے ہوئے اس کے سرخ چہرے کو دیکھا۔ حالانکہ وہ کس دل سے مسکرا رہی تھی یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔

''تم یوں نہیں باز آؤ گی۔'' وہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ثناء سمجھ گئی اب وہ اسے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا راہداری میں لے جائے گا اسی لیے جلدی سے بولی۔

''پلیز عمر! میری بات سن لیجیے پھپھو صباء فوت ہو چکی ہیں۔ اگرچہ ورثے میں انہوں نے کچھ خاص چیزیں نہیں چھوڑیں۔ مگر جو کچھ بھی چھوڑا ہے، اس کے حقدار صرف آپ ہیں۔ یہ لیجیے اپنی امانت اسی کو دینے میں یہاں آئی ہوں۔'' ثناء نے ایک پیکٹ عمر کی جانب بڑھایا جسے حیران اور پریشان عمر نے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''آپ اس کو اچھی طرح پڑھ لیں پھر آپ سے باقی باتیں ہوں گی۔'' ثناء نے کہا اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

اس کے بعد کوشش کے باوجود اس کو نیند نہ آئی اُدھر اگر عمر جاگ رہا تھا تو اِدھر ثناء بھی جاگ رہی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ابھی عمر کے پاس جائے تاکہ تمام بات صاف ہو جائے۔ پھر وہ خوفزدہ ہو کر سوچتی خطوط اور ڈائری پڑھ کر عمر بہت غصے میں ہوں گے۔ کہیں مجھے مار ہی نہ ڈالیں۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ موت سے ڈرتی تھی۔ بات تو صرف یہ تھی کہ اس کو مار کر خود عمر بھی نہ بچ پاتا، جبکہ وہ عمر کی زندگی چاہتی تھی۔



تین بجے کے بعد خود سے لڑتی رہی کہ وہ عمر کے پاس نہیں جائے گی، مگر یہ فیصلے کی رات تھی اور وہ صبح ہونے سے پہلے اپنے بارے میں ہونے والا فیصلہ سننا چاہتی تھی۔ خواہ وہ فیصلہ سزا کی شکل میں ہوتا یا جزا کی شکل میں۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے سے باہر آئی۔ راہداری میں نائٹ بلب ابھی تک روشن تھا اور عمر کے کمرے کا دروازہ بھی ویسے ہی کھلا ہوا تھا۔ جیسے وہ چھوڑ گئی تھی۔ گویا وہ ابھی تک بیڈ سے نہ اٹھا تھا۔

ثناء آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دروازے کے قریب آئی اور دستک دیتی ہوئی اندر داخل

ہوگئی۔ کمرے میں قبرستان کی سی خاموشی تھی۔

عمر بیڈ پر سیدھا لیٹا تھا اس کے سینے پر صباء کی ڈائری اور آفاق کے خطوط پڑے ہوئے تھے۔ یہی وہ تلخ حقیقتیں تھیں، جنہیں جاننے کے لیے جن کو سمجھنے کے لیے عمر ساری زندگی بے تاب رہا اور آج کی رات حقیقتوں کی رات تھی اور یہ تلخ حقیقتیں جان کر دل پر مزید بوجھ کا اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ باتیں جو صباء سے براہ راست نہ پوچھ سکا تھا اور وہی باتیں جو صباء خود بھی اسے نہ بتا سکی تھی۔ آج وہ سب باتیں کھل کر عمر کے سامنے آئی تھیں اور عمر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان بے وقت کی حقیقتوں کے سامنے اب کرے تو کیا کرے؟

وہ مسلسل چھت میں لگے ہوئے فانوس کو گھورے جا رہا تھا جبکہ ذہن ماضی میں بھٹک رہا تھا۔

ثناء کی کمرے میں آمد اس نے محسوس کی تھی مگر نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اس کی موجودگی کے باوجود وہ یونہی لیٹا رہا۔ کیونکہ وہ اس کی اس وقت شکل دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ اسے دیکھ لیتا تو نہ جانے غصے میں کیا کر بیٹھتا۔

ثناء انتہائی دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کچھ گھنٹے پہلے وہ ایک زندہ عمر کو چھوڑ کر گئی تھی مگر اس وقت اس کے سامنے لیٹا ہوا عمر صرف مٹی کا ایک ڈھیر لگ رہا تھا۔ جو نہ کسی کو دیکھ رہا تھا نہ جنبش کر رہا تھا۔ ثناء اس کی اس کیفیت کو، اس ذہنی حالت کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی، محسوس کر رہی تھی۔ مگر اس کے لیے کچھ کر نہ سکتی تھی۔ کتنی دیر گزر گئی وہ یونہی کھڑی عمر کے بولنے اور حرکت کرنے کی منتظر رہی اور جب کسی طرح بھی عمر کو بولنے پر آمادہ نہ پایا تو اس کے بیڈ کے قریب چلی آئی۔

''عمر! عمر میں یہ کہنے آئی ہوں کہ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے۔ اگرچہ اب میں اس کا کوئی مداوا نہیں کر سکتی۔ مگر اس کے باوجود اس دکھ کو محسوس کرتے ہوئے میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ کیونکہ میں اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتی۔''

عمر نے سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے اسے دیکھا اور اب تک جس ضبط کا دامن پکڑے بیٹھا تھا وہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ غصے میں بھرا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''معافی...... معافی کس بات کی مس رضوان! بھلا جرم کرنے والے بھی کبھی معافیاں مانگتے ہیں۔ اگر انہیں معافی کا خیال ہو تو وہ جرم ہی کیوں کریں اور تم...... تم کیوں معافی

مانگ رہی ہو۔ جرم کی ابتداء تو تمہاری ماں نے کی تھی۔ ایک عورت جب بیاہ کر سسرال آتی ہے تو یہ کیوں چاہتی ہے کہ شوہر صرف اس کا اس کے میکے والوں کا ہو کر رہ جائے۔ اپنے ماں، باپ اور بہن بھائی بھی ہوتے ہیں شوہر کے ان کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ مگر پرائی بیٹی کیا سمجھے؟ تمہارا یہ جرم تو ناقابل معافی ہے۔ سوچو ذرا تم بھی درد کے حوالے سے سوچو ایک زندگی اس دنیا میں آئی اور تباہ و برباد ہو کر چلی گئی۔ کس کی وجہ سے؟ صرف تم لوگوں کی وجہ سے۔'' وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ ''اف آنٹی آپ نے کتنی اذیت برداشت کی؟ آپ نے کتنی تکلیفیں سہیں؟ ایک بھائی سے اگر مار کھائی تو دوسرے کی بیوی کی زہر بھری باتیں سنتی رہیں اور برداشت کرتی رہیں۔ آنٹی آپ یہ سب کیسے برداشت کرتی تھیں آپ نے مجھے کیوں نہ بتایا مجھے کیوں نہ سب کچھ بتایا۔'' عمر نے اذیت سے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

''عمر پلیز۔'' ثناء اس کی حالت پر تڑپ اٹھی۔ ''ہونی کو کب کوئی روک سکا ہے جو ہونا تھا وہ تو کب کا ہو چکا اور اس ہونے والے کو اب نہ آپ بدل سکتے ہیں اور نہ میں۔ پلیز عمر خود کو سنبھالیے۔''

''مگر وہ سب ختم کب ہوا ہے؟'' وہ کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ سب کب ختم ہوا ہے مس رضوان! آنٹی کی وہ تنہائیاں، وہ ویرانیاں، وہ تلخیاں، اداسیاں اور درد وہ سب تو میرے وجود میں سرایت کر گیا ہے، مجھ میں پیوست ہو گئیں ان کی سب تکلیفیں۔ میں ان کی داستان درد سے واقف تھا۔ اس لیے ہر طرح سے ان کا دل بہلاتا تھا۔ وہ میری آنٹی تھیں۔ ماں تھیں۔ دوست تھیں۔'' وہ یکدم چیخا۔ ''میں انکل آفاق نہیں تھا۔ ذلیل لڑکی سنا تم نے میں سب کچھ تھا مگر انکل آفاق نہیں۔ وہ ایک رشتہ جو مقدس بندھن میں بندھ کر عورت کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ عورت کو تحفظ دیتا ہے۔ اس کا محافظ بنتا ہے۔ میں وہ کب تھا۔ ہائے آنٹی جان! میں اتنے رشتوں کا دعوے دار ہوتے ہوئے بھی آپ کے کسی ایک دکھ کا بھی مداوا نہ کر سکا آنٹی! میں آپ کے لیے بہت کچھ کرتے ہوئے بھی انکل آفاق کو ڈھونڈ کر نہ لا سکا۔ آنٹی میں ان کو آپ کے پاس نہ لا سکا اور آپ ناراض ہو کر چلی گئیں۔ آپ نے یہ نہ سوچا کہ عمر آپ کے بغیر کیسے جیے گا اور کب تک جیے گا۔ آپ نے کچھ نہ سوچا آنٹی اور مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔'' وہ بچوں کی طرح سسک پڑا۔

"پلیز عمر! آپ چپ ہو جایئے، آپ زندہ رہیں گے۔ ہاں عمر آپ زندہ رہیں گے۔" ثناء تڑپ کر رو دی۔

"تم!" عمر غصے سے چیخا۔ "تم یہی چاہتی ہو میں زندہ رہوں صرف تمہارے لیے۔ پہلے بھی جو تم نے اور تمہاری ماں نے چاہا وہ ہو گیا۔ مگر اب میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے نفرت ہے تم سے، نفرت تھی اور یہ نفرت ہمیشہ رہے گی مس رضوان! تم جو کہ قاتلہ ہو میری آنٹی کی۔ میری مقدس ماں کی۔ مجھے اگر تمہیں سزا دینے کا اختیار ہوتا تو میں تمہیں سو بار سنگسار کرنے کا حکم دیتا اور سو بار زندہ کرنے کا۔ مگر افسوس میرے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں۔ تم چلی جاؤ یہاں سے ورنہ، ورنہ بجائے مجاہد کے شاید میں ایک قاتل، بن جاؤں۔ خدا کے لیے تم چلی جاؤ۔" وہ غرایا۔ "اف آنٹی اس گھر میں جہاں آپ رہتی تھیں جہاں آپ نے ایک طویل عمر گزاری اور جن لوگوں کی خوشیوں کے لیے آپ نے یہ سب کچھ کیا، وہاں اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی کوئی آپ کا اپنا نہ تھا۔ آنٹی! کاش آپ نے اپنے دکھ مجھے بتائے ہوتے، مجھے بچہ سمجھ کر نظر انداز نہ کیا ہوتا۔ میں بچہ تو کبھی نہ تھا۔ مگر اس کے باوجود میں آپ کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ اور جب میں نے آپ کے لیے کچھ کرنے کا سوچا تو آپ روٹھ کر چلی گئیں۔ آپ کیوں چلی گئیں آنٹی!" وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

ثناء کچھ دیر دکھ سے کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر عمر کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"عمر خدا کے لیے خود کو سنبھالیے۔"

"تم ابھی تک یہیں ہو۔ جاؤ یہاں سے دور کہیں دفعہ ہو جاؤ۔" عمر اس کو دھکا دیتے ہوئے دھاڑا۔ ثناء کئی قدم دور جا گری، پھر اٹھتے ہوئے چیخی۔

"عمر! آپ کے رونے سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ صباء پھپھو واپس نہیں آ سکتیں خود پر ترس کھایئے۔ خود پر نہیں تو اس ماں پر ترس کھایئے جس نے آپ کو جنم دیا۔"

"تم کون ہوتی ہو مجھ سے یا میری ماں سے ہمدردی کرنے والی۔ تم یہاں سے دفعہ ہو جاؤ۔" وہ غصے سے اس کی جانب بڑھتے ہوئے غرایا اور ثناء چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ عمر کے جذبات کو وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ کیونکہ وہی جذبے اب اس کے اندر بھی بیدار ہو چکے تھے مگر جذبے بیدار ہونے سے کیا ہوتا تھا۔ اب وقت اس کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ کسی کے بھی ہاتھ میں نہ تھا۔ وہ اس الجھن کا حل سوچتی رہی اور رات دھیرے دھیرے

گزرتی رہی۔



لاہور میں ثناء اور سہیل کی شادی کی تیاریاں پورے عروج پر تھیں۔ فوزیہ نے اگرچہ کسی نند کو اطلاع نہیں کی تھی۔ مگر اس کی دیورانی کو چونکہ سب تفصیل کا علم تھا۔ اس لیے وہ ہر صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی جٹھانی کا ہاتھ بٹانے ان کے گھر چلی آتی۔

شادی میں اب دن ہی کتنے تھے صرف چار اور آج جب رضوان گھر آئے تو چھپے ہوئے انویٹیشن کارڈز کا پیکٹ ان کے ہاتھ میں تھا۔

"لو بھئی کارڈ چھپ گئے۔" انہوں نے پیکٹ فوزیہ کے سامنے پھینکتے ہوئے بے زاری سے کہا۔

"ہائیں۔ ہائیں یوں تو نہ پھینکیے۔" فوزیہ جلدی سے قالین پر گرا ہوا پیکٹ اٹھاتی ہوئی بولی۔

رضوان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ بیٹھے بوٹوں کے تسمے کھولتے رہے۔

بوٹ ایک طرف رکھ کر انہوں نے چپل پاؤں میں ڈالی اور لباس تبدیل کرنے چلے گئے۔

کچھ دیر بعد وہ لباس تبدیل کر کے آئے تو فوزیہ غصے سے بھری بیٹھی تھی۔ رضوان کو دیکھتے ہی کارڈ ان کی طرف پھینکتی ہوئی بولی۔ "یہ انویٹیشن کارڈ ہیں یا عید کارڈ؟"

"کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا؟" سب کچھ جانتے ہوئے بھی رضوان انجان بن کر بولے۔

"آپ نے خود بھی دیکھے ہیں یہ کارڈ؟" فوزیہ غصے سے چیختی ہوئی بولی۔

رضوان اس کے غصے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کارڈ اٹھاتے ہوئے بولے۔ "کیوں بھئی کیا خرابی ہے ان میں؟ ٹھیک ٹھاک تو ہیں۔"

"آپ کو تو ہر کام ہر بات ٹھیک ٹھاک نظر آتی ہے۔ اسی لیے تو لوگ الو بناتے ہیں۔ خرابی تو میں پکڑتی ہوں۔ یہ دیکھیے ان کارڈز پر صرف ثناء کا نام لکھا ہے۔"

"بھئی شادی ثناء کی ہو رہی ہے تو ثناء ہی کا نام لکھا جائے گا۔ تم تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو۔" وہ دل ہی دل میں اس کے غصے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولے۔

"رضوان! خدا کے لیے سمجھنے کی کوشش کریں۔ کارڈز پر دلہن کے ساتھ دلہا کا نام بھی ضرور ہوتا ہے مگر آپ نے صرف ثناء کا لکھوایا ہے۔ سہیل کا نام نہیں۔" فوزیہ انہیں سمجھاتی

ہوئی بولی۔

''افوہ! یہ تو بہت بڑی غلطی ہوگئی۔'' رضوان خواہ مخواہ پریشان ہوتے ہوئے بولے۔

''مگر فوزی! اب کیا ہوسکتا ہے؟ شادی میں صرف چار روز باقی ہیں کارڈز دوبارہ چھپنے دیئے تو شادی کے بعد ملیں گے۔ شادی سے پہلے نہیں۔ مجبوری ہے، اب یہی کارڈ تقسیم کرو ورنہ مزید دیر ہو جائے گی۔ ویسے بھی میرے خیال میں اس میں کوئی حرج نہیں اگر دولہا کے نام کے بغیر کارڈ چھپ جائیں۔'' وہ چپ ہوگئے۔

فوزیہ جانتی تھی انہوں نے یہ سب جان بوجھ کر کیا ہے۔ وہ بہت شاطر عورت تھی وقت نکالنا اچھی طرح جانتی تھی۔ اس لیے چپ ہوگئی۔ وہ نرمی سے یہ باقی چار دن پورے کرنا چاہتی تھی کیونکہ ثناء ابھی تک واپس نہ آئی تھی اور اگر وہ مزید دو روز نہ آتی تو فوزیہ، رضوان سے ہی بات کرسکتی تھی۔ ابھی اس کو رضوان سے کام تھا اس لیے نرمی ضروری تھی۔

''سنیے!'' وہ رضوان کے قریب بیٹھتی ہوئی ملائم لہجے میں بولی۔ ''شادی میں صرف چار روز باقی ہیں اور ثناء ابھی تک واپس نہیں آئی آپ کچھ کیجیے نا۔''

''میں کیا کروں؟'' رضوان خشک لہجے میں بولے۔ ''تمہاری طرح تمہاری بیٹی بھی خود اپنی مرضی کی آپ مالک ہے تمہیں معلوم تھا وہ یہاں نہیں ہے پھر بھی تم نے شادی کی تاریخ طے کر دی۔''

''ممی! آپ کہیں تو آپی کو میں خود جا کر لے آؤں۔'' نومی جو قریب ہی بیٹھا ہوم ورک کر رہا تھا جلدی سے بول پڑا۔

''ہاں بھئی نومی یا فومی کو بھیج دو یہ بہن کو لے آئیں گے۔'' رضوان نے کہا۔

''ممی! فومی کو نہیں صرف مجھے۔ ابھی چلا جاؤں گا۔'' وہ کتابیں بند کرنے لگا۔

''تم چپ رہو۔'' فوزیہ اس کو گھورتی ہوئی بولی۔ ''میں تم سب کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔'' اس کا اشارہ رضوان کی جانب بھی تھا جسے سمجھ کر وہ مسکرا دیئے۔ انہوں نے جان بوجھ کر کارڈز پر سہیل کا نام نہیں لکھوایا تھا۔ نہ جانے کیوں انہیں یقین تھا یہ شادی سہیل سے ہرگز نہ ہوگی۔ کسی اور سے بے شک ہو جائے اور کوئی کون تھا عمر فاروق یا۔ اس کے آگے انہوں نے ابھی بالکل نہیں سوچا تھا۔ اچانک وہ چونک پڑے فوزیہ نومی کو ڈانٹ رہی تھی۔

''بس میں نے کہہ دیا تم اس کو لینے ہرگز نہیں جاؤ گے۔''

''مگر کیوں ممی! ایک تو آپ پریشان ہیں پھر بھی مجھے روکتی ہیں۔''

''نومی! میں تمہیں جانتی ہوں۔ تم گئے تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ تم ضرور اسے اس کی شادی کا بتا دو گے اور وہ آنے سے انکار کر دے گی۔''

''اگر ایسی بات تھی ممی تو آپ نے اتنا بڑا رسک کیوں لیا۔ اگر شادی ثناء آپی کی ہو رہی ہے تو انہیں بتانا تو پڑے گا۔'' نومی معصوم صورت بنا کر بولا۔

''بکواس بند کرو۔'' فوزیہ غصے سے چیخیں تو کھانسی آ گئی۔

''کیا بات ہے ممی؟'' فومی ان کی تیز آواز سن کر اپنے کمرے سے اٹھ کر باہر آ گیا۔

''تم لوگوں کو تو کسی بات کا ہوش ہی نہیں۔'' فوزیہ غصے میں رو دینے کے قریب تھی۔

''شادی میں صرف چار روز باقی ہیں۔ اور سب کام جوں کا توں پڑا ہے۔ ثناء بھی چلی گئی۔ بہت سالوں میں محبت جاگی ہے اور سارے کام میں اکیلی جان کر رہی ہوں۔ کسی کو توفیق نہیں ہوتی کچھ کرنے کی۔ کچھ سوچنے کی۔ سب بے فکر پھرتے ہیں اور کام......''

''یہ سب کس وجہ سے ہو رہا ہے ممی؟ آپ کو پہلے ہی سوچ سمجھ کر سب کچھ کرنا چاہیے تھا جب ہمارے کرنے کا کام آئے گا تو ہم بھی کر لیں گے۔ ابھی سب کام آپ کے کرنے کا ہے آپ ہی کریں۔ باقی رہیں ثناء آپی تو وہ یہاں موجود کب ہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا آخر آپ کو اتنی جلدی کیا تھی اور اگر جلدی کی ہے تو اب روتی کیوں ہیں؟ سب کام اب آپ ہی کو کرنا ہے۔'' فومی نے خشک لہجے میں کہا۔

''فومی!'' رضوان نے سخت لہجے میں پکارا اور وہ منہ بنا کر بولا۔

''پاپا! جب سب کچھ ممی نے خود کیا ہے تو پھر رونا کس بات کا؟'' وہ خشک لہجے میں کہتا ہوا باہر نکل گیا اور فوزیہ بے بس ہو کر ساس کو دیکھنے لگی۔

''آپ دیکھ رہی ہیں امی اس گھر میں کسی کو میری پرواہ نہیں کوئی میرا کہنا نہیں مانتا۔''

''کمال ہے ممی! اتنا سب کچھ اپنی مرضی سے کرتے ہوئے بھی آپ کو یہ شکوہ ہے۔'' نومی نے شرارت سے کہا۔

''بری بات ہے بیٹا ممی کو ایسا نہیں کہتے۔'' دادی پیار سے اس کو سمجھاتی ہوئی بولیں۔

''اور سنو رضوان، دو دن اور ثناء کا انتظار کر لو اگر وہ پھر بھی نہ آئی تو جمعرات کو علی الصبح جا کر اسے لے آنا اور بہن کو بھی دعوت دے آنا۔ بیٹا ایک کام جب شروع ہو چکا ہے تو اس کو ول

جل کرانجام دو۔''

''جی بہتر، امی جان!'' رضوان نے کہا اور فوزیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ گئے۔

''بہت بہت شکریہ امی جان! آپ نے میری پریشانی کو ختم کر دیا۔ بے شک آپ نے ہمیشہ مجھے بیٹیوں سے بڑھ کر چاہا ہے اور میں نے اس بات پر ہمیشہ فخر محسوس کیا ہے۔'' فوزیہ خوش ہوتی ہوئی بولی۔

''یہ آج نازیہ کیوں نہیں آئی۔'' ساس نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''پتہ نہیں ابھی فون کر کے معلوم کرتی ہوں۔'' فوزیہ نے کہا اور اٹھ گئی۔



رات بھر اگر ثناء جاگتی رہی تھی تو سویا عمر بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے کمرے کی لائٹ ساری رات جلتی رہی تھی۔ وہ دونوں جاگ رہے تھے۔ مگر الگ الگ سوچوں کے ساتھ، ثناء عمر کے لیے اور عمر صباء کے لیے آج ایک بار پھر صباء کی موت کا زخم تازہ ہو گیا تھا۔ وہ ساری زندگی آنٹی کے ساتھ رہا تھا مگر جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہی تھیں تب وہ ان سے بہت دور دوسرے شہر میں تھا۔ وہ سوچتا اگر میں اس وقت پاس ہوتا تو شاید آنٹی کوئی آخری بات مجھ سے کرتیں۔ وہ بات جو میری زندگی کا ماحصل بن جاتی۔ مگر افسوس، اس آخری وقت میں آنٹی کے پاس نہیں تھا۔ وہ نہ جانے کب تک سوچتا کہ اچانک فضا میں مؤذن کی آواز گونجی۔ وہ لوگوں کو بلا رہا تھا۔ اللہ کے گھر کی جانب پکار رہا تھا۔

وہ دونوں تو پہلے ہی جاگ رہے تھے۔ اچانک عمر کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ نماز کے لیے مسجد جا رہا تھا۔ ثناء نے بستر پر لیٹے لیٹے سوچا مگر اٹھ کر اسے دیکھنے نہیں گئی۔ کچھ دیر تک وہ یونہی لیٹی رہی پھر خود بھی نماز کی ادائیگی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کر وہ ناشتے کی میز پر آئی تو وہ ظالم جو کبھی مظلوم تھا میز پر موجود نہیں تھا۔ ثناء نے اس کے بارے میں پوچھنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ آج پھپھو، پھپھا بھی کچھ افسردہ تھے، پتہ نہیں یہ لوگ کیوں اداس ہیں؟ ثناء نے دل میں سوچا پھر ہلکا پھلکا ناشتہ کر کے چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ چونکہ وہ رات بھر جاگتی رہی تھی۔ اس لیے اس وقت سونا چاہتی تھی اور نیند بھی مہربان ہو گئی تھی۔

خواب میں اس نے دیکھا۔ پھپھو، پھپھا بہت آزردہ تھے ثناء نے سبب پوچھا تو پھپھو

روتی ہوئی اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولیں۔ ''تم چلی جاؤ ثنی۔ خدا کے لیے تم چلی جاؤ۔ تمہاری اس بے موقع محبت کی وجہ سے میرے گھر کا سکون خراب ہو رہا ہے۔ میرا بیٹا مجھ سے دور ہو رہا ہے۔ ثناء میرا ایک ہی بیٹا ہے میں تمہیں اس پر ترجیح نہیں دے سکتی۔ تم چلی جاؤ پھر شاید وہ کچھ بہتر ہو جائے۔'' کہتے ہوئے پھپھو پروین زور زور سے رونے لگیں۔

اچانک ہی ثناء کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ اس خواب کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس نے سوچا صبح پھپھو، پھپھا دونوں افسردہ تھے۔ اگر میں بات چیت کرتی تو وہ یقیناً مجھے اس گھر سے چلے جانے کا حکم دیتے اور یہ کچھ غلط نہ ہوتا۔ ان کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کے سکھ کے لیے وہ مجھے دکھ دے کر اس گھر سے نکال سکتے ہیں کیونکہ میں اسی قابل ہوں مگر قبل اس کے وہ مجھے چلے جانے کو کہیں مجھے خود ہی چلے جانا چاہیے۔

اچانک پھپھو پروین کے رونے کی آواز سن کر وہ اچھل پڑی۔ جلدی سے چپل پہن کر دوپٹہ سنبھالتی ہوئی بھاگ کر باہر آئی تو پھپھو پروین سچ مچ رو رہی تھیں۔

''پھپھو جان! آپ رو رہی ہیں پلیز بتایئے کیا بات ہے آپ کیوں رو رہی ہیں؟''

پروین نے اسے دیکھا اور بدستور روتی ہوئی بولی۔ ''کیا بتاؤں؟ بتانے کے لیے بچا ہی کیا ہے؟ یہ عمر شاید مجھے جینے بھی نہیں دے گا۔''

''کیوں پھپھو کیا کیا عمر نے؟'' ثناء نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

''جب سے صباء فوت ہوئی ہے تب سے وہ اپنے آپ کو بھول گیا ہے۔ ماں کو بھول گیا ہے۔ باپ کو بھول گیا ہے۔ وہ ہنسنا مسکرانا سب کچھ بھول کر دن رات کام میں مصروف رہتا ہے اور اب۔'' پروین اور زور زور سے رونے لگی۔

''اب کیا ہوا؟'' ثناء نے جلدی سے انہیں جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''اب اس نے اپنی پوسٹنگ سیاچین میں کرانے کی درخواست دے رکھی تھی۔ کرنل بتا رہے تھے وہ منظور ہو گئی ہے اس کے ٹرانسفر آرڈرز آ گئے ہیں اب چند روز تک وہ یہاں سے چلا جائے گا۔ مجھے معلوم ہے ثنی اب وہ جینا نہیں چاہتا۔ کرنل نے اسے بہت سمجھایا بیٹا ابھی مت جاؤ مگر وہ کہتا ہے پاپا میں اگر کوئی برا کام کرتا تو آپ مجھے منع کرتے ہوئے اچھے بھی لگتے۔ اب تو آپ کو خوش ہونا چاہیے۔''

''وہ ٹھیک کہتے ہیں پھپھو جان! اس میں رونے کی کوئی بات نہیں۔ آپ ایک فوجی کی

بیوی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے۔ فوجی کبھی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی اس شہر میں اور کبھی اس شہر میں۔ آپ تو بہت مضبوط دل کی مالک ہیں۔ پھپھو وہ اگر آپ کے لیے اور میرے لیے نہیں جینا چاہتا تو کیا ہوا؟ وہ اپنے اس وطن کے لیے تو جینا چاہتا ہے یہ بہت بڑی بات ہے۔ وہ اس وطن کے چپے چپے کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہونا چاہتا ہے۔ میں جانتی ہوں اس کے علاوہ اب اسے زندگی سے اور کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ بھی اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔"

"نہیں نہیں ثنی! میں یہ سب نہیں کر سکتی۔ اگرچہ میں تمہارے پھپا کے ساتھ ہر جنگل اور ویران جگہ پر بسیرا کرتی رہی ہوں۔ انہیں میں نے کبھی کسی کام سے منع نہیں کیا تھا مگر عمر...... میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ کیا اس کے سہرے کے پھول دیکھنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ کیا میں بھی صباء کی طرح اس کی شادی کی خواہش دل میں لیے قبر میں......"

"خدا کے لیے پھپھو جان ایسا مت کہیے۔" ثناء ان سے لپٹ کر رونے لگی۔

"پھر تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

"پھپھو جان! یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں اپنے منحوس وجود کو لے کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"ایسی بات نہیں کرتے ثنی! میرا یہ مقصد کب تھا۔" پروین رونا بھول گئی۔ اور ثناء سوچنے لگی بے شک یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا ہے مگر میں کیا کروں؟ عمر کو سمجھاؤں تو کیسے؟" یہی سوچتی ہوء وہ لان میں نکل آئی۔ سارا دن وہ گھر میں بے کل بے کل سی پھرتی رہی۔

شام ہو گئی مگر عمر گھر نہ آیا۔ شاید وہ اپنے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ رات کے کھانے پر بھی وہ نہ آیا اور ثناء نے سوچ لیا۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے وہ آج رات جاگ کر عمر کا انتظار کرے گی۔ یہی سوچ کر وہ پھپا کے کمرے سے ایک موٹی سی کتاب اٹھا لائی تھی۔ تاکہ اس کو پڑھ کر وقت گزارا جا سکے اور اپنی اس کوشش میں وہ کامیاب رہی تھی۔

رات ایک بجے کے قریب عمر کی جیپ رکنے کی آواز آئی۔ پھر راہداری کا دروازہ کھلا اور اس کے بھاری قدموں کی آہٹ ثناء اپنے قریب محسوس کرنے لگی۔ پھر اس نے کتاب بند کی کیونکہ وہ مزید وقت ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جیسے ہی عمر اپنے کمرے میں داخل ہوا۔

ثناء بھی اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔ عمر کے دروازے کے قریب وہ صرف ایک لمحے کے لیے رکی پھر دستک دیتی ہوئی اندر چلی آئی۔

عمر نے آہٹ محسوس کرتے ہی پلٹ کر دیکھا اور غرا کر پوچھا۔ "اب کیا لینے آئی ہو کیا چاہتی ہو تم؟"

"عمر! میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں۔ تلافی یا کفارے کی کوئی صورت تو باقی ہو گی۔ میں ہر صورت میں کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔" ثناء اس کے سامنے سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

"کفارے اور تلافی کی کیا صورت ہو گی؟ کس طرح کا کفارہ تم ادا کرو گی۔ بولو کفارے میں کیا دو گی؟" وہ تلخ ہو گیا۔

"کیا آنٹی کی کھوئی ہوئی زندگی واپس لا سکتی ہو؟ میرا مطلب ہے، کیا آنٹی کو پھر سے زندہ کر سکتی ہو اور کیا تم ان کے گزرے ہوئے سالوں کی اذیت کم کر سکتی ہو؟ کیا انکل آفاق کی ضائع ہو جانے والی زندگی کو واپس لا سکتی ہو۔ یہ سب تم کر سکتی ہو؟ نہیں مس رضوان! تم کچھ نہیں کر سکتیں۔ تم کس چیز کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہو؟ پلیز میرے کمرے سے چلی جاؤ۔"

"عمر مجھے جان سے مار دیجیے مگر خود سے جدا مت کیجیے۔" ثناء نے روہانسی ہو کر کہا۔

"میں جانتا ہوں۔" عمر دانت پیستے ہوئے بولا۔ "تم یہی چاہتی ہو تمہیں مار کر میں پھانسی پر چڑھ جاؤں۔ آنٹی کے بعد تم میری موت چاہتی ہو۔ مگر یاد رکھو میں یہ زندگی وطن عزیز کے دفاع جیسے اعلیٰ مقصد کی نذر نہ کر چکا ہوتا تو یہ کام بھی کر ڈالتا۔"

"نہیں نہیں عمر! میں آپ کی موت نہیں چاہتی۔ میں تو آپ کا ساتھ چاہتی ہوں۔ پلیز معاف کر دیجیے۔" ثناء رونے لگی۔

"ہرگز نہیں مس رضوان! یہ کسی افسانے یا ناول کا اختتامی حصہ نہیں کہ میں تمہیں معاف کر دوں۔ تم قاتلہ ہو میری آنٹی کی۔ مجھے تمہاری صورت، تمہارے وجود اور تمہارے نام سے شدید نفرت ہے۔ سنا تم نے؟ نفرت ہے مجھے تم سے۔ خدا کے لیے تم یہاں سے چلی جاؤ ورنہ میں یہ گھر چھوڑ دوں گا بس تم چلی جاؤ۔"

"عمر! آپ کو مجھ سے اتنی شدید نفرت ہے؟" ثناء نے روتے روتے پوچھا۔

"کیا تم اس قابل نہیں۔" عمر کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔

"ہاں عمر! میں اس قابل ہوں کہ لوگ مجھ سے شدید نفرت کریں۔ میں بہت بری ہوں

بہت بدتمیز ہوں مگر آپ، آپ نے تو مجھ سے محبت کی تھی۔ اس محبت کے واسطے مجھے معاف کر دیجیے پلیز معاف کر دیں۔'' ثناء ہر حال میں صلح چاہتی تھی مگر صلح کا وقت گزر چکا تھا۔

''محبت اور تم سے۔'' عمر حقارت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم اس قابل کب تھیں کہ عمر فاروق تم سے محبت کرتا یا تمہاری تمنا کرتا۔ وہ تو آنٹی کی خواہش تھی۔ یہ آرزو انہی کی تھی جو مجھے تمہارے قریب لے گئی تھی۔ ورنہ کہاں تم کہاں میں؟ مگر آنٹی۔'' وہ پھر سسک پڑا۔

''ٹھیک ہے عمر! آپ نے مجھ سے محبت نہیں کی۔ مگر میں تو اب آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آپ اس محبت کو قبول کر لیں۔ آپ مجھے دھتکاریں نہیں، گلے لگا لیں پلیز۔'' وہ سسکی۔

''میں تو اس قابل ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرو، میری تمنا کرو۔ مگر تمہارا وجود میری برداشت سے باہر ہے۔ تم تو آنٹی کی تمنا تھیں جب آنٹی نہیں رہیں تو تمہاری کیا وقعت، کیا حیثیت؟ اگر تم یہی ارادہ لے کر اس گھر میں آئی ہو تو خدا کے لیے اس گھر کو چھوڑ کر چلی جاؤ، جتنی جلدی ہو سکے چلی جاؤ۔''

''کیا ابھی اور اسی وقت؟'' ثناء نے یہ سوچ کر پوچھا کہ شاید وہ ظالم کہہ دے صبح چلی جانا مگر وہ اس کی بات سن کر کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔

''ڈھائی بجے ایک فلائٹ لاہور جاتی ہے تم چاہو تو اس میں جا سکتی ہو۔'' اس کا لہجہ خشک تھا۔

''میں نے کب یہاں سے جانا چاہا تھا اور میرا چاہا کب پورا ہو رہا ہے۔ یہ سب کچھ تو آپ چاہ رہے ہیں۔ چلیے اگر آپ کے پاس وقت ہو تو مجھے ایئر پورٹ چھوڑ آئیے۔'' ثناء نے دکھی دل سے کہا۔

''چلو پھر جلدی کرو۔'' عمر ایک دم رضامند ہو گیا۔

ثناء اپنے کمرے میں آئی اور اپنا مختصر سامان بیگ میں ڈالا اور جب بیگ اٹھائے باہر نکلی تو عمر راہداری کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ 'تمہیں دیکھنے والے یہ کب کہہ سکتے ہیں کہ تم اس قدر سنگدل ہو' ثناء نے دل میں سوچا اور بے آواز چلتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی۔

پھر وہ دونوں چوروں کی طرح راہداری کا دروازہ بند کرتے ہوئے باہر آئے اور کچھ دیر بعد ہی وہ عمر کے ساتھ جیپ میں بیٹھی تھی۔ ان کے درمیان بالکل معمولی فاصلہ تھا مگر ذہنی طور پر وہ صدیوں کے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ ثناء مسلسل عمر کو دیکھ رہی تھی اور جیپ تیزی

سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

عمر بار بار گھڑی دیکھتے ہوئے اسپیڈ بڑھا رہا تھا۔ یقیناً وہ اس کے جانے سے خوش تھا۔ کچھ دیر بعد ہی جیپ ایئر پورٹ کی عمارت کے سامنے رک گئی۔ عمر جلدی سے نیچے اترا۔ ثناء نے بھی اس کی تقلید کی پھر جیپ لاک کر کے وہ جلدی سے ٹکٹ لینے چلا گیا اور ثناء ویٹنگ روم میں کھڑی ہو گئی۔

کچھ دیر بعد عمر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ثناء کے لیے ٹکٹ تھا۔ یہ ٹکٹ اس نے پتہ نہیں کس طرح حاصل کیا ہوگا ثناء کے قریب پہنچ کر اس نے بغیر کچھ کہے ٹکٹ اسے تھما دیا اور خود دوسری جانب دیکھنے لگا۔

ثناء نے کچھ سوچ کر پرس کھولا اور ایک ہزار روپے کے چند نوٹ نکال کر عمر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''لیجیے۔''

''کیا؟'' عمر نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ہاتھ پر اس کی نظر نہیں گئی تھی ثناء نے ہاتھ اٹھا کر نوٹ اس کے سامنے کر دیئے مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔

''یہ کیا ہے؟'' عمر نے ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹکٹ کے پیسے۔'' ثناء کا لہجہ سپاٹ تھا۔

عمر نے ایک نظر اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹوں پر ڈالی اور پھر دوسری طرف رخ موڑتے ہوئے بولا۔ ''اس کی ضرورت نہیں۔''

''کیوں ضرورت نہیں؟'' ثناء کو غصہ آ گیا۔ ''جب میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں تو آپ کو کیا ضرورت ہے مجھ پر پیسے ضائع کرنے کی۔'' عمر نے حیرت سے اسے دیکھا اور منہ بگاڑ کر آہستہ سے کہا۔

''میں نے یہ پیسے ضائع تو نہیں کیے۔''

''پھر؟'' ثناء اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ شاید اس نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ شاید وہ مجھے اپنے ساتھ واپس، مگر اس کی خوش فہمی ادھوری رہ گئی۔ عمر کہہ رہا تھا۔

''پھر یہ کہ تمہارے جانے اور بلا سر سے ٹل جانے کی خوشی میں میں نے بطور صدقہ یہ ٹکٹ خرید لیا ورنہ میرے پاس سہیل کی طرح حرام کی کمائی نہیں جو میں تم جیسوں کے

ضائع کرتا رہوں۔'' وہ چپ ہو کر پھر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

ثناء کا دل ایک دم بجھ گیا۔ اس کا جی چاہا پاگلوں کی طرح بال نوچتی ہوئی یہاں سے بھاگتی ہوئی نکل جائے مگر اس کے ساتھ ایک میجر تھا۔ اپنی نہیں مگر میجر کی عزت کا خیال تو اسے کرنا ہی تھا۔

ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ دو بج کر پینتیس منٹ ہو رہے تھے اس نے سوچا اب تک تو مجھے رن وے پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اگر جہاز ڈھائی بجے جا رہا ہے تو اب شاید وہ اندر نہ جا سکے۔ جبکہ اب وہ خود اس جگہ سے دور جانا چاہتی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر عمر کو دیکھا مگر وہ دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے بدستور شیشے کے باہر دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا وہ وہاں اس کی موجودگی سے بے خبر ہے۔

ثناء نے ڈرتے ڈرتے عمر سے پوچھا۔

''عمر! یہ ٹکٹ کس فلائٹ کا ہے؟''

''اسی فلائٹ کا جو ڈھائی بجے جاتی ہے۔'' اس نے بغیر دیکھے جواب دیا۔

''مگر ڈھائی تو بج چکے ہیں۔'' ثناء نے گھڑی اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''جانتا ہوں۔'' اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اس کے جانے کی وجہ سے بہت خوش تھا۔ ''یہ فلائٹ لیٹ جا رہی ہے۔'' اس نے گویا ثناء پر ایک احسان عظیم کرتے ہوئے کہا۔ کچھ دیر بعد ہی اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔ ثناء نے عمر کو دیکھا اور عمر نے ہاتھ سے داخلی دروازے کی طرف اشارہ کر دیا جیسے اسے بلانا سخت ناگوار گزر رہا ہو۔ اس کی یہ مہربانی بھی کیا کم تھی کہ وہ ٹکٹ لینے کے بعد محض اس کی وجہ سے ایئر پورٹ پر موجود تھا۔

ثناء نے قدموں میں پڑا ہوا بیگ اٹھایا اور پھر اسے خدا حافظ کہتی ہوئی داخلی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ دروازے کے قریب رک کر اس نے پلٹ کر دیکھا دل سے خیال آیا شاید وہ اسے روک لے شاید وہ اسے آواز دے کر بلا لے مگر یہ کیا وہ تو بڑی تیزی سے اپنی جیپ کی طرف جا رہا تھا۔ ثناء کے دل میں درد کی ایک لہر اٹھی اور تڑپتے ہوئے دل کو سنبھالتی رہ گئی۔



ٹیکسی کا بل ادا کر کے ثناء نے کال بیل کا بٹن پش کیا اور دروازہ کھلنے کا انتظار کرنے

لگی۔ کچھ دیر بعد گیٹ کی کھڑکی کھلی۔ کھڑکی کھولنے والی خود فوزیہ تھی۔ ثناء کو دیکھا تو حیران رہ گئی اگرچہ دل میں خوش بھی ہوئی مگر اس وقت آنا برا بھی لگا پوچھا۔

''سنی یہ آنے کا وقت ہے؟''

''کیوں ممی وقت کو کیا ہوا؟ دراصل عمر لاہور آ رہے تھے میں نے سوچا میں بھی چلی جاؤں کیا برا کیا میں نے؟''

''نہیں نہیں یہ تو بہت اچھا کیا تم نے؟'' فوزیہ نے نرمی سے کہا۔ ویسے غصے سے وہ سرخ ہو گئی تھی۔ مگر جانتی تھی سختی سے کام لیا تو بات بگڑ جائے گی۔ اس لیے نرمی سے بولی۔

''بیٹی! تم نہیں جانتیں میں تمہارے بعد کتنی اداس رہی۔'' ثناء نے کوئی جواب نہ دیا خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی۔

''گستاخ لڑکی!'' فوزیہ دانت پیستی ہوئی بڑبڑائی۔ مگر چونکہ ٹھیک تین روز بعد ثناء کی شادی تھی اس لیے فوزیہ نے سوچا اگر اس نے کچھ سختی کی تو ثناء بگڑ جائے گی۔ بہتر یہی ہے یہ تین دن کڑوے گھونٹ کی طرح پی لیے جائیں۔ اس کے بعد ثناء کیا کہتی ہے یا کیا کرتی ہے مجھے اس کی پرواہ نہ ہوگی۔ بلکہ وہ کچھ کر ہی نہیں سکے گی۔ وہ غصے میں بھری اپنے کمرے میں چلی آئی۔

صبح ثناء یونیورسٹی جانے کے لیے تیار ہو کر باہر آئی تو رضوان کھڑے تھے ثناء کو دیکھا تو پوچھا۔ ''بیٹی اتنی رات گئے آنے کا مطلب؟ خیریت تو تھی؟''

''ایسی کوئی خاص بات نہیں پاپا چونکہ عمر لاہور آ رہے تھے۔ اس لیے میں نے سوچا میں بھی چلی جاؤں اور پھر رات کیسی، چار بجے آئی ہوں اور پانچ سوا پانچ بجے دن نکل آتا ہے۔''

''اچھا کیا تم نے جو آ گئیں تمہیں معلوم نہیں تمہارے بعد تمہاری ممی نے......''

''رضوان! ذرا میری بات سنیے۔'' فوزیہ ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف لے گئی پھر آنکھیں نکال کر انہیں دیکھتی ہوئی بولی۔

''یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟''

''کیا مطلب؟'' رضوان نے الجھ کر اسے دیکھا۔

''میں پوچھتی ہوں۔ ابھی اسے یہ سب بتانے کی کیا ضرورت ہے؟'' فوزیہ نے غصے سے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" رضوان بگڑ کر بولے۔ "تین روز بعد اس کی شادی ہے اور تم کہتی ہو اسے ابھی کچھ نہ بتایا جائے۔ کیا تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟"

"مجھے معلوم ہے اسے پتہ چل جائے گا مگر آپ کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ وہ یونیورسٹی جا رہی ہے وہاں سے خود ہی پتہ چل جائے گا۔ سہیل وہاں ہو گا۔"

"اور اگر اس نے وہاں کوئی ہنگامہ کر دیا تو؟" رضوان نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے آپ دل سے یہی چاہتے ہیں۔ جب اسے پتہ چلے گا کہ شادی ہو رہی ہے تو وہ چپ رہے گی۔" پھر وہ واپس مڑی اور اپنے لہجے میں پیار سمیٹ کر بولی۔ "آؤ ثنی! ناشتہ کر لو ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

ثناء نے مشکوک انداز میں پہلے ماں اور پھر باپ کو دیکھا۔ 'پتہ نہیں پاپا کیا بات بتانے والے تھے۔ جو ممی نے انہیں روک دیا۔ ان پانچ دنوں میں میرے بعد بھلا کیا اہم بات ہو سکتی ہے؟' اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے سوچا اور بے رخی سے کہا۔

"ممی مجھے خواہش نہیں۔" اور باہر نکل گئی۔

"آپ نے دیکھے ہیں اس کے تیور۔" ثناء کے جاتے ہی فوزیہ غصے سے بولی۔ "اسی لیے میں نے اس کی شادی طے کر دی ہے۔ مجھے معلوم تھا یہ دن بدن اور بدتمیز ہوتی جائے گی اور یاد رکھیے راستے میں وہ لاکھ آپ سے پوچھے کیا بات ہے مگر آپ اسے کچھ نہیں بتائیں گے۔" فوزیہ نے کہا۔

رضوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ بریف کیس اٹھا کر خود بھی باہر نکل گئے۔

ثناء باہر گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ رضوان نے گاڑی کھولی۔ ثناء جلدی سے گاڑی میں بیٹھی اور پوچھا۔

"پاپا کیا بات تھی جو آپ مجھے بتانا چاہتے تھے مگر ممی نے آپ کو منع کر دیا۔"

"کیا بات ہو سکتی ہے؟" رضوان نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پلٹ کر گیٹ میں کھڑی فوزیہ کو دیکھا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

ثناء نے بغور باپ کا چہرہ دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ "پاپا آپ بہت پریشان لگ رہے ہیں؟"

"ہاں بیٹا۔" رضوان نے موڑ کاٹتے ہوئے اعتراف کیا۔

"مگر کیوں پاپا؟" ثناء نے تڑپ کر پوچھا۔ ماں کی سخت طبیعت کا تو اسے اب احساس ہوا تھا۔ اس کے پاپا نے نہ جانے کیسے ممی سے نباہ کیا ہے۔ اب وہ سوچتی اور پاپا پر ترس آنے لگتا تھا۔

"بس بیٹا پریشان ہوں۔ کوئی ایک وجہ ہو تو بتاؤں بھی۔ بہرحال صباء کی وجہ سے پریشان تھا اور اب پانچ روز ہوئے ہیں تمہارے لیے پریشان ہوں۔"

"مگر اصل بات کیا ہے پاپا آپ بتاتے کیوں نہیں؟" ثناء نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹا یونیورسٹی جا تو رہی ہو خود ہی پتہ چل جائے گا۔" انہوں نے گاڑی یونیورسٹی کے باہر روکتے ہوئے کہا۔

"ایسی کیا بات ہے پاپا! جو ہمارے گھر سے نکل کر، یونیورسٹی پہنچ گئی ہے؟" ثناء نے پوچھا رضوان نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموشی سے دروازہ کھول دیا اور ثناء شکوے بھرے انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے نیچے اتر گئی اور رضوان چلے گئے۔

ثناء یونیورسٹی کے اندر آئی تو سہیل گیٹ کے قریب کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"ہیلو ثنی!" وہ اسے دیکھتے ہی خوشی سے چہکا۔

"ہیلو۔" ثناء نے بے دلی سے کہا پھر پوچھا۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں آ گئی ہوں؟"

"بس چل گیا۔" وہ خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔

"ضرور ممی نے فون کیا ہو گا؟" ثناء نے ناگواری سے کہا۔

"جی جناب! پھپھو نے فون کیا تھا کہ تمہاری وہ آ گئی۔" سہیل کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ تھی۔

"اچھا۔" ثناء نے بے زاری سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"کچھ کمزور لگ رہی ہو، تمہاری طبیعت تو ٹھیک رہی؟" سہیل نے ایڑی سے لے کر سر تک اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک رہی۔" ثناء نے اکتا کر کہا اور سہیل حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"اخاہ ثناء رضوان صاحبہ تشریف لے آئیں۔" گیٹ کے قریب ہی موٹر سائیکل روکتے ہوئے سہیل کے دوست خلیل نے ہانک لگائی پھر قریب آتے ہوئے بولا۔ "بھئی مبارک ہو۔"

"کیا مطلب؟" ثناء نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ اسی وقت ثناء کی دو تین سہیلیاں بھی آ گئیں اور وہ بھی لگیں مبارکباد دینے۔

"کس بات کی مبارکباد دے رہے ہو تم لوگ؟" ثناء نے حیرانی سے پوچھا۔

"ارے واہ جو! اب اتنی بھولی مت بنو۔ جیسے تمہیں پتہ نہیں کہ مبارک باد کس بات کی دے رہے ہیں ہم۔" اس کی دوست عالیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یقین کرو عالیہ میں کچھ نہیں جانتی۔" ثناء نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

"واقعی۔" عالیہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا پھر ہنس کر کہا۔ "لگتا ہے اسلام آباد سے سیدھی یونیورسٹی آ رہی ہو۔"

"یہی سمجھ لو۔" ثناء نے غصے سے کہا۔

"ارے بابا ناراض کیوں ہوتی ہو؟" خلیل ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "جمعہ کو تمہاری شادی ہے کیا تمہیں نہیں پتہ؟"

"شادی...... یعنی کہ بیاہ...... یعنی کہ میرج...... یعنی کہ......" عالیہ بالوں میں ہاتھ الجھاتی ہوئی ہنسنے لگی پھر یکدم چیخی۔ "ہمیں بے وقوف بنا رہی ہو۔ جمعہ کو تمہاری شادی ہے مسٹر سہیل کے ساتھ۔ ہمیں تو سہیل کی جانب سے انویٹیشن کارڈ بھی مل چکے ہیں اور تم پوچھتی ہو کس کی شادی؟"

"کیا واقعی؟" ثناء نے چونک کر سہیل کو دیکھا اور وہ شوخی سے ہنس دیا۔ ثناء کا موڈ ایک دم آف ہو گیا۔

"کس کی اجازت سے ہو رہی ہے یہ شادی؟" ثناء نے بگڑ کر پوچھا۔

"یار اداکاری مت کرو۔ ہمیں معلوم ہے تمہاری اجازت سے ہو رہی ہے یہ شادی۔ تم نے جان بوجھ کر ہمیں نہیں بتایا تاکہ شادی سے پہلے ہی ہم تم سے ٹریٹ نہ مانگ لیں۔" عالیہ نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

ثناء نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ سہیل کے قریب ہوتے ہوئے بولی۔

"میں نے تم سے پوچھا ہے کس کی اجازت سے تم لوگوں نے شادی کی تاریخ طے کی ہے؟" اس کا لہجہ خونخوار تھا۔

"کیا مطلب بھئی؟" سہیل بوکھلا گیا۔ "تم میری منگیتر ہو اور......"

"اوہ یو شٹ اپ! آگے ایک لفظ بھی کہا تو منگنی کی انگوٹھی اتار کر پھینک دوں گی۔" وہ نفرت سے سہیل کو گھورتی ہوئی بولی۔

"وہاٹ؟" سہیل نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے اسے دیکھا اور پھر سامنے کھڑے ہوئے دوستوں کو جن کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ تھی۔ اپنی توہین کے خیال سے سہیل کھول اٹھا۔

"ثنی۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر جھٹکتے ہوئے بولا۔ "تم ہوش میں تو ہو یہ کیا بکواس کی ہے تم نے؟"

"بکواس تو تم کر رہے ہو۔ میں تو ہوش میں ہوں۔ میں ثناء رضوان ہوں اور تم سہیل ہو۔ وہ سہیل جس سے میری منگنی ہوئی تھی 'تھی' کا مطلب جانتے ہو گزرے زمانے کی بات ہے۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"ثناء! تم حد سے بڑھ رہی ہو بدتمیز لڑکی! میں نے بہت برداشت کیا ہے مگر اب اور برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنے اطوار درست کر لو، ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گا۔" وہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"تم کیا اور تمہاری حیثیت کیا۔ برداشت تو تمہیں میں نے کیا ہے اتنا عرصہ اور اب اگر تم نے کوئی فضول بکواس کی تو میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔" وہ چیخ کر بولی۔ ان دونوں کی لڑائی سن کر بہت سے طلباء اکٹھے ہو گئے تھے۔ مگر ثناء کو اب کسی چیز کی پرواہ نہ تھی۔ باپ کی پریشانی کا خیال اسے اب آیا تھا۔ اور ماں پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ جس نے ساری زندگی اپنی من مانی کی تھی جس کے نتیجے میں دو قیمتی جانیں ضائع ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگوں کا سکون چھن گیا تھا۔ اس نے سوچ لیا وہ ماں کو اپنے ساتھ من مانی کرنے کی ہرگز اجازت نہ دے گی۔ اس نے نفرت سے سہیل کو دیکھا اور سہیل جو پہلے ہی اپنی توہین کے خیال سے دانت پیس رہا تھا، جب ثناء زیادہ بڑبڑ کرنے لگی تو وہ دھاڑا۔

"ثناء بکواس بند کرو، ورنہ مار مار کر حلیہ بگاڑ دوں گا۔"

اس کی بات سن کر ثناء غصے سے پاگل ہو گئی۔ "تم خود کو سمجھتے کیا ہو مجھے ہاتھ لگا کر تو دیکھو۔ ہاتھ کاٹ کر پھینک دوں گی گدھے!"

"گدھی ہو گی تو خود۔" سہیل نے غراتے ہوئے ایک زوردار چانٹا اس کے منہ پر

رسید کیا۔

ثناء بھوکی شیرنی کی طرح اس پر ٹوٹ پڑی۔ ''کمینے، ذلیل، کتے! تیری یہ جرأت کہ مجھ پر ہاتھ اٹھائے۔ الو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہوگئی اور وہ دوست جو ابھی محض تماشائی کی حیثیت سے کھڑے ففٹی ففٹی سمجھ کر دیکھتے رہے تھے، تو بوکھلائے انہیں چھڑانے دوڑ پڑے۔ بڑی مشکل سے ثناء کو قابو کیا۔ مگر تب تک وہ اپنے لمبے ناخنوں سے سہیل کے گلے اور بازوؤں پر خراشیں ڈال چکی تھی، چہرے کو سہیل نے نہ جانے کس طرح بچایا تھا۔ اب وہ دونوں غصے سے ہانپ رہے تھے۔ سہیل کو اس کے دوستوں نے پکڑ رکھا تھا اور ثناء کو اس کی سہیلیوں نے۔

''شادی ہو لینے دو ثناء! میں تمہارا ایک ایک کس بل نکال دوں گا۔ میں تمہیں الف کی طرح سیدھا کر دوں گا۔'' سہیل نفرت سے اسے گھورتے ہوئے غرایا۔

''شادی کرتی ہے تم سے میری جوتی۔'' ثناء کسی اَن پڑھ عورت کی طرح چیخ کر بولی۔ ''میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر اور تمہارے خاندان پر، شادی اونہہ۔'' وہ غصے سے خود کو چھڑا کر دندناتی ہوئی بجائے کلاس روم کے آفس کی جانب بڑھ گئی۔

''یہ اسے کیا ہو گیا ہے؟'' خلیل نے حیرت سے کہا۔

''دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ذرا شادی ہو لینے دو، درست کر کے رکھ دوں گا۔ اگر تیر کی طرح سیدھا نہ کیا تو میرا نام سہیل نہیں۔'' وہ غصے سے ہانپتے ہوئے بولا۔ ''یہ پچھتائے گی، معافیاں مانگے گی مگر میں اسے معاف نہیں کروں گا۔'' سہیل نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ اتنے میں ثناء واپس آتی ہوئی دکھائی دی۔ سہیل کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ''اونہہ'' کہا اور تنتناتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ سہیل مارے غصے اور توہین کے تپ اٹھا۔ برسوں کی محبت ایک پل میں نفرت میں بدل گئی۔

''میں قسم کھاتا ہوں ثناء رضوان کہ میں تم سے شادی کر کے تمہیں سسکا سسکا کے کتے سے بھی بری موت ماروں گا اور جب تم مرنے کے قریب پہنچ جاؤ گی تو میں تمہیں تمہاری زندگی کے سب سے بڑے صدمے سے دو چار کروں گا۔ میں تمہیں بستر مرگ پر طلاق دوں گا تاکہ دنیا سے جاتے ہوئے بھی ایک تڑپ، ایک داغ لے کر جاؤ۔ تم نے اب تک صرف میرا پیار دیکھا تھا اب میری نفرت اور میرا انتقام دیکھنا۔''

''پاگل مت بنو سہیل۔'' خلیل نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''دوست! وہ تو شاید اپنے حواس میں نہیں تھی۔ مگر تم تو ہوش میں ہو عقل سے کام لو۔''

''نہیں خلیل! میں قسم کھا چکا ہوں۔'' سہیل نے کہا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔ اچانک نغمانہ چیختی ہوئی اس کے پیچھے آئی۔ ''سہیل تمہیں معلوم ہے وہ آفس کیوں گئی تھی؟''

''نغمانہ پلیز کوئی فضول بکواس مت کرنا۔'' عالیہ نے بھاگتے ہوئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ثناء کی گہری دوست تھی اور ثناء کی پریشانی سے خود بھی پریشان تھی۔

''بتاؤ نغمانہ! ثناء آفس کیا لینے گئی تھی؟'' سہیل نے پوچھا مگر نغمانہ چپ رہی۔

''ٹھیک ہے۔'' سہیل غرایا ''میں خود آفس سے معلوم کیے لیتا ہوں۔'' اس نے کہا اور سیدھا آفس کی جانب بڑھ گیا۔



ناشتے کی میز پر کرنل اور پروین کے علاوہ عمر بھی موجود تھا مگر ثناء ابھی تک نہ آئی تھی جبکہ ہمیشہ وہ سب سے پہلے ناشتے کی میز پر بیٹھی اخبار کے مطالعے میں محو ہوتی تھی۔ پروین کچھ دیر اس کا انتظار کرتی رہی۔ پھر ناشتہ کرتے ہوئے عمر کو دیکھ کر بولی۔

''پتہ نہیں کیا بات ہے سنی ابھی تک نہیں آئی۔ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں۔ جاؤ عمر ذرا دیکھ کر آنا۔''

''ممی! وہ تو اپنے گھر چلی گئی۔'' عمر نے سکون سے ناشتہ کرتے ہوئے انہیں اطلاع دی۔

''اپنے گھر چلی گئی مگر کب؟'' پروین نے حیرت سے پوچھا اور کرنل بھی عمر کو دیکھنے لگے۔

''ممی! وہ رات ڈھائی بجے کی فلائٹ سے گئی ہے۔'' عمر نے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے اسی لہجے میں کہا۔

''مگر اس کو اتنی رات جانے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کیوں گئی؟'' پروین ابھی تک حیران تھی۔ اچانک ایک خیال بجلی کی مانند ان کے ذہن میں کوندا اور پروین نے پوچھا۔

''عمر تم نے کچھ کہا ہوگا اسے ورنہ اتنی رات گئے وہ بچی کیوں جاتی؟''

''جی ممی! میں نے بہت کچھ کہا تھا اور خود اس کو ایئر پورٹ چھوڑ کر آیا تھا۔'' عمر نے معصومیت سے بتایا۔

''مگر کیوں؟'' پروین سارا ڈسپلن بھول کر غصے سے چیخیں۔ ''تمہیں یہ حق کس نے دیا

عمر کہ تم گھر آئے ہوئے مہمانوں کو دھکے دے کر نکالو اور بے عزت کرو۔ تمہیں میرا بھی خیال نہ آیا۔ عمر تم بہت بدتمیز اور گستاخ ہو گئے ہو۔ جواب دو مجھے کیوں کیا؟''

''سب کچھ جانتے ہوئے بھی ممی آپ مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔'' عمر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''ممی وہ آنٹی کی قاتلہ تھی۔ اس کے باوجود آپ کو اس سے ہمدردی ہے جبکہ آپ جانتی ہیں۔''

''خاموش رہو عمر! میں تمہاری بکواس سننا نہیں چاہتی۔ بہت بگڑ چکے ہو تم۔ صباء مر چکی ہے۔ تمہاری ان حرکتوں سے وہ اب زندہ نہیں ہوسکتی آخر تم اس کے لیے اتنا کیوں تڑپ رہے ہو۔ اس ایک ہستی کے لیے تم نے ہم سب کا سکون برباد کر دیا ہے۔ اب کیا ہماری جان لینے کا ارادہ ہے۔ تمہاری ماں تو میں ہوں۔ عمر! تم نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے مگر پھر بھی تمہیں مجھ سے اتنی محبت نہیں مگر......'' انہوں نے گھورتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''مگر اس کے باوجود لوگ مجھے آپ ہی کا بیٹا کہتے ہیں۔ آنٹی کا نہیں۔ صرف محبت ہی تو کرتا تھا میں ان سے۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیخا۔ ''کیونکہ میں ان کی اذیت ناک زندگی کو جانتا تھا۔ سمجھتا تھا مگر میری یہ محبت بھی کسی سے برداشت نہ ہوئی اور آنٹی مر گئیں؟''

''وہ تو ٹھیک ہے عمر! مگر مرنے والوں کے ساتھ......'' پروین نے کہنا چاہا۔

''اگر مگر کچھ نہیں ممی! اب آپ اس کا ذکر میرے سامنے نہیں کریں گی اور نہ اس کا نام لیں گی۔'' عمر نے نفرت سے کہا۔

''بکواس مت کرو عمر؟'' وہ غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں بولیں۔ ''میں تمہاری ماں ہوں۔ یہ گھر میرا ہے۔ یہاں میرا حکم چلے گا۔ تمہیں اپنی غلطی کی سزا بھگتنی ہوگی۔ ہاں عمر تمہیں لاہور جا کر ثناء کو واپس لانا ہوگا۔ ہائے اس معصوم بچی کو آدھی رات میں گھر سے نکال دیا۔ کیا سوچتا ہوگا میرا بھائی میرے بارے میں اور میری بھابی۔''

''ممی! میں اس کو لینے جاؤں یہ تو قیامت تک ناممکن ہے۔'' عمر فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''باقی وہ لوگ کیا سوچتے ہیں۔ یا سمجھتے ہیں مجھے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں اور آپ بھی اسے بھول جائیں۔''

''آپ دیکھ رہے ہیں اس گستاخ لڑکے کو۔'' پروین کرنل کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''یہ ثناء کو زبردستی ایئر پورٹ چھوڑ کر آیا تھا۔ آپ اس کو کہہ دیں یہ فوراً جا کر ثناء کو واپس لے

آئے ورنہ۔''

''ورنہ...... ورنہ کیا ہوگا ممی؟'' عمر کرسی کو ٹھوکر مارتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''آپ مجھے گھر چھوڑنے کا حکم دیں گی۔ میں آپ کے حکم سے پہلے ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔''

''نہیں عمر! میں تمہیں گھر چھوڑنے کا نہیں کہوں گی یہ دنیاوی چیز ہے۔ میں تمہیں اپنا دودھ نہیں بخشوں گی۔ اس وقت تک جب تک تو ثناء کو واپس نہیں لائے گا۔''

''نہیں ممی! آپ ایسا ہرگز نہیں کریں گی۔'' عمر تڑپ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''جاؤ عمر! میری نظروں سے دور ہو جاؤ میں سوچ لوں گی میری کوئی اولاد نہیں۔ میں بے اولاد ہی تھی اور تم جیسی اولاد سے بے اولاد ہی ہوتی تو اچھا تھا۔'' پروین میز پر سر رکھ کر رونے لگی۔

کرنل جو اب تک لاتعلق سے بڑے صبر وتحمل سے ماں بیٹے کے درمیان ہونے والی اس تلخ بات چیت کو سن رہے تھے اچانک اپنی جگہ سے اٹھے۔ ماں کے قدموں پر جھکے ہوئے عمر کو کاندھوں سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کیا کچھ دیر اس کے چہرے کو گھورتے رہے پھر بولے۔

''مجھے شرم آتی ہے تمہیں کچھ کہتے ہوئے کیونکہ تم نے تو مجھ سے بھی زیادہ قد نکالا ہے۔ مجھ سے زیادہ بڑے لگتے ہو۔ ماں کے ساتھ آج تم نے جو بدتمیزی اور گستاخی کی ہے تم نے، دماغ تو کہتا ہے تمہاری اس جرأت پر تمہیں سخت سزا دوں مگر میرا دل تمہارے دل کے درد کو سمجھتا ہے بیٹا زندگی نام ہی ملنے اور بچھڑنے کا ہے۔ میں جانتا ہوں تمہیں اپنی آنٹی سے بہت محبت تھی۔''

''تھی نہیں پاپا! اب بھی ہے۔'' وہ سسک پڑا۔

''ہاں عمر! میں جانتا ہوں تمہیں اس سے اب بھی محبت ہے۔ شاید اس لیے کہ خاندان بھر میں وہ سب سے زیادہ تمہیں چاہتی تھی۔ وہ سب بچوں پہ تمہیں ترجیح دیتی تھیں۔ مگر بیٹا جو مر جاتے ہیں اچھی زندگی گزار کر یا بری زندگی گزار کر وہ ان کی اپنی قسمت ہوتی ہے۔ ان کے لیے صبر سے کام لینا چاہیے۔ تم نے بہت بدتمیزی کی ہے اپنی ماں کے ساتھ وہ ماں جس نے تکلیف سہہ کر تمہاری پرورش کی۔ اسی کے ساتھ تم نے گستاخی کی۔ وہ بھی میری موجودگی میں، تم نے ماں کا دل دکھایا ہے۔ میں تمہیں کیا کہوں سوائے اس بات کے کہ جاؤ بیٹا ماں کا کہنا مانو اپنی عاقبت مت خراب کرو۔ لاہور جا کر ثناء کو واپس لے آؤ۔ یقین کرو

صباء سے ہمیں بھی اتنی ہی محبت تھی جتنی تم کو ہے۔ مگر بیٹا اب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے جا چکی ہے۔'' انہوں نے گم صم کھڑے عمر پر نظر ڈالی اور بات ختم کر کے واپس اپنی کرسی پر بیٹھ کر ناشتہ کرنے لگے۔

ناشتہ کرتے کرتے انہوں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ عمر ابھی تک وہیں ہونٹ بھینچے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ شاید اس کے اندر بھی ایک کش مکش ایک جنگ جاری تھی اور کرنل بھی اچھی طرح جانتے تھے۔ اس جنگ اور کش مکش کا کیا فیصلہ ہو گا۔



ثناء یونیورسٹی سے گھر پہنچی تو فوزیہ غصے سے بھری اس کے انتظار میں برآمدے میں بیٹھی تھی۔ ثناء نے ان کے موڈ کو ایک ہی لمحے میں پہچان لیا۔ وہ تو خود غصے سے تپ رہی تھی۔ ماں کو نظر انداز کرتی ہوئی اس نے لاپرواہی سے شانے اچکائے اور اپنے کمرے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ فوزیہ نے چیخ کر آواز دی۔

''ثنی! پہلے ادھر آؤ۔''

چلتے چلتے ثناء کے قدم رک گئے۔ وہ مڑی نہیں جہاں کھڑی تھی وہی سے گردن گھما کر ماں کو دیکھا اور بغیر کوئی جواب دیئے آگے بڑھ گئی۔

''تم نے سنا نہیں ثنی! میں کیا کہہ رہی ہوں؟'' فوزیہ پھر چیخی۔

''آہستہ بولیے ممی! میں بہری نہیں سب سن لیا۔ اپنا پرس کمرے میں رکھ کر آتی ہوں۔'' ثناء نے چلتے چلتے کہا اور سیدھی کمرے میں گھس گئی۔

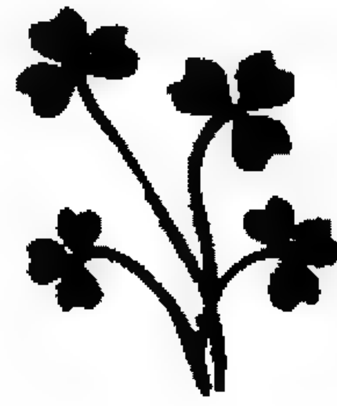
فوزیہ مارے غصے کے دانت پیس کر رہ گئی۔ 'بہت بگڑ گئی ہے۔ بہت بدتمیز ہو گئی ہے، چھوٹے بڑے کے ادب کا تو پتہ ہی نہیں نہ جانے صباء کے مرنے کے بعد اسے کیا ہو گیا ہے۔ صباء کے دسویں تک ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس کے بعد ہی یہ تبدیلی آئی اور بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھ گئی، مجھے اسی وقت محسوس کرنا چاہیے تھا۔ مگر مجھے کیا معلوم کہ وہ ایسی ہو جائے گی۔ اسے تو بہت محبت تھی اپنے ماموں، ممانی، نانی اور خاص کر سہیل سے، یہ اچانک اس کی محبت کو کیا ہوا؟

اسے تو شدید نفرت تھی۔ اپنے ددھیال والوں سے اپنی پھپھیوں سے خاص کر عمر سے، پھر یہ محبت کیسے ہو گئی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ پہلے تو وہ میری ہر بات میں ہاں

ملاتی تھی۔ میں جو کہتی تھی وہ وہی کرتی تھی مگر اب یا اللہ میں کیا کروں؟' اس نے پلٹ کر صباء کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ پرس رکھنے کا کہہ کر اندر گئی تھی۔ اب دس منٹ ہو رہے تھے مگر وہ ابھی تک نہ آئی تھی گویا وہ یہ جتانا چاہتی تھی۔ مجھے اب ماں کی بھی پرواہ نہیں۔ یہ سوچتے ہی وہ تپ گئی اور چیخ کر آواز دی۔

''ثنی! یہ تمہارا پرس ابھی رکھا گیا ہے کہ نہیں؟ باہر آتی ہو کہ نہیں، مجھے بتا دو۔ نہیں تو میں خود تمہارے کمرے میں آ جاتی ہوں۔ اونچی ہواؤں میں اڑ رہی ہو نا تم آج کل۔''

''ممی! آپ کو فضول باتیں کرنے کی عادت ہے۔ آپ ذرا صبر کریں میں کہیں بھاگی نہیں جا رہی۔ لباس بدل کر آپ کے پاس ہی آؤں گی۔'' ثناء نے تلخ لہجے میں کہا اور فوزیہ دانت پیسنے لگی۔



لباس تبدیل کرنے کا کہہ کر اس نے پورا آدھا گھنٹہ لگایا۔ پھر بدتمیزی سے پاؤں پٹختی ہوئی باہر آئی۔ راستے میں پڑی ہوئی تپائی کو ٹھوکر مار کر پیچھے کیا۔ گویا فوزیہ کے لیے اشارہ تھا کہ آج میں بھی بہت غصے میں ہوں۔ فوزیہ اپنا غصہ بھول کر آنکھیں پھاڑ کر اس کی بدلی ہوئی شکل دیکھنے لگیں۔

''جی فرمایئے ممی!'' ثناء ان کے قریب آ کر کھڑی ہوئی۔

''یہ سب کیا دیکھ رہی ہوں میں؟''

''کیا ممی؟'' ثناء نے اپنے چاروں اطراف دیکھتے ہوئے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

''سنی! یہ میں کیا سن رہی ہوں؟'' فوزیہ اس کی بے نیازی پہ جل کے بولی۔

''مجھے کیا معلوم ممی! میں غیب کا علم نہیں جانتی۔'' ثناء نے لاپرواہی سے شانے اچکائے۔

''سنی! تم اچھی طرح جانتی ہو اچھی طرح سمجھتی ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔'' فوزیہ بے بسی سے اسے دیکھتی ہوئی بولی۔ ورنہ جی تو چاہ رہا تھا آج پاؤں سے جوتا اتار لے اور ہمیشہ کے لیے اسے درست کر کے رکھ دے۔ مگر جوان بیٹی کو کچھ کہتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔

''نہیں ممی!'' ثناء معصومیت سے سر ہلاتی ہوئی بولی۔ ''بھلا آپ کے بتائے بغیر میں کیسے جان سکتی ہوں کہ آپ کن باتوں کا کہہ رہی ہیں کیونکہ میں تو سارا دن باتیں کرتی ہوں۔ اب یہ آپ ہی کے علم میں ہوگا کہ آپ کن باتوں سے ناراض ہو رہی ہیں۔''

''اس میں کوئی شک نہیں سنی کہ تم بہت بدتمیز ہوگئی ہو۔''

''واقعی ممی! بس یہی کہنا تھا آپ کو؟'' اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔

''خاموش رہو، آج میں تمہاری بکواس سننے کے موڈ میں نہیں۔ تم نے چہلم پر بھری

محفل میں نانی پر چوٹ کی تھی...... ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیئے تھے مگر میں چپ رہی تھی۔ تم نے اپنے پاپا کے تمام رشتے داروں کو علیحدہ کمرہ دیا تھا۔ مگر میں پھر بھی چپ رہی تھی۔ تم نے پروین کے گھر جانے کو کہا۔ میں نے پھر بھی منع نہیں کیا کہ چلو بچی ہے یہ جو کرنا چاہتی ہے کر لے مگر اس کا نتیجہ کیا نکلا تم حد سے بڑھ گئیں۔ آج تم نے یونیورسٹی میں سب کے سامنے سہیل کی جو توہین کی ہے اس پر میں چپ نہیں رہ سکتی۔ برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ مجھے بتاؤ تم نے کیا سوچ کر اسے بے عزت کیا تھا۔ تم نے کیا سمجھ کر اسے منگنی توڑنے کی دھمکی دی تھی۔ تم نے کس کے خیال میں، کس کی چاہت میں اپنا نام بھی بدل لیا، بولو جواب دو میری ان سب باتوں کا؟ تم نے کیا سوچ کر یہ سب کیا؟ تمہارا کیا خیال ہے میں تمہاری یہ ساری بدتمیزیاں معاف کر دوں گی؟ ہرگز نہیں۔ مجھے جواب چاہیے ان سب باتوں کا؟'' فوزیہ نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

ثناء نے پورے سکون سے ان کی باتیں سنیں اور پھر اسی سکون بھرے لہجے میں بولی۔

''ممی واقعی آپ نے بہت برداشت کیا بہت چپ رہیں۔ یہ تو واقعی بڑی ہمت کی بات ہے مگر ممی آپ کی یہ برداشت اور یہ چپ تو صرف چند دنوں کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے ممی، پھپھو صباء نے تو اس گھر میں رہ کر پوری زندگی چپ کی نذر کر دی۔ یہ گھر جہاں ان کے ماں باپ تھے، بہن بھائی تھے۔ بھتیجی، بھتیجے تھے، اتنے سارے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کی زبان پر چپ کا تالا تھا۔ وہ کسی کو بلا نہ سکتی تھیں۔ کسی سے کچھ کہہ نہ سکتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ اسی گھر میں رہتی تھیں۔ ہائے پھپھو کتنا بڑا ظرف تھا آپ کا کتنی محبت کرتی تھیں آپ ہم سے اور کتنی نفرت کرتے تھے ہم سب آپ سے، پھر بھی آپ نے کبھی کسی سے کچھ نہ کہا۔ کوئی شکوہ نہ کیا۔ پھپھو یہ صبر کی عادت کہاں سے سیکھی تھی آپ نے؟''

''بکواس مت کرو، یہ صباء کا ذکر کہاں سے نکل آیا۔ اسی ڈائن نے......''

''ممی پلیز......'' ثناء چیخ پڑی۔ ''پھپھو کو کچھ مت کہیے گا۔ وقت بدل گیا ہے اب میں برداشت نہ کر سکوں گی اپنی پھپھو کی توہین کو۔ سوچ سمجھ کر بات کیجیے گا۔''

''ہائیں! یہ تم کہہ رہی ہو؟'' فوزیہ نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے دیکھا۔ ''یہ اچانک تمہاری نفرت، محبت میں کیسے بدل گئی۔ پہلے کبھی خیال نہ آیا پھپھو کا۔ پہلے تو تم اس کو دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھیں۔ اس وقت تو تم نے اسے کوئی سکھ نہ دیا، جب وہ زندہ تھی۔ آج اس

"بیٹی کی محبت دیکھ لیجیے ممی! مجبور انسان حالات کے سامنے بے بس ہو جاتا ہے اور اپنی طرف سے ہر طرح نباہ کی کوشش کرتا ہے۔" ثناء بھاگتی ہوئی گئی اور دادی سے لپٹ گئی۔

"دادی جان! جب اتنا عرصہ آپ چپ رہی ہیں تو آج...... آج آپ کیوں رو رہی ہیں؟" اس نے خود بھی روتے ہوئے پوچھا۔

"ثناء تمہاری پھپھو نے آخری بار آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا تھا۔ مجھے پکارا تھا مگر میں اس کے پاس نہ گئی میں نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے پاس، میں تو رو بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر اس کو معلوم نہیں ہو سکا کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔ وہ مجھ سے ملنے کبھی نہیں آئی۔ وہ ناراض ہے نا مجھ سے۔ ثناء میں ماں ہو کر بھی اس کی دشمن بنی رہی مگر میں کیا کرتی؟"

"ثناء ادھر آؤ۔ وہاں کیا لینے گئی ہو؟" فوزیہ نے غصے سے پکارا۔

"ممی! میں نے ابھی ابھی تو آپ کو بتایا تھا آج سے میں شہر بانو ہوں، مجھے اس نام سے مت پکاریئے ممی! آپ نے دادی جان کی باتیں سنی ہیں؟ مجھے شرم آتی ہے یہ سوچ کر کہ آپ میری ماں ہیں۔ مجھے اپنے ہی وجود سے گھن آنے لگی ہے۔ مجھے خود سے نفرت محسوس ہونے لگی ہے۔ ممی! آپ نے تو ایسے ایسے جرم کیے ہیں جن کی تلافی اب وقت بھی نہیں کر سکتا۔ آپ کو معلوم ہے ممی تلافی اور کفارے کا وقت گزر چکا ہے۔ مگر سزا کا نہیں۔ یہ سزا ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بھگتنی ہے کیونکہ جرم ہم دونوں ہی نے برابر کیے تھے۔"

"ثناء! تم ہوش میں تو ہو؟ تمہیں معلوم بھی ہے کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا ہم نے کسی کو قتل کیا ہے کس جرم کی بات کر رہی ہو تم، کیسی سزا؟" فوزیہ کو اس کی دماغی حالت پر شک ہونے لگا۔

"میں جانتی تھی ممی! آپ نے ساری زندگی اپنی من مانی کی ہے۔ آپ کسی سزا کو قبول نہیں کریں گی۔ آپ کہتی ہیں ہم نے کوئی قتل نہیں کیا۔ ہاں ممی ہم نے کسی کو قتل نہیں کیا بلکہ سنگسار کیا ہے۔ قتل ہونے والا تو ایک ہی لمحے میں زندگی کی مشکلات سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ مگر سنگسار ہونے والا۔ اف ممی یہ میں نے کیا کیا۔ میں اپنے جرم کا اقرار کرتی ہوں کہ میں ہر وقت ہر لمحہ کوئی نہ کوئی ایسی بات سوچنے کے چکر میں رہتی تھی جو پھپھو صباء کو اذیت دے سکے۔ میں تسلیم کرتی ہوں ان کی موت کا سبب بھی میری ہی باتیں تھیں۔ اسی لیے اب سزا کی صورت میں میں خود کو اسی کمرے میں مقید کر دوں گی۔ جیسا کہ پھپھو صباء نے کیا تھا۔"

"نہیں...... نہیں سنی تم ایسا نہیں کرو گی۔" فوزیہ نے بھاگ کر اسے بانہوں میں لے لیا۔

"ممی! میں یہ ضرور کروں گی۔" ثناء نے خود کو چھڑاتے ہوئے کہا۔ "شاید یہی مکافاتِ عمل ہے۔ جب وقت انسان کے بس میں ہوتا ہے تو وہ آنے والے وقت سے بے خبر کیوں ہوتا ہے۔ وہ جانتا نہیں اس بے خبری کی اسے سزا مل سکتی ہے جیسے آج ہمیں ملے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح دادی کی آنکھیں بیٹی کے درد پر تڑپ جاتی تھیں۔ مگر وہ اسے پیار نہیں کر سکتی تھیں۔ بیٹی کی اذیت پر وہ اندر ہی اندر تڑپتی رہتی تھیں۔ وہی زندگی اب میری اور آپ کی ہو گی۔ میں پھپھو صباء کے کمرے کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ میں باقی ساری زندگی اسی کمرے میں گزار دوں گی۔ اور ممی۔" وہ سسکتی ہوئی بولی۔ "یہ سب آپ کے ظلم کا نتیجہ ہو گا۔ آپ نے کسی کی زندگی برباد کی اور میں نے خود اپنی کر لی۔ ممی! اب میں بھی پھپھو صباء کی طرح اپنے وجود کا بوجھ اپنے سینے پر محسوس کروں گی۔ مگر کوئی مجھے ماں کہنے والا نہ ہو گا۔ میری زندگی بھی ضائع ہو جائے گی اور یہی سزا تو ہو گی میری۔" وہ رونے لگی۔ "ممی میرا باپ ایک عظیم انسان ہے۔ انہوں نے نہ صرف آپ جیسی بیوی سے نباہ کیا بلکہ مجھ جیسی بدتمیز اولاد کو بھی برداشت کیا اور بہن کے مقام کا بھی خیال رکھا۔ مگر میرے بھائی شاید ایسا نہ کر سکیں اور ان کی ہر ٹھوکر مجھے میرے جرم کا احساس دلائے گی اور اس طرح شاید آپ کو بھی کچھ احساس ہو جائے۔"

"سنی! آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔" فوزیہ اس کو پیار کرتی ہوئی خود بھی رو پڑی۔ آج پہلی بار ممتا پر چوٹ پڑی تھی اور وہ تڑپ اٹھی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی ثناء بہت نڈر اور ضدی ہے۔ وہ ہمیشہ جو کہتی ہے وہ کرتی بھی ہے خواہ کچھ بھی ہو جائے۔

"ممی! میں ایسا ضرور کروں گی آپ مجھے نہیں روک سکتیں۔ آپ کو معلوم نہیں کفارے اور تلافی کا وقت گزر گیا ہے مگر سزا کا نہیں اور میں یہ سزا اسی دنیا میں بھگتنا چاہتی ہوں اور شاید اپنی بیٹی کو اس اذیت میں دیکھ کر آپ کو پھپھو صباء کی گزری ہوئی زندگی اور اپنے جرم کا احساس ہو جائے۔ ممی! میری ساری بدتمیزیوں کو معاف کر دیجیے گا۔ کیونکہ آج سے سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں سزا کاٹنے جا رہی ہوں۔ آئندہ آپ مجھے مخاطب کرنے کی کوشش مت کیجیے گا۔" ثناء رخ بدل کر صباء کے کمرے کی طرف بڑھی اس کے دل سے سارے بوجھ ہٹ

گئے تھے۔ سزا کا سوچ کر وہ ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔ مگر فوزیہ نے بھاگ کر راستہ روک لیا۔

''نہیں...... نہیں ثنی! میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔'' فوزیہ جنونی انداز میں چلائی۔

''ایسا ہوگا ممی! یہ سزا مجھے بھگتنی ہے کیونکہ آپ سے زیادہ جرم میں نے کیے ہیں۔''

''نہیں، نہیں۔'' فوزیہ پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔ ''میں اپنے سامنے تمہاری زندگی برباد نہیں ہونے دوں گی۔''

''ممی میرا راستہ روکنے کی کوشش بے کار ہوگی۔'' ثناء نے بے رخی سے کہا۔ ''میں بھی آپ کی بیٹی ہوں، آپ کی طرح جو بات ایک بار کہہ دوں وہی کرتی ہوں۔''

''گویا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔'' فوزیہ نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''آپ کو ابھی تک شک ہے اب یہی ایک راستہ تو ہے میرے پاس۔ آپ کو معلوم نہیں عمر نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔ اب زندگی سے نفرت ہوگئی ہے مجھے۔''

''اچھا۔'' فوزیہ نے دکھ سے بیٹی کو دیکھا اور زندگی میں پہلی بار ہار مان لی۔ ''ثنی! اگر یہ مکافاتِ عمل ہے تو یہ سب میرے ساتھ ہوگا۔ میں تمہاری بربادی نہیں دیکھ سکتی۔ اگر یہ سزا ہے تو میں خود کو دوں گی۔ کیونکہ اصلی مجرم میں ہوں۔ اگرچہ قصوروار تمہاری نانی ہیں۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی تھی۔ انہوں نے میری تربیت ہی ایسے ماحول میں کی کہ مجھے ہمیشہ اپنی ذات عزیز رہی اور شادی کے بعد بھی وہ مجھے ہدایت کرتی رہیں کہ ایسا کرنا، ویسا کرنا اور اس کے بعد میں نے تمہاری تربیت بھی اسی انداز سے کی۔ اب سوچتی ہوں تم اگر میری اور نانی کی مشترکہ تربیت کے باوجود ہوش میں آ سکتی ہو۔ اچھے برے کی تمیز کر سکتی ہو۔ نفرت اور محبت کے احساس کو سمجھ سکتی ہو تو میں کیوں نہ ہوش میں آئی۔ اصلی قصوروار میں ہی ہوں۔ مجرم میں ہوں۔ میرا ضمیر مردہ ہوگیا تھا۔ اس لیے سوائے اپنے کسی کے دکھ درد کا احساس نہ ہوا اور اب سزا بھی میں ہی بھگتوں گی۔''

''ممی! یہ آپ کہہ رہی ہیں؟'' ثناء نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔

''ہاں ثنی! اگر تم ہوش میں آ سکتی ہو تو میں کیوں نہیں آ سکتی۔ مگر ڈیئر مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' انہوں نے محبت سے بیٹی کے چہرے کو دیکھا۔

''وہی کرنا ہوگا جو پھپھو صباء کرتی تھیں۔ وہیں رہنا ہوگا جہاں پھپھو صباء رہتی تھیں۔ ویسے ہی جینا ہوگا جیسے پھپھو صباء جیتی رہیں۔ یہی سزا ہے۔ لیکن ممی آپ یہ سب کیوں کر

رہی ہیں جبکہ میں خود یہ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں؟''

''ثنی، کوئی ماں اتنی ظالم اور سنگدل نہیں ہو سکتی کہ بیٹی کی زندگی برباد کر دے۔ ابھی میرے گھر میں بہو نہیں آئی کہ میں تمہیں نظر انداز کر دوں۔ درد کے ذائقے سے تو میں آج ہی آشنا ہوئی ہوں۔ خدا تمہاری زندگی دراز کرے۔ تم خوش رہو پھولو پھلو، خدا تمہیں ہر دکھ ہر درد سے دور رکھے۔'' وہ اسے دعائیں دیتی ہوئیں صباء کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں اور ثناء کچھ دیر بے حس و حرکت وہیں کھڑی رہی پھر واپس مڑی تو سامنے عمر فاروق کھڑے تھے کسی خوبصورت خواب کی طرح اس وقت اس کی آنکھوں میں محبت کی چمک تھی۔

''عمر...... آپ۔'' ثناء مارے حیرت کے گنگ ہو کر رہ گئی۔

''ہاں شہر بانو میں۔'' عمر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

ثناء نے تڑپ کر اسے دیکھا اور سمجھ لیا کہ وہ تمام باتیں سن چکا ہے۔ تمام کارروائی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے۔ مگر اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ عمر کے ساتھ ساتھ اس کے پاپا بھی یہ سب باتیں سن چکے تھے۔ صباء کے دکھ کا احساس کر کے وہ روئے بھی اور ثناء کے ہوش میں آنے پر خوش بھی ہوئے۔ بے شک جو کام انہوں نے اپنا گھر آباد رکھنے کی خاطر نہیں کیا تھا۔ وہی کام ثناء نے بڑی بہادری اور پورے انصاف کے ساتھ کیا تھا۔ انہیں فوزیہ سے ذرہ برابر بھی ہمدردی محسوس نہ ہوئی۔ البتہ ثناء پر فخر محسوس ہوا۔ وہ آگے بڑھ کر ثناء کو شاباش دینا چاہتے تھے۔ پیار کرنا چاہتے تھے مگر اپنے آگے کھڑے عمر کو ثناء کی جانب بڑھتے دیکھ کر انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ انہیں احساس ہوا جیسے ثناء کا دولہا آ چکا ہے۔ وہ پُرسکون سے اپنے کمرے میں داخل ہوئے۔

''میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی اچھی اور اتنی عظیم بھی ہو سکتی ہو۔'' عمر کا لہجہ چاہت سے لبریز تھا۔

''عمر! میں بہت دیر میں جاگی مگر اب میں سب کچھ سمجھ سکتی ہوں۔ آج میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ اسی لیے تو عمر میں نے خود کو سزا دینے کا فیصلہ کیا مگر......''

''شیری۔'' عمر نے محبت سے اسے دیکھا اور نرمی سے بولا۔ ''بے شک آج تم اس قابل ہو کہ میجر عمر فاروق تم سے محبت کرے۔ تمہاری تمنا کرے، تمہاری خواہش کرے۔ پہلے تو تم صرف آنٹی کی خواہش بن کر میری زندگی میں آئیں۔ لیکن اب ان کی خواہش کے

ساتھ ساتھ تم میری محبت بھی ہو اور شیری! میں نے جتنی نفرت تم سے کی ہے وہ سب سچی تھی۔ تمام تر شدتوں سے میں نے تم سے نفرت کی اور اب محبت بھی اسی سچائی اور شدت سے کروں گا تم دیکھنا میری محبت کو۔''

اور ثناء اس کے محبت بھرے انکشاف پر چپ چاپ روتی رہی۔ پتہ نہیں یہ خوشی کے آنسو تھے یا دکھ کے۔ اچانک صباء کے کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ ثناء چونک پڑی۔ سر اٹھا کر عمر کو دیکھا تو وہ بھی بند دروازے کو دیکھ رہا تھا۔

''نہیں شیری! اب یہ آنسو بالکل نہیں۔'' عمر نے مسکرا کر کہا شاید آج وہ بھی پُرسکون ہو گیا تھا اور اس کے سکون کا خیال کر کے ثناء بھی پُرسکون ہو گئی۔ اچانک اس کی نظر دادی جان پر پڑی اور ثناء دادی کہتی ہوئی بھاگ کر ان سے لپٹ گئی اور عمر بھی ان کے قریب چلا آیا۔

''جیتے رہو بیٹا خدا تمہاری جوڑی سلامت رکھے۔'' انہوں نے باری باری دونوں کی پیشانی چوم کر دعا دی۔ اتنے میں لباس تبدیل کر کے رضوان بھی اپنے کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ عمر نے انہیں سلام کیا تو ثناء بولی۔

''پاپا! ممی......''

''کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ سنی! میں سب کچھ سن چکا ہوں، سب کچھ سن چکا ہوں۔ بیٹا اپنے کیے کی سزا ہر شخص کو ملتی ہے۔ اس میں حیرت کی تو کوئی بات نہیں۔'' انہوں نے دونوں کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''افسوس تو صرف اس بات کا ہے کہ صباء نے بھی مجھے کچھ نہ بتایا۔ وہ ایک بار تو اپنے دل کا حال مجھے بتاتی میں تو سمجھا کہ شاید...... مگر میں کیوں سمجھا؟ مجھے خود اس سے پوچھنا چاہیے تھا کہ صباء تم نے شادی سے انکار کیوں کیا۔ یہ فیصلہ آخر تم نے کیا سوچ کر کیا۔ مگر میں سنی۔''

''پاپا! سنی نہیں شہر بانو۔'' ثناء نے تصحیح کی تو وہ مسکرا دیئے۔

''ماموں جان! آپ اگر اجازت دیں تو میں شیری کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔ دراصل یہ ممی کو بتائے بغیر آ گئی تھی اور ممی خواہ مخواہ مجھ پر ناراض ہونے لگیں۔ انہوں نے کہا شیری کو لاؤ گے تو اپنی شکل مجھے دکھانا ورنہ میں سمجھوں گی میری کوئی اولاد نہیں۔'' عمر نے مختصراً انہیں بتایا۔

''اگر یہ بات ہے تو تم سنی کو لے جاؤ۔'' انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔

''پاپا! سنی نہیں شہر بانو۔'' ثناء روہانسی ہو کر بولی۔

''اچھا بابا شیری ہی سہی۔ ابھی نیا نیا نام ہے کبھی کبھی بھول جایا کریں گے مگر آہستہ آہستہ عادی ہو جائیں گے۔ کیوں عمر!'' انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی ماموں جان!'' عمر مسکرایا پھر کہا۔ ''اب ہم جائیں؟''

''ہاں بیٹا!'' انہوں نے کہا اور عمر ثناء کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

سب سے پہلے جیپ میں ثناء بیٹھی تھی اور بعد میں عمر۔ جیپ اسٹارٹ کرتے ہوئے اس نے ثناء کو دیکھا اور نجانے کیا سوچ کر مسکرا دیا۔ جیپ سڑکوں پر بھاگ رہی تھی اور ونڈ اسکرین کے باہر دیکھتے ہوئے عمر مسلسل کچھ سوچ رہا تھا۔

پھر اچانک جیپ قبرستان کے باہر رکی اور ثناء چونک پڑی۔ عمر نے نیچے اتر کر اس کی سائیڈ کا دروازہ کھولا پھر پُرنم آواز میں بولا۔

''آؤ شیری۔ آنٹی کے پاس چلیں۔ آنٹی کو تمہیں میرے ساتھ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ آؤ آج ان کا یہ شوق پورا کر دیں۔''

عمر کی بات سن کر ثناء کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں۔ وہ عمر کا بازو تھامے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی صباء کی قبر پر آئی۔ پھر عمر کے چہرے کی جانب دیکھا۔ ایک بار پھر اس کا چہرہ ویران اور سپاٹ ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے فاتحہ پڑھ رہا تھا۔ ثناء خود بھی روتی ہوئی فاتحہ پڑھنے لگی۔ پھر اس نے دعا ختم کر کے منہ پر ہاتھ پھیرا تو عمر اس کو دیکھ رہا تھا۔ ثناء سے نظریں ملتے ہی بولا۔

''آؤ شیری! اب چلیں۔'' مگر ثناء وہیں کھڑی رہی۔

''کیا بات ہے شیری؟'' عمر نے پلٹ کر اسے دیکھا اور ثناء کی سمجھ میں نہ آیا کہ آفاق کی قبر کے بارے میں کن لفظوں میں آگاہ کرے۔

''تم کیا سوچ رہی ہو شیری! اس طرح دیر ہو جائے گی جلدی چلو میں ممی کو پریشان چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''عمر! آپ کو معلوم ہے یہ ساتھ والی قبر کس کی ہے؟'' ثناء نے آفاق کی قبر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی مجھے کیا معلوم یہ قبر کس کی......'' بات ادھوری رہ گئی۔ عمر کی نظر قبر پر لگے کتبے پر پڑ گئی تھی۔ جہاں آفاق کا نام بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔

''آفاق۔'' عمر زیرلب بڑبڑایا۔ ''شیری!'' وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آفاق، یعنی کہ انکل آفاق۔'' اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

''ہاں عمر! یہ قبر انکل آفاق کی ہے۔ ان کی موت پھپھو سے ایک روز قبل ہوئی تھی۔ انکل کے دوست نے پھپھو کے نام ایک خط تحریر کیا تھا جو پھپھو کے دسویں کے بعد ملا۔ اسی خط کو پڑھ کر میری آنکھیں کھلی تھیں پھر پھپھو کی ڈائری پڑھی اور حقیقت جان کر جو اذیت میں نے محسوس کی وہ ابھی تک محسوس کر رہی ہوں۔ خط ملتے ہی میں انکل کے دوست کے گھر گئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ آفاق کی تدفین کر چکے ہیں۔ انہوں نے ہی یہ قبر مجھے دکھائی تھی۔''

''انکل آفاق۔'' عمر نے کہا اور قبر کے قریب ہی اکڑوں بیٹھ گیا۔ جب کافی دیر گزر گئی تو ثناء نے اسے مخاطب کیا۔

''آیئے چلیں۔ پھپھو منتظر ہوں گی۔'' عمر چپ چاپ کھڑا ہوگیا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور چہرے پر درد کی شدتیں تھیں۔ یوں جیسے ابھی ابھی صباء اور آفاق کو دفن کر کے اٹھا ہو۔ اس نے چپ چاپ جیپ اسٹارٹ کی اور اسلام آباد کی طرف روانہ ہوگیا۔

ثناء کو معلوم تھا وہ کیا سوچ رہا ہے۔ وہ جانتی تھی وہ اپنی بے بسی پر تڑپ رہا ہوگا۔ جس کی وجہ سے وہ ان حقیقتوں کو بہت پہلے نہ جان سکا اور آفاق کو ڈھونڈ کر نہ لا سکا۔ ثناء بھی اپنی سوچوں میں گم ہوگئی تھی کہ اچانک اس نے جیپ روک دی۔ ثناء نے سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

''کچھ کھاؤ گی؟'' عمر نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''نہیں۔'' ثناء نے آہستہ سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔'' اس نے ٹھیک کہا تھا کہ اگر میں نے نفرت شدت سے کی ہے تو محبت بھی شدت سے کروں گا اور اپنی اسی محبت کی شدت میں اس نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ صبح سے بھوکی ہے اور ثناء کو یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی تھی۔

''بھئی جلدی بولو کیا کھاؤ گی؟'' عمر نے جیب سے بٹوہ نکالتے ہوئے پوچھا۔

''عمر! میں واقعی کچھ نہیں کھاؤں گی۔ یقین کیجیے مجھے بھوک نہیں۔''

''اچھی بات ہے میں اپنی مرضی سے کچھ لے آتا ہوں۔'' عمر نے دروازہ کھول کر اترنا چاہا۔

''پلیز عمر! میں نے کہا نا۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔'' ثناء نے اس کو بازو سے پکڑ لیا تو عمر نے اس کی بات مانتے ہوئے جیپ آگے بڑھا دی۔ مزید کچھ راستہ خاموشی کی نذر ہوا۔ پھر عمر اسے اپنے اور ممی کے درمیان ہونے والے جھگڑے کی تفصیل بتانے لگا جو محض اسی کی وجہ سے ہوا تھا اور ثناء سب کچھ سنتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اس کی پھپھیاں تو بہت پیار کرنے والی ہستیاں تھیں۔ وہ کتنی بری تھی جو ان سے نفرت کرتی رہی۔



سہیل کو جیسے ہی آفس سے یہ معلوم ہوا کہ ثناء اپنا نام تبدیل کرنے کے لیے درخواست دے کر گئی ہے تو مارے غصے کے پاگل ہوگیا اور اسی پاگل پن میں وہ گاڑی کو ہیلی کاپٹر سمجھ کر اڑائے لیے جا رہا تھا۔ ایسے میں دو تین گاڑیوں سے اوورٹیک بھی ہوئی۔ تاہم خیریت ہی رہی۔

گھر کے سامنے پہنچ کر اس نے گاڑی گیٹ کے باہر روکی اور خود بھاگتا ہوا گھر میں داخل ہوگیا۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی اس نے فوزیہ کو فون کیا اور یونیورسٹی میں ہونے والے ہنگامے کی تفصیل خوب نمک مرچ لگا کر بتائی۔ تاہم اپنا تھپڑ مارنا وہ بالکل گول کر گیا۔

''تم محسوس مت کرنا سہیل!'' فوزیہ اس کی تمام باتیں سن کر نرمی سے بولی۔ ''آج ذرا وہ گھر آ جائے پھر اس کی اچھی طرح خبر لوں گی۔ میں جانتی ہوں وہ بہت بدتمیز ہوگئی ہے۔ مگر پلیز بیٹا تم ضبط سے کام لو صرف تین دن کی بات ہے یقین کرو شادی کے بعد وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''

'وہ الو کی پٹھی کبھی ٹھیک نہیں ہوگی۔' سہیل نے دل میں کہا اور بولا۔ ''او کے پھپھو جان آپ جو کہتی ہیں کروں گا لیکن آپ اسے اچھی طرح سمجھا لیں۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی بیٹا! تم فکر نہ کرو میں اسے سمجھا لوں گی۔'' فوزیہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ثناء کو یونیورسٹی جانے ہی کیوں دیا۔ کوئی سا بھی بہانہ کر کے اگر اس کی چھٹی کروا لیتی تو کم از کم یہ ہنگامہ تو نہ ہوتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا ہونے والا کام تو کب کا ہو چکا تھا۔

'کمینی، کتیا تم ایک بار میرے قابو میں تم آؤ پھر دیکھنا اپنا حال میں تمہیں اذیتیں دے دے کر ختم کر دوں گا۔ آج کل تم اس الو کے پٹھے عمر پر بہت مہربان ہو۔ تمہارے ساتھ

ساتھ اس کو بھی دیکھ لوں گا۔ پہلے تو میں محض تمہارے باپ کی وجہ سے چپ رہتا تھا مگر اب ایک بار سامنا تو ہو جائے پھر دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔' وہ کچھ دیر ٹیلیفون کے قریب ہی بیٹھا ان دونوں کو برا بھلا کہتا رہا پھر اٹھ کر باہر آیا تو نشست کے کمرے میں ممی اور دادی جان بیٹھی تھیں۔ ساتھ کچھ دوسری عورتیں بھی تھیں جو دلہن کے لباس کی تیاری میں مصروف تھیں...... شادی کا تمام کام سہیل کی ممی اپنی نگرانی میں کروا رہی تھیں۔

''ممی! آپ ذرا میری بات تو سن لیں۔'' سہیل نے دروازے کے باہر سے پکارا اور وہ اٹھ کر باہر آ گئیں۔

''کہو بیٹا کیا بات ہے؟''

''یہاں نہیں ممی! میرے کمرے میں آیئے۔'' سہیل انہیں اپنے کمرے میں لے گیا اور ماں کو بیڈ پر بٹھا کر خود کمرے میں ٹہلنے لگا۔

''بات کیا ہے بیٹا تم بہت پریشان ہو؟''

''ممی!'' سہیل ان کے سامنے آ کر رک گیا۔ ''آج ثناء نے یونیورسٹی میں میرے ساتھ بہت جھگڑا کیا ہے۔ سب دوستوں کے سامنے میری توہین کی۔'' سہیل نے کہا اور تمام تفصیل ان کے گوش گزار کر دی۔

''یہ سب ثناء نے تم سے کہا؟'' سہیل کی ممی غصے سے آگ بگولا ہو گئیں۔

''جی ممی! اس نے تو میرے ساتھ ہاتھا پائی کی کوشش بھی کی، وہ تو میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے ورنہ سب کے سامنے اس نے تو مجھے مارنے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔''

''تم نے کچھ نہ کہا اسے۔'' وہ غصے سے بے قابو ہوتی ہوئی بولیں۔

''میں کیا کہتا؟''

''کہنا کیا تھا، وہ تمہاری منگیتر تھی۔ چانٹے مار مار کر حلیہ بگاڑ دیتے۔ خیر اب یہ شادی ہرگز نہیں ہو گی۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟'' سہیل کی دادی نے اندر داخل ہوتے ہوئے غصے سے کہا۔

''اگر آپ آ ہی گئی ہیں تو اپنی نواسی کے کرتوت سن لیجیے۔'' ان کی بہو نے تلخ لہجے میں کہا۔

ثناء کی نانی نے چونک کر بہو کو دیکھا۔ یہ آج وہ کس لہجے میں بات کر رہی ہے۔ ''کیا

کیا ہے میری نواسی نے جو تم یوں بگڑ رہی ہو......'' انہوں نے غصے سے پوچھا۔

''کیا نہیں کیا اس نے؟ یونیورسٹی بھر میں میرے بیٹے کو ذلیل کیا ہے۔ مارنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی بہت زبان دراز اور ہاتھ چھٹ ہے۔''

''بہو! تم ہوش میں تو ہو کیا بکے جا رہی ہو۔ فوزیہ کا ذکر کہاں سے آ گیا؟'' انہوں نے بگڑ کر پوچھا۔

''فوزیہ، ثناء کی ماں نہیں ہے کیا۔ آپ نے اس کے کرتوت ابھی سنے نہیں اور ہمدردی ہو گئی۔'' وہ زہر خندہ سے بولیں۔

''بہو! وہ بچی ہے۔ بھول ہو گئی ہو گی اس سے۔'' بہو کو غصے میں دیکھ کر وہ نرم پڑ گئیں۔

''بچی۔'' سہیل کی ممی نفرت بھرے لہجے میں بولیں۔ ''میں تو صباء کے چہلم کے بعد سے ہی اس کا رویہ دیکھ رہی ہوں تب سے وہ ایک بار بھی ہمارے گھر نہیں آئی اور اگر ان کے گھر چلے جاؤ تو سلام تک نہیں کرتی۔ پتہ نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھنے لگی ہے۔''

''بہو! تم بہت غصے میں ہو اور ایسا غصہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ چلو سہیل، تم بتاؤ کیا کہا تھا اس نے تم سے؟'' انہوں نے پوتے سے پوچھا۔

''دادی جان! یہ پوچھیے کہ کیا نہیں کہا اس نے۔'' سہیل نے ایک بار پھر ان کو بھی وہ سب کچھ بتا دیا جو اپنی ممی کو بتایا تھا۔

''مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ سب ثناء نے کہا ہے وہ تو بڑی پیاری اور سعادت مند بچی ہے۔'' انہوں نے بہو کا دل نرم کرنے کے لیے کہا حالانکہ وہ خود بھی جانتی تھیں کہ ثناء بہت بدل چکی ہے۔ فوزیہ نے خود ان کو بتایا تھا کہ وہ نفرت جو وہ اپنے خاندان والوں سے کرتی تھی۔ نہ جانے کب اور کیسے ختم ہو گئی۔ وہ خود بھی اس کی بدتمیزیاں دیکھ چکی تھیں۔ وہ جب بھی ان کے گھر جاتیں وہ انہیں دکھانے کے لیے اِدھر اُدھر پھرتی تھی۔ مگر بات کرنا پسند نہ کرتی اور پھر اس نے کتنی تلخی سے انہی کے منہ پر کہا تھا۔ کیا نانی کو سلام کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ تھی سوچنے والی کہ اس میں یہ تبدیلی آئی کیسے۔ مگر ہزار کوششوں کے باوجود کچھ پتہ نہ چل سکا۔ بس اچانک ہی یہ سب ہو گیا تھا۔ مگر اب جبکہ شادی میں صرف تین روز رہ گئے تھے، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بات بڑھے۔ مگر ان کی بہو بھی آج عمر بھر کا جمع شدہ غبار نکالنے پر تلی بیٹھی تھی۔

"آپ تو یہی کہیں گی۔ آپ کو تو اپنی بچی بھی بڑی معصوم اور سیدھی نظر آتی ہے مگر جب سے بیاہ کر گئی ہے۔ کسی نند سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی۔ جبکہ تیس دن خود آ کے ہمارے سروں پر سوار رہتی ہے۔ چیز ہمارے لیے آتی ہے تو فوزیہ کے لیے بھی حصہ نکالا جاتا ہے۔ میں اپنے بیٹے کی شادی اب ہرگز وہاں نہیں کروں گی۔ ایسی زبان دراز لڑکی کو بہو بنا کر مجھے اپنے بیٹے کی قسمت نہیں پھوڑنی ہے۔" وہ سانس لینے کو رکیں پھر بولیں۔ "شام کو سہیل کے ڈیڈی آئیں گے تو ہم خود جا کر فوزیہ سے بات کریں گے۔ میں خود فوزیہ سے کہوں گی کہ میرے سہیل کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں۔ سنبھال کر رکھو اپنی بدتمیزی بیٹی کو اپنے گھر......"

بہو بولتی رہی مگر ثناء کی نانی اسے چپ بھی نہ کروا سکیں بلکہ کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ پہلے جب اور جہاں کہیں کوئی بات ہوتی تھی وہ فوراً منہ پھاڑ کر کہتیں۔ "میری فوزی کو کوئی کچھ نہ کہے میری ایک ہی بیٹی ہے۔" ثناء کی پیدائش پر جب اس کی دادی آئیں تو اس نے ان کی بھی خوب بے عزتی کی تھی وہ بہت نیک خاتون تھیں سب کچھ سن کر صرف اتنا کہا تھا۔

"خدا سے ڈرو بہن تم بھی بیٹی والی ہو اگر تمہارا دل چاہتا ہے تمہارا بیٹا بہن کا خیال رکھے تو کیا میرا دل نہیں چاہتا دیکھو نا بہن! اولاد تو سب کی ایک جیسی ہوتی ہے۔" یہ سب سن کر وہ سنگدلی سے بولی تھیں۔

"میں نے تمہاری طرح بیٹیوں کی لائن نہیں لگائی۔ میری ایک ہی بیٹی ہے۔" یہ سب باتیں وہ اپنی بہو کے سامنے کیا کرتی تھیں اور آج اسی بہو کے سامنے بیٹھیں وہ بیٹی کے حق میں بول نہ سکتی تھیں اور ان کی بہو کہہ رہی تھی۔

"یہ خوب رہی منہ پھاڑ پھاڑ کر لوگوں سے کہنا ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ میں پوچھتی ہوں۔ جن کی بہت زیادہ بیٹیاں ہیں وہ آسمان سے تو نہیں گریں۔ انہوں نے بھی جنم ہی لیا ہے۔ سب کو تکلیف سہہ کر ماں جنم دیتی ہے۔ میں نے تو پکی بات سوچ لی ہے۔ کسی بھر ے گھر میں سہیل کی شادی کروں گی ثناء سے ہرگز نہیں۔"

اچانک سہیل اپنی جگہ سے اٹھا اور ماں کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا اور پھر منہ بناتے ہوئے بولا۔

"ممی! یہ کیا آپ ایک ہی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ یہ شادی نہیں ہوگی، یہ شادی نہیں ہوگی۔"

"ہائیں۔" وہ آنکھیں پھاڑ کر بیٹے کو دیکھتی ہوئی بولیں۔ "تو کیا تم ابھی بھی اسی زبان دراز سے شادی کرو گے؟ ایسی لڑکیاں تو شادی کے بعد مرد کا جینا حرام کر دیتی ہیں۔ فوزیہ کے شوہر کو ہی دیکھ لو۔"

"کچھ بھی ہو ممی! میں اب بھی اسی سے شادی کروں گا۔" سہیل فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"مگر کیوں؟" میں پوچھتی ہوں اتنی توہین کے بعد بھی تو اسی سے شادی کرے گا تیرے لیے لڑکیوں کی کمی تو نہیں۔" وہ اسے گھورتی ہوئی بولیں۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے ممی! مگر آپ جانتی ہیں میں ثناء سے شادی کیوں کروں گا کیونکہ میں نے اپنے دوستوں کے سامنے قسم کھائی ہے کہ شادی کروں گا تو ثناء سے اور شادی کے بعد اسے طلاق بھی ضرور دوں گا۔ ممی اگر میری شادی ثناء سے نہ ہوئی تو میں مارے شرمندگی اور انسلٹ کے خودکشی کر لوں گا۔"

"خودکشی کریں تمہارے دشمن اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو یہ شادی ضرور ہوگی۔"

"مگر ممی! ایک بات ہے، شادی سے پہلے اب آپ کو ان لوگوں پر رعب ڈالنا چاہیے یعنی آپ ان سے کہیں جب تک ثناء، سہیل سے اپنی حرکتوں کی معافی نہیں مانگے گی تب تک یہ شادی نہیں ہوگی۔" سہیل نے انہیں سمجھایا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ بس ذرا تمہارے ڈیڈی آ جائیں پھر سب مل کر چلیں گے۔" انہوں نے کہا اور واپس کمرے میں آئیں تو ساس ابھی تک وہیں افسردہ بیٹھی تھیں۔

"پھر کیا فیصلہ کیا ہے بہو تم لوگوں نے؟" ان کے لہجے سے بے بسی عیاں تھی۔

"اگر آپ افسردہ ہو رہی ہیں تو صرف آپ کی وجہ سے میں یہ شادی کرنے پر تیار ہوں۔ مگر ایک شرط ہے۔" نخوت سے بولیں۔

"کیسی شرط؟" انہوں نے اسی لہجے میں پوچھا۔

"شادی سے پہلے ثناء کو اپنی بدتمیزیوں کی سہیل سے معافی مانگنا ہوگی۔"

"ہاں ہاں یہ مناسب ہے، وہ معافی مانگ لے گی۔ میں خود کہوں گی اس سے۔" انہوں نے جلدی سے کہا اور بات ختم ہوگئی اور سہیل ایک بار پھر گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا۔

❁ ❁ ❁

عمر نے جیپ کھلے گیٹ کے اندر روکی اور ثناء کا ہاتھ تھام کر برآمدے کی سیڑھیاں طے کرتا ہوا راہداری کی جانب بڑھ گیا۔ ماں کے کمرے کے کھلے دروازے کے قریب رک کر اس نے اندر جھانکا۔ پروین اپنے بیڈ پر لیٹی تھیں۔ قریب ہی کرنل کرسی ڈالے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ شاید ان کا دل بہلانے کے خیال سے گھر رہ گئے تھے۔ عمر نے ثناء کو دیکھا وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔

"تیار ہو جاؤ۔" عمر نے آہستہ سے کہا۔

"جی۔" ثناء اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"ممی۔" عمر نے دروازے میں کھڑے کھڑے ان کو آواز دی۔

پروین نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ ایک ناممکن بات کو ممکن کے روپ میں وہ دیکھ رہی تھیں کیونکہ عمر کے کاندھے کے ساتھ لگی ثناء بھی کھڑی تھی۔ وہ ثناء جس کے لیے انہوں نے زندگی میں پہلی بار اپنے بیٹے کو برا بھلا کہا تھا۔

کرنل نے بھی یہ سین دیکھا اور حیران ہو گئے کیونکہ عمر ان سے یہ کہہ کر نہیں گیا تھا کہ وہ ثناء کو لینے جا رہا ہے۔ وہ غصے سے دندناتا ہوا راستے میں پڑی چیزوں کو بدتمیزی سے ٹھوکر مارتا ہوا گھر سے نکل گیا تھا۔ اس کی حرکتیں دیکھ کر کرنل سمجھے تھے کہ شاید وہ ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔

یہی بات پروین نے بھی سوچی تھی اور مارے صدمے کے اسی وقت ان کو بخار ہو گیا تھا۔ غصے میں انہوں نے اگرچہ عمر کو بہت کچھ کہا تھا۔ مگر اب جب وہ چلا گیا تو ان کا دل گھبرا رہا تھا۔ طبیعت خراب ہو رہی تھی ان سے اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ ان کی خراب طبیعت کی وجہ سے کرنل ڈیوٹی پر نہ جا سکے تھے۔ وہ اسے سہارا دے کر بیڈ روم میں لائے تھے اور لٹاتے ہوئے بولے تھے۔

"حوصلہ کرو بیگم وہ آ جائے گا۔" اور پروین کے آنسو بہہ نکلے۔

"مجھے لگتا ہے وہ کبھی نہیں آئے گا۔" وہ کرنل کے ہاتھوں پر چہرہ رکھ کر رونے لگیں۔

کرنل انہیں دلاسہ دیتے رہے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جبکہ اندر سے خود ان کا دل بھی ڈر رہا تھا۔

مگر اس وقت نہ صرف عمر ان کے سامنے تھا بلکہ ساتھ ثناء بھی موجود تھی۔ کرنل کو بے

ساختہ اپنے بیٹے پر پیار آ گیا۔ جس نے ماں، باپ کا حکم نہ ٹالا تھا۔ وہ مسکرا کر بیٹے کو دیکھنے لگے۔

"ممی!" عمر انہیں دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کے دودھ کی قیمت لے کر آ گیا ہوں اسے قبول کیجیے اور مجھے معاف کر دیجیے۔" اس نے فوجیوں والے انداز میں کہا اور وہیں سے ایڑیوں پہ گھوم کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ثناء بھاگ کر کمرے میں داخل ہوئی۔ سب سے پہلے کرنل کو سلام کیا اور پھر پھپھو سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"نہ رو میری بچی نہ رو۔ دیکھو اگر اس نے تمہیں گھر سے نکالا تھا تو اب لے کر بھی خود ہی آیا ہے۔"

"پھپھو آپ مجھ سے اتنا پیار کرتی ہیں؟" ثناء نے روتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ثناء! میں کیا تمہاری سب پھپھیاں تم سب سے ایسا ہی پیار کرتی ہیں۔" وہ اس کی پیشانی چوم کر بولیں۔ "اچھا تم پہلے مجھے یہ بتاؤ بھائی جان اور بھابی نے پوچھا تو ہو گا کہ اس وقت کیوں آئی ہو؟" اسی دوران کرنل اپنا فون سننے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"جی پھپھو انہوں نے پوچھا تھا مجھ سے اور میں نے کہہ دیا عمر اپنے کام کے سلسلے میں لاہور آ رہے تھے میں بھی ان کے ساتھ آ گئی...... یہ سن کر وہ لوگ چپ ہو گئے تھے۔"

"اچھا۔" پروین اس کی بات سن کر خوش ہو گئی۔ "یعنی جس ظالم نے تمہیں گھر سے نکالا تم نے اسی کی عزت بنائی۔ تو بہت اچھی ہے میری بچی۔ بہت ذہین ہے۔" وہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں۔ "ارے" اچانک وہ چونک پڑیں۔ "یہ تمہیں چھوڑ کر عمر کہاں چلا گیا؟ شاید مجھ سے ناراض ہے دیکھو تو ذرا کہاں ہے۔"

"پھپھو! وہ شاید اپنے کمرے میں گئے ہیں۔" ثناء نے بتایا۔

"اچھا جاؤ دیکھو اسے اور بلا کر لاؤ۔" پروین نے کہا۔

"جی بہتر پھپھو جان۔" ثناء اٹھ کر چلی گئی۔ مگر عمر کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور رصباء کا کمرہ کھلا تھا اور کمرے کے وسط میں عمر کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ ثناء چاہنے کے باوجود اندر داخل نہ ہو سکی اور دروازے پر دستک دے ڈالی۔ عمر نے پلٹ کر دیکھا تو ثناء بولی۔

"میں اندر آ جاؤں؟"

"آؤ شیری۔" عمر نے کہا تو وہ اندر داخل ہو گئی۔ کمرہ یوں صاف ستھرا تھا جیسے ابھی

ابھی صفائی کی ہو۔ وہ کمرے میں موجود ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنے لگی۔

''ادھر آؤ شیری۔'' عمر نے کہا تو وہ جھجکتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی۔ عمر کتنی دیر کھویا کھویا سا اس کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ''اپنا ہاتھ ادھر لاؤ۔''

''کیوں؟'' بے ساختہ ثناء کے منہ سے نکل گیا۔

''سوال بعد میں کرنا پہلے ہاتھ ادھر لاؤ۔'' اور ثناء نے دایاں ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔

عمر کچھ دیر اس کے ہاتھ کو دیکھتا رہا پھر نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے بھاری ہاتھ میں لے لیا اور اگلے ہی لمحے انگلی پکڑ کر صباء کی انگوٹھی اس میں ڈال دی۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔

''عمر یہ......'' ثناء نے خوشی سے بے قابو ہو کر اسے دیکھا۔

''یہ تمہارے لیے تھی شیری! میرا مطلب ہے آنٹی نے ایک بار کہا تھا۔ ان کے مرنے کے بعد اس انگوٹھی کی وارث میری بیوی ہو گی اور اس رشتے کے لیے آج میں تمہارا انتخاب کر چکا ہوں۔''

''سچ عمر؟'' ثناء نے شرمانے کے باوجود پوچھ ہی لیا۔

''کیا تمہیں شک ہے۔'' عمر ناراض ہو گیا۔

''نہیں نہیں عمر!'' وہ ایک دم ڈر گئی۔ ''آپ ناراض نہ ہوں آپ کے لیے تو میں نے سب کو چھوڑ دیا اب اگر آپ بھی ناراض ہو گئے تو۔'' اس کی آواز بھیگ گئی۔

''ناراض ہونے کے دن گزر چکے ہیں۔'' عمر مسکرا کر بولا۔ ''صرف ایک بات یاد رکھنا میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ مذاق میں بھی جھوٹ بولنا مجھے پسند نہیں۔ میرے منہ سے نکلنے والی ہر بات سچی ہوتی ہے۔ میری ہر بات پر پہلی بار ہی یقین کر لیا کرنا اس طرح تمہیں بھی سہولت رہے گی اور میرا دل بھی خوش رہے گا۔''

''جی بہتر۔'' ثناء نے ہنس کر کہا تو عمر بھی مسکرا دیا۔

''عمر!'' ثناء نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''آج سے میں اس کمرے میں سو جاؤں؟''

''اس کمرے میں؟'' عمر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''تم نے سنا نہیں تھا اس دن میں نے کہا تھا اس کمرے اور کرسی کی وارث میری بیٹی ہو گی۔'' ثناء نے شرما کر سر جھکا لیا۔

کافی دیر گزر گئی۔

''ارے باپ رے آپ کو تو پھپھو جان بلا رہی تھیں۔ اسی وجہ سے تو میں آپ کے

پاس آئی تھی۔'' ثناء کو اچانک یاد آیا۔

''اچھا۔'' عمر نے شرارت سے اسے دیکھا۔ ''وہ تمہاری وجہ سے ناراض ہو گئی تھیں۔ بہت پیار ہے انہیں تم سے۔ اب تم آ گئیں تو میں ان سے ناراض ہوں۔''

''کیوں؟'' ثناء نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''تم کیوں ڈر رہی ہو پاگل۔ میں تم سے تو ناراض نہیں۔'' وہ ہنس پڑا۔

''مگر پھپھو سے کیوں ناراض ہیں؟'' ثناء نے پوچھا۔

''بھئی تم چپ رہو تمہیں اس سلسلے میں بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ پہلے پھپھو بھتیجی کے حق میں بول رہی تھی۔ اب بھتیجی، پھپھو کے حق میں بول رہی ہے۔ بہت محبت ہو گئی ہے ان چار دنوں میں۔'' وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا اور ثناء چپ ہو گئی۔

''اب کیا سوچنے لگی ہو چلو بابا چلتا ہوں۔'' اس کے ساتھ چلتا ہوا پروین کے کمرے میں آیا اور پھر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

''ادھر آؤ عمر، میرے قریب۔'' پروین نے اس کی ناراضگی پر دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے کہا۔

''جی فرمایئے ممی۔'' عمر اور بھی سنجیدہ شکل بنا کر ان کے بالکل قریب کھڑا ہو گیا۔ اسی کرسی کے ساتھ لگ کر جہاں کچھ دیر پہلے کرنل بیٹھے تھے۔

''ادھر یہاں بیٹھو میرے قریب۔'' پروین نے رعب سے کہا اور عمر بیڈ کے کنارے ان کے پاس بیٹھ گیا۔

''ہاں اب بتاؤ۔''

''کیا......؟'' عمر نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

''کیا تم ناراض ہو؟'' انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہاں۔'' عمر نے سادگی سے سر ہلایا۔

''مگر کیوں ناراض ہو کچھ پتہ بھی تو چلے؟'' انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو کیا۔ آپ تو خوش ہیں نا۔'' عمر نے منہ بنا کر جواب دیا۔

''میری خوشی سے تم خوش نہیں؟'' انہوں نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''خوش ہونا یا نہ ہونا الگ بات ہے مگر آپ کو تو خوش کر دیا نا۔'' وہ بدستور اسی لہجے

میں بولا۔

''اور منے اب تم بھی خوش ہو جاؤ کیونکہ۔'' پروین نے پیار سے اس کی ناک پکڑتے ہوئے کہا اور عمر چونک پڑا۔

''ممی! آپ کے ہاتھ بہت گرم ہیں۔ کیا بخار ہو گیا؟'' عمر ساری ناراضگی بھول گیا۔

پروین ایک بار پھر افسردہ ہو گئیں پھر پیار سے عمر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی ہوئی بولیں۔ ''تم چلے گئے تھے تو میں نے سمجھا شاید تم ہمیشہ کے لیے ناراض ہو کر گئے ہو اور میں...... اور میں۔'' انہوں نے نظر بھر کے بیٹے کو دیکھا مگر مارے غم کی شدت کے ان سے آگے بولا ہی نہ گیا۔

''اوہ ممی! میری پیاری ممی۔'' عمر نے پیار سے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔'' میں سب سے ناراض ہو سکتا ہوں مگر آپ سے نہیں میں آپ کو چھوڑ کر بھلا جا سکتا تھا مگر......'' اس نے منہ بسورا۔

''اب کیا ہوا؟'' پروین نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

''مگر ممی آج زندگی میں پہلی بار آپ نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے اپنی بھتیجی کے لیے۔ آپ نے مجھے بہت برا بھلا کہا ہے۔ بددعائیں دیں، اب آپ اس بھتیجی کے ساتھ رہیے گا۔ میں اسے خود سے منسوب کر کے آپ کے پاس چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے کسی دور دراز علاقے میں چلا جاؤں گا پھر پتہ چلے گا آپ کو اپنی اس محبت کا جب میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔'' اس نے مصنوعی خفگی سے دھمکی دی۔

''عمر! یہ تم کہہ رہے ہو۔'' وہ خوشی بھرے لہجے میں بولیں۔

''یعنی، آپ میرے جانے سے بہت خوش ہیں؟'' عمر نے بگڑ کر پوچھا۔

''ہاں ہاں خوش ہوں۔ دھمکی دینے کی ضرورت نہیں جب جی چاہے چلے جانا مگر مجھے ننھے منے عمر کا تحفہ دے کر، پھر میں اسی کو اپنے پاس رکھوں گی۔ اس کی پرورش کروں گی۔ تم بے شک میرے پاس نہ رہنا مگر دھمکی دینے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے پوتے اور بہو کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کروں گی۔'' انہوں نے کہا پھر بولیں۔ ''کیوں ثنی!'' انہوں نے پیار سے بھتیجی کو دیکھا جو شرم سے سرخ ہو رہی تھی اور نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

عمر نے دلچسپی سے اسے دیکھا اور پکارا۔ ''مس رضوان۔''

''کیا؟'' وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

عمر نے اس کی گھبراہٹ دیکھی تو بولا۔ ''بھئی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ شرمانا بعد میں پہلے ممی کو اپنا نام بتاؤ یعنی اصلی نام۔''

''کیوں کیا یہ نام نقلی ہے؟'' پروین نے مسکرا کر پوچھا۔ بیٹے کو خوشگوار موڈ میں دیکھ کر وہ خود بھی خوش ہو گئی تھیں۔

''پھپھو جان! میں نے دراصل اپنا نام شہر بانو رکھ لیا ہے۔'' اس نے سر جھکائے جھکائے بتایا۔

''اچھا مگر کیوں؟'' پروین نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کیوں کا کیا مطلب ممی؟'' ثناء کی بجائے عمر بولا۔ ''اگر یہ ثناء ہوتی تو اس وقت لاہور میں ہی ہوتی خیر اب تو یہ خیر سے شہر بانو ہے۔ ہاں تو ممی اب میں ذرا نہا لوں۔ آپ کی وجہ سے لاہور گیا بھی اور آیا بھی مگر ایک طرح سے یہ اچھا ہی ہوا۔'' وہ مسکرا کر ثناء کو دیکھتا ہوا چلا گیا اور پروین اور بھی حیران ہو گئیں۔ یہ تو انہیں معلوم تھا کہ ثناء کا نام شہر بانو، صباء نے تجویز کیا تھا۔ مگر اتنے سال گزرنے کے بعد یہ تبدیلی انہیں کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔

''ثنی! یہ عمر کیا کہہ رہا تھا؟'' انہوں نے براہ راست اسی سے پوچھا۔

''پھپھو پہلے تصحیح کر لیجیے۔ ثنی نہیں شیری۔'' ثناء نے فوراً کہا۔

''اچھا بھئی شیری ہی سہی مگر مجھے بھی یہ سب بتاؤ یعنی عمر اتنا نرم کیسے ہو گیا اور آخر لاہور میں کیا ہوا ہے؟ جلدی سے مجھے بھی بتاؤ۔''

''جی بہتر پھپھو جان۔'' ثناء نے کہا اور شروع سے آخر تک تمام کہانی ان کو کہہ سنائی۔

''یہ تو بہت برا ہوا۔'' پروین نے اظہار افسوس کیا۔

''نہیں پھپھو یہی تو صحیح ہوا ہے۔'' ثناء نے افسردگی سے کہا۔

''مگر مجھے یقین نہیں آتا۔ فوزیہ مان کیسے گئی۔ وہ تو بڑی......''

''وہ کچھ بھی ہوں لوگوں کے لیے مگر اس وقت مسئلہ ان کی بیٹی کا تھا۔ آخر وہ ماں ہیں۔'' ثناء چپ ہو گئی۔

''کیا بات ہے بھئی فضا میں اداسی کی بو ہے۔ ممی! آپ ابھی تک باتوں میں لگی بیٹھی

ہیں۔ صبح تو بڑی ہمدردی میں بول رہی تھیں۔ اس کی مگر اس وقت......"

"کیوں، کیا اس وقت میں اس کی پٹائی کر رہی ہوں؟" پروین نے بگڑ کر پوچھا۔

"میں نے یہ کب کہا آپ تو خواہ مخواہ لڑائی کے موڈ میں بیٹھی ہیں۔ میں تو یہ عرض کر رہا تھا آپ کی اس چہیتی بھتیجی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا اور اب دوپہر کے کھانے کا وقت بھی نکل چکا ہے۔ اتفاق سے دوپہر کا کھانا میں نہیں کھا سکا تھا۔ اب اس وقت اگر آپ چائے کے ساتھ کچھ چٹ پٹی چیزوں کا اہتمام کرلیں تو پیٹ کو کچھ سہارا ہو جائے گا۔ تب تک میں لان میں جاتا ہوں، شاید پاپا بھی وہیں ہوں۔ بس آپ جلدی سے مل کر سب تیاری کر ڈالیں۔"

"سنو عمر! تم فوراً جیپ نکالو ہم سب لوگ لاہور جا رہے ہیں۔" پروین نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر کیوں ممی؟" عمر نے چونک کر سوال کیا۔

"اپنے اس کیوں کا جواب راستے میں پوچھنا۔" وہ جلدی سے اٹھتی ہوئی بولیں۔

"اور سنی، میں تمہارے پھپا کے پاس جا رہی ہوں۔ اگر تمہیں کچھ کھانا ہے تو اسی دوران میں جلدی سے کھالو بلکہ بہتر یہ رہے گا فریج میں سے سب چیزیں نکال کر جیپ میں رکھ لو راستے میں کھاتی جانا۔"

"ممی آپ کو پھر اپنی بھتیجی کا خیال آیا ہے۔ میں نے شاید آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اتفاق سے دوپہر کا کھانا یعنی لنچ آپ کا یہ بیٹا بھی نہیں کر سکا۔" عمر نے مصنوعی ناراضگی سے کہا مگر پروین اسے نظر انداز کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اور ثناء اسے دیکھ کر مسکرانے لگی۔



شوہر کے آتے ہی سہیل کی ممی یونیورسٹی میں ہونے والے ہنگامے کی بات لے کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے سب کچھ بڑھا چڑھا کر شوہر کو بتایا اور سب کچھ سن کر وہ حیران رہ گئے پھر پوچھا۔

"مگر وہ کب آئی۔ کل رات جب میں ان کے گھر گیا تھا تو معلوم ہوا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں آئی۔" اس سلسلے میں فوزیہ فکر مند تھی اور شاید رضوان کہہ رہے تھے کہ وہ جمعرات کو جا کر خود اسے لے آئیں گے۔ اب تم یہ کہانی سنا رہی ہو۔"

"اور یہ سچی کہانی ہے۔ وہ جب بھی آئی۔ ہمیں اس سے کیا مطلب ہمیں تو صرف اس بات سے مطلب ہے۔ اس نے سہیل کی توہین کی تو آخر کیا سوچ کر کی۔ جبکہ تین روز بعد اس کی شادی سہیل سے ہونے والی تھی۔ آپ جلدی سے چلیں آج یہ سب باتیں ان کے منہ پر ہوں گی۔ کسی کا لحاظ کرنے کی ضرورت نہیں۔ صاف کہہ دیجیے گا اگر ثناء نے سہیل سے معافی مانگی تو یہ شادی ہوگی، دوسری صورت میں بالکل نہیں۔ یہ تو انتہا ہے بدتمیزی کی۔ پتہ چل جائے گا آج بدتمیزی کرنے کا۔" وہ بڑبڑانے لگیں۔

"ارے ہاں ممی! آپ کے ثناء کہنے پر یاد آیا۔" سہیل کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اس نے تو اپنا نام بھی بدل لیا ہے۔ ثناء کی بجائے شہر بانو رکھا ہے۔" سہیل نے ایک نئی اطلاع دی۔

"سہیل اگر تم کہہ رہے ہو تو سچ ہی ہوگا۔ یہ دقیانوسی نام اس کی پیدائش پر صباء نے تجویز کیا تھا۔ مگر فوزیہ کو یہ نام بالکل پسند نہ آیا۔ خیر پسند تو اسے اپنی کسی نند کی کبھی کوئی بات آئی ہی نہیں تھی۔ جب یہ نام فوزیہ کو پسند نہ آیا تو میں نے اپنی پسند سے بچی کا نام ثناء رکھ دیا اور یہ نام سب نے بہت پسند کیا مگر اتنے عرصہ بعد نام کی یہ تبدیلی۔ میں ٹھیک کہتی ہوں وہ صباء کی موت کے بعد بدل گئی ہے۔ آخر صباء کا صبر بھی تو پڑنا تھا ان لوگوں پر۔"

"ممی! اگر آپ اپنی ہی باتوں میں مصروف رہیں تو ان کے گھر کب جائیں گے۔ اب جلدی کیجیے نا۔" سہیل نے یاد دہانی کے طور پر کہا۔

"ہاں بھئی، اب چلنا چاہیے۔" انہوں نے شوہر کو دیکھا۔ وہ پہلے ہی سے تیار بیٹھے تھے۔ "سہیل اپنی دادی جان کو بھی ساتھ لے لو۔" انہوں نے کہا اور کچھ دیر بعد ہی یہ قافلہ رضوان کے گھر کی جانب چل پڑا تھا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد وہ ان کے گیٹ کے باہر موجود تھے۔ سہیل کی ممی سارا راستہ ہی بڑبڑاتی رہی تھیں اور اس وقت سب سے پہلے گھر میں داخل بھی وہی ہوئی تھیں۔

پورے گھر پر ہُو کا عالم طاری تھا۔ کہیں سے کوئی ذرا سی بھی آواز نہ آ رہی تھی۔ نہ نومی کے شور کی۔ نہ فومی کے بحث کرنے کی اور نہ ہی ثناء کے قہقہوں کی۔ وہ لوگ بہت حیران ہوئے۔ اندر آئے تو نومی پر نظر پڑ گئی جو صوفے پر ٹانگیں لٹکائے کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ تھامے بیٹھا تھا۔ آج اس کے چہرے پر شوخی اور شرارت کی بجائے گمبھیر سنجیدگی تھی۔ بہت سارے قدموں کی آہٹ سن کر وہ چونکا اور پھر سوالیہ انداز میں ان

سب کے چہروں کی جانب دیکھنے لگا۔

"فوزیہ کہاں ہے؟" سہیل کے ڈیڈی نے اس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

نومی یونہی ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچتا رہا۔ شاید بات کرنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

"تم نے بتایا نہیں۔" سہیل کی ممی نے تیزی سے پوچھا۔

"میری تو خود کچھ سمجھ میں نہیں آتا آپ کو کیا بتاؤں۔" نومی نے بے چارگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں، کیا ہو گیا ہے جو تم بتا نہیں سکتے؟" سہیل نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"کمال ہے آج میں بدل گیا ہوں یا آپ سب لوگ بدل گئے ہیں۔ ممی کو دیکھا تو وہ صباء پھپھو کے کمرے میں چادر اوڑھے بیٹھی ہیں۔ جیسے کوئی چلہ کاٹ رہی ہوں اور سہیل بھائی بھی آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ پتہ نہیں آج سب لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔" نومی کو کسی بات کا کچھ پتہ نہ تھا۔ حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

"چلو اٹھو اور ان کو بلا کر لاؤ۔" سہیل کی ممی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ان کے اس انداز پر نومی نے آنکھیں پھاڑ کر ان کو دیکھا اور پھر "جی بہتر" کہتے ہوئے چلا گیا۔ مگر کچھ دیر بعد ہی وہ منہ لٹکائے ہوئے واپس آیا اور کہا۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا نا ممی کو پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں نے آپ سب کا بتایا تو کہنے لگیں میں باہر نہیں آؤں گی۔"

"یعنی اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔" سہیل کی ممی نفرت سے بولیں۔

"آپ میری پوری بات تو سن لیں۔" نومی نے برا سا منہ بنا کر انہیں دیکھا۔ "ممی کہہ رہی تھیں آپ سب اسی کمرے میں آ جائیں۔ اس کمرے میں نہ جانے ایسا کیا اثر ہے جو بھی ایک بار اس کمرے میں گیا وہ ہمیشہ کے لیے بدل جاتا ہے۔ پہلے ثناء آپی بدلی تھیں اب ممی اس کمرے میں بیٹھی ہیں اور وہ بھی پوری بدلی بدلی لگ رہی ہیں۔ میں کیا کروں؟" نومی دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

"اچھا ٹھیک ہے، ہم اسی کمرے میں چلے جاتے ہیں۔" سہیل کے ڈیڈی نے کہا اور اتنے میں اچانک رضوان اپنے کمرے سے باہر آئے۔ ان سب کو دیکھا تو سمجھ گئے کیا معاملہ

ہو سکتا ہے۔

"کب آئے آپ لوگ؟" انہوں نے اخلاقاً پوچھا۔

"ابھی تھوڑی دیر گزری، فوزی کہاں ہے؟" انہوں نے ایک بار اور اس کا پوچھنا ضروری سمجھا۔

"وہ تو صباء کے کمرے میں ہیں، چلیے سب لوگ وہیں چلتے ہیں۔" رضوان نے کہا تو وہ سب لوگ ان کے پیچھے ہو لیے۔

"صباء کے کمرے میں پتہ نہیں یہ کیا ڈرامہ ہے؟" سہیل کی ممی منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں۔

نومی نے ٹھیک کہا تھا۔ فوزیہ سچ مچ شال اوڑھے صباء کے بستر پر بیٹھی تھی۔ ان لوگوں کو دیکھا مگر کچھ بولی نہیں۔

"تم یہاں اس کمرے میں؟" سہیل کی ماں نے ناک چڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، میں یہاں اس کمرے میں فرمایئے کیسے آنا ہوا؟" فوزیہ نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

سہیل کی ممی نے اپنے شوہر کو دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ بات آپ شروع کریں اور انہوں نے ہی بات شروع کی۔

"فوزی! سہیل نے تمہیں بتایا تو ہو گا کہ ثناء نے آج اس کے ساتھ یونیورسٹی میں بہت بدتمیزی کی ہے۔ بلکہ مار کٹائی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ جبکہ تین روز بعد اس کی سہیل سے شادی ہو رہی ہے۔"

"جی بھائی جان میں جانتی ہوں۔" فوزیہ نے آہستہ سے کہا۔

"اور سہیل کی ممی غصے میں آ گئیں۔ "فوزی کیا اسے ایسا کرنا چاہیے تھا۔ جبکہ تین روز بعد اس کی سہیل سے شادی ہو رہی تھی۔ وہ بہت بدتمیز ہو گئی ہے۔ تہذیب تو اس میں نام کو بھی نہیں رہی۔ اس نے سہیل سے ہاتھا پائی بھی کی۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں۔ تمہارے خیال میں کوئی شریف لڑکی ایسا کر سکتی ہے؟" وہ بولے جا رہی تھیں۔

فوزیہ نے رضوان کو دیکھا جو ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے معاملات سے الگ کھڑے تھے۔ آہستہ سے بولے۔

"شاید بھابی آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" اور بھابی صاحبہ مزید غصے میں آ گئیں۔

"یعنی تم صرف 'شاید' کہہ کر اس بات کو ٹال رہی ہو۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں، ہماری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو بجائے چل کر گھر آنے کے اپنے گھر میں بیٹھا جواب دے دیتا مگر ہم نے ایسا نہیں کیا۔ صرف تمہاری وجہ سے تاہم سہیل بہت ناراض ہے اور اسے ہونا بھی چاہیے۔ ثناء نے جو کچھ بھی کیا وہ کوئی معمولی بات تو نہیں تھی۔ سہیل کے دوستوں میں اس کی انسلٹ ہوئی ہے۔ وہ بہت غصے میں ہے میں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر کیا کروں وہ مانتا ہی نہیں۔"

"اچھا وہ نہیں مانتا مگر بات کو طویل کرنے کی بجائے اب آپ یہ بتائیں آپ کیا چاہتے ہیں۔ اگر ثناء نے یہ سب کیا ہے تو اس کے بدلے میں آپ سب کیا کرنے کا ارادہ لے کر آئے ہیں خواہ مخواہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے آپ اپنے مطلب پر آئیں۔" رضوان جواب تک خاموش کھڑے سب کچھ سن رہے تھے اور بڑے ضبط سے کام لے رہے تھے۔ بول پڑے، کیونکہ خود ان کے خیال میں ان کی بیٹی نے کوئی جرم نہ کیا تھا۔ وہ تو بہت دیر بعد ہوش میں آئی تھی۔ اس نے تو ایک طویل عرصہ تک اس گھر میں ہونے والے ظلم کا فیصلہ کیا تھا اور پورے انصاف کے ساتھ کیا تھا پھر بھلا وہ مجرم کیسے ہو سکتی تھی۔ انہیں تو فوزیہ کو اس حالت میں دیکھ کر بھی ذرہ برابر ترس نہیں آ رہا تھا۔ کیونکہ بیس سال سے فوزیہ صرف ثناء کی وجہ سے من مانی کرتی رہی تھی۔ اگر بیٹا ہوتا اور فوزیہ اس طرح کی حرکتیں کرتی تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کو برداشت نہ کرتے مگر بیٹی کے بہتر مستقبل کے لیے انہوں نے ایک طویل عرصہ تک فوزیہ کی بدتمیزیوں کو اور باتوں کو برداشت کیا تھا اور شاید انہی باتوں کا صلہ تھا کہ بہت برس بعد بیٹی ان کا سہارا بن گئی تھی اور وہ ہر فکر، ہر غم سے آزاد ہو گئے تھے۔

رضوان کی بات سن کر وہ سب لوگ حیران رہ گئے۔ کم از کم انہیں رضوان سے اس بات کی توقع نہیں تھی۔ اس حیرت میں وہ کچھ دیر کے لیے سب کچھ بھول گئے۔

"آپ نے بتایا نہیں آپ کیا مقاصد لے کر آئے ہیں؟" رضوان نے خشک لہجے میں کہا۔

رضوان کی بات سن کر اور لہجے کی کرختگی محسوس کر کے سہیل کی ممی کو پھر غصہ آ گیا۔

تیوریاں چڑھاتی ہوئی بولیں۔

"ہم چاہتے ہیں ثناء، سہیل سے اپنے کیے کی معافی مانگے یعنی اپنی بدتمیزیوں کی۔"

"اور اگر وہ معافی نہ مانگے تو؟" رضوان نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"تو بات بالکل صاف ہے۔" سہیل کے ڈیڈی بولے۔ "اگر ثناء نے معافی نہ مانگی تو پھر یہ شادی ہرگز نہ ہو گی پھر آپ اس شادی کو منسوخ سمجھیے۔"

"گویا میں یہ سمجھوں کہ آپ دھمکی دے رہے ہیں۔" رضوان نے تلخ لہجے میں کہا۔

"یہ دھمکی نہیں، حقیقت ہے۔" سہیل کی ممی بولیں۔ "ثناء کو معافی مانگنا ہو گی اگر آپ لوگ چاہتے ہیں کہ یہ شادی ہو تو آپ اس کو بلائیں اور کہیں کہ وہ سہیل سے معافی مانگے۔"

فوزیہ نے بڑے تحمل سے ان کی بات سنی پھر تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

"آپ جانتے ہیں ثناء بہت بدتمیز ہو گئی ہے۔ اگر آپ یہ بات جان گئے ہیں تو آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا وہ ایسی صورت میں کبھی معافی نہیں مانگے گی کیونکہ اس نے کبھی معافی مانگی ہی نہیں ہے۔ اس کو معافی مانگنے کی عادت ہی نہیں۔"

"تو پھر بات صاف ہے۔" سہیل کی ممی تنتناتی ہوئی بولیں۔ "یہ شادی بھی اب نہیں ہو گی۔"

"میں جانتی تھی۔" فوزیہ نے آہستہ سے کہا۔ "یہ لیجیے منگنی کی انگوٹھی۔ وہ خود بھی اب یہاں شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"کیا؟" بھابی جو بڑے زور سے رعب ڈال رہی تھیں، وہ رعب جس کا موقعہ ان کو ایک مدت کے بعد ملا تھا۔ اب حیرت سے منہ کھول کر کبھی فوزیہ کو دیکھتی اور کبھی اس کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی انگوٹھی کو۔

سہیل بھی ہکا بکا رہ گیا۔ وہ لوگ کیا سوچ کر آئے تھے اور یہاں معاملہ اور ہو گیا تھا بلکہ بہت خراب ہو گیا تھا۔ اچانک سہیل اپنی جگہ سے اٹھا اور ماں کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل گیا۔

"اب کیا بات ہے؟" انہوں نے بیٹے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

اس پر سہیل بگڑ کر بولا۔ "ممی! آپ ایک ہی بات کی رٹ لگا کر بیٹھ گئی ہیں۔ یہ شادی نہیں ہو گی۔ میں پوچھتا ہوں اگر یہ شادی نہیں ہو گی تو کیا ہو گا؟"

''ہم یہ نہ کہتے تو اور کیا کہتے۔'' وہ بھی بگڑ کر بولیں۔ ''تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ثناء معافی مانگے گی تو یہ شادی ہوگی ورنہ نہیں۔''

''معافی گئی جہنم میں۔ ممی! میں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ مجھے ہر حال میں ثناء سے شادی کرنا ہے کیونکہ میں نے اپنے دوستوں کے سامنے قسم اٹھائی ہے انتقام لینے کی، آپ کو معافی یاد رہی اور شادی بھول گئیں۔ اگر ثناء ابھی معافی نہیں مانگتی تو نہ سہی، شادی کی رات وہ معافی مانگنے پر مجبور ہو جائے گی یا پھر مجبور کر دی جائے گی۔ اس وقت کسی طرح بھی ان لوگوں کو شادی کے لیے رضامند کیجیے۔ لگتا ہے ان کا خود بھی شادی کرنے کا ارادہ نہیں مگر یاد رکھیں ممی! کہ اگر یہ شادی نہ ہوئی تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔ آپ کچھ کیجیے ممی ورنہ......'' سہیل نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''نہ...... نہ میرے بیٹے آگے کچھ مت کہنا۔'' وہ گھبرا کر بولیں۔ ''اگر ایسی بات ہے تو میں اپنی پوری کوشش کروں گی بلکہ ابھی کرتی ہوں۔''

''ہاں ممی! یہ ٹھیک ہے۔'' سہیل نے کہا اور دونوں ماں بیٹا اندر آ گئے۔

اسی وقت باہر جیپ رکنے کی آواز آئی۔ پھر وہ سب لوگ اندر داخل ہوئے۔ نومی سے پوچھا۔ نومی نے ان لوگوں کو بھی وہی جواب دیا جو پہلے لوگوں کو دے چکا تھا۔ اور دل میں سوچا آج کہیں مارے حیرت کے میں مر ہی نہ جاؤں۔ سب کچھ الٹ پلٹ ہو رہا ہے۔ ماموں ممانی آئے تو غصے میں تھے اور ادھر ثناء آپی آئی ہیں عمر بھائی کے ساتھ اور وہ بھی اس قدر خوش ''یا اللہ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

وہ لوگ بھی نومی کو چھوڑ کر صباء کے کمرے میں آئے مگر کمرے سے آنے والی آوازیں سن کر دروازے کے باہر ہی رک گئے۔

سہیل کی ممی دوبارہ اندر آ کر بیٹھیں تو کچھ شرمندہ شرمندہ سی تھیں اور سوچ رہی تھیں اب کے بات کریں تو کیسے۔ منگنی کی انگوٹھی ابھی تک فوزیہ کے ہاتھ میں ہی تھی۔ سہیل کے ڈیڈی بھی چپ چاپ بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ بیوی اور بیٹے کے باہر جانے پر وہ سمجھ گئے تھے اب معاملہ الٹ ہو گیا ہے اور سہیل کی دادی تو جب سے آئی تھیں تب سے خاموش بیٹھی تھیں۔

آخر بہت سوچ سمجھ کر انہوں نے بات شروع کی۔ ''فوزی! لگتا ہے تم میری باتوں سے ناراض ہو گئی ہو۔''

''ناراض۔'' فوزیہ نے اسے دیکھا۔ ''ناراضگی کیسی بھابی جان! آپ نے جو کچھ کہا تھا وہ سب درست تھا اور میں نے جو کچھ کہا وہ بھی اپنی جگہ ایک سچ ہے۔''

''چھوڑو اپنے اس سچ کو۔'' وہ بات بناتی ہوئی بولیں۔ ''اگر ثناء معافی نہیں مانگتی تو نہ سہی میں خود سہیل کو سمجھا لوں گی کیونکہ میں جانتی ہوں کہ معافی مانگنا ثناء کی عادت نہیں۔'' اور دل میں سوچا میں جانتی ہوں وہ تم سے زیادہ بدتمیز، زبان دراز اور بدلحاظ ہے۔ انہوں نے یہ باتیں بڑے ضبط سے کہیں ورنہ ان کا اپنا دل بھی اب اس شادی پر رضامند نہیں تھا۔ مگر محض بیٹے کی وجہ سے وہ نرم رویہ اختیار کرنے پر مجبور تھیں۔

فوزیہ نے ان کی کسی ایک بات کا بھی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ منگنی کی انگوٹھی کو دیکھتی رہی۔

''چلو فوزی! اب غصہ تھوک دو۔'' وہ اسے منانے کے لیے پھر بولیں۔ ''لوگ ٹھیک کہتے ہیں غصہ حرام شے ہے میں بھی غصے میں نہ جانے کیا کچھ بک گئی۔ بات ہی ایسی تھی کہ غصہ آ گیا ورنہ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے آج نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔''

''آپ درست کہتی ہیں بھابی جان! مگر اب یہ شادی نہیں ہو سکتی۔'' فوزیہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''بھئی مذاق چھوڑو جب میں نے کہہ دیا سب ٹھیک ہے تو پھر کیسا غصہ؟ چلو ثناء کو بلاؤ میں اپنی بچی سے ملنا چاہتی ہوں۔'' وہ چاپلوسی سے کام نکالنے کے لیے بولیں۔

''بھابی! وہ اب کبھی آپ سے نہیں ملے گی۔ کیونکہ وہ آپ لوگوں سے ملنا اب پسند ہی نہیں کرتی۔ میں مانتی ہوں آپ کی سب باتیں درست ہیں مگر پھر بھی یہ شادی کسی بھی حال میں نہ ہو گی۔''

''دیکھو فوزی! تمہاری بھابی نے غصہ تھوک دیا ہے تم بھی غصہ تھوک دو۔'' سہیل کے ڈیڈی نے کہا۔

''میں غصے میں یا ناراض نہیں ہوں بھائی جان! یہ حقیقت ہے سہیل اور ثناء کی شادی اب نہ ہو سکے گی۔ آپ اس بات کو بھول جائیں بالکل اسی طرح جس طرح میں بھول گئی ہوں۔''

فوزیہ کی باتیں سن کر سہیل کی ممی کو بے انتہا غصہ آیا۔ وہ جتنی نرمی سے بات کر رہی

تھیں۔ فوزیہ اتنی سر چڑھ رہی تھی۔ وہ اسے کوئی سخت جواب دینا چاہتی تھیں مگر بیٹے پر نظر پڑتے ہی انہیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔ جب کچھ اور نہ سوجھا تو گم صم بیٹھی ساس سے مخاطب ہوئیں۔

''امی! آپ دیکھ رہی ہیں فوزیہ کو، بالکل غیروں کی طرح بات کر رہی ہے۔''

اور ساس صاحبہ جو یہ سوچ کر خاموش بیٹھی تھیں کہ اگر بولیں اور بہو نے سب کے سامنے ڈانٹ دیا تو ساری عزت جاتی رہے گی لیکن اب جب بہو نے مدد مانگی تو وہ خوش ہو گئیں۔ ان کو تو اس بات سے بھی خوشی ہوئی تھی کہ فوزیہ نے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ انہوں نے سوچا اب بہو سارا رعب ساری اکڑ بھول جائے گی۔ ورنہ پہلے وہ احسان جتاتے ہوئے کہتی تھی کہ یہ رشتہ محض آپ کی وجہ سے کیا ہے مگر فوزیہ کے انکار کے بعد اب وہ ایسا نہیں کہہ سکتی تھی اب جبکہ اس رشتے کو قائم رکھنے کے لیے وہ مدد بھی انہی سے مانگ رہی تھی تو انہوں نے بیٹی کو دیکھا آج تو وہ بھی بہت بدلی بدلی نظر آ رہی تھی مگر انہوں نے پرواہ نہ کی۔ وہ کتنی بھی بدل جاتی پھر بھی ان کی بیٹی تھی اسی خیال سے بولیں۔

''فوزی! اب جب تمہارا بھائی مان گیا ہے، بھابی بھی رضامند ہو گئی ہے تو تم کیوں انکار کر رہی ہو اب ہاں کر دو۔''

''اس لیے امی کہ میں جانتی ہوں اب یہ شادی ممکن نہیں رہی۔''

''کیوں، کیوں ممکن نہیں رہی؟ یہ شادی تو ہر حال میں ہو گی۔ تمہیں کیا کسی کا ڈر ہے؟'' انہوں نے غصے میں رضوان کو سنانے کے لیے کہا جو ابھی تک برا سا منہ بنائے ایک طرف کھڑے تھے۔

''میں نے کہا نا امی جان! اب یہ شادی نہیں ہو گی۔'' فوزیہ کو آج ان کا لہجہ ناگوار گزرا تھا۔

''ہائیں فوزیہ!...... یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔'' ماں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتی ہوئی بولی۔ ''اگر تمہیں اپنی بھابی کی باتوں کا برا لگا ہے تو اسے معاف کر دو۔ ذرا سوچو، اگر یہ شادی نہ ہوئی تو لوگ کیا کہیں گے اور پھر شادی میں دن ہی کتنے ہیں صرف تین اور اس موقع پر تم انکار کر رہی ہو، تماشہ بنانا چاہتی ہو ہم سب کو، لوگوں کے سامنے۔'' انہوں نے خفا ہو کر فوزی کو دیکھا جو ان کی بات پر ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوئی تھی۔

''کتنی بار کہوں میں مجبور ہوں امی جان! یہ شادی نہیں ہو گی۔'' فوزیہ نے انگوٹھی ان

کی جھولی میں پھینک دی اور وہ سب حیران ہو کر ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ سہیل کو اپنی ساری پلاننگ اکارت جاتی ہوئی نظر آئی۔

''پھپھو جان!'' وہ اچانک اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

''پھپھو! میں نے ہمیشہ آپ کا کہا مانا ہے۔ میں نے آپ کی کسی بات سے کبھی انکار نہیں کیا۔ آج آپ بھی میرا کہا مان لیں۔ انکار مت کیجیے گا۔ میں قسم کھاتا ہوں پھپھو اگر یہ شادی نہ ہوئی تو میں خودکشی کر لوں گا۔'' اس نے دھمکی دی اور فوزی نے بے بسی سے سوچا۔ اب بات ان کے بس میں کہاں ہے۔ پھر فوزیہ کے جواب دینے سے قبل ہی فومی طوفان بن کر کمرے میں داخل ہوا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے چیخ کر کہا۔ ''تم کیوں شادی پر زور دے رہے ہو اور کیوں خودکشی کی دھمکی دے رہے ہو۔''

''فومی! تم چپ رہو۔ وہ اپنی پھپھو سے بات کر رہا ہے۔ تمہیں ان کے درمیان بولنے کا کوئی حق نہیں۔'' فومی کی نانی اسے ڈانٹتی ہوئی بولیں۔

''حق کیوں نہیں۔'' وہ انہیں گھورتے ہوئے بولا۔ ''جب معاملہ میری بہن کی زندگی کا ہے تو میں ضرور بولوں گا۔ اور تم ذرا اٹھو برخوردار'' وہ سہیل کی طرف جھکتے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ سہیل بھی مارے غصے کے کھڑا ہو گیا۔

''پہلے مجھے یہ بتاؤ تمہارا کیا حق تھا، تم کون ہوتے ہو بھری یونیورسٹی میں میری بہن پر ہاتھ اٹھانے والے۔'' فومی غرایا اور سب ہی چونک پڑے، یہ بات تو سہیل نے کسی کو بھی نہ بتائی تھی۔

''مسٹر سہیل! میں آپی سے چھوٹا ضرور ہوں۔ مگر بچہ نہیں، سب کچھ سوچ سکتا ہوں، سمجھ سکتا ہوں۔ تم نے کیا سوچ کر یونیورسٹی میں سب کے سامنے میری بہن پر ہاتھ اٹھایا۔ آپی لاوارث نہیں، اس کا بھائی ہے، میں زندہ ہوں کمینے، یہیں تمہارا ہاتھ توڑ دوں گا۔'' وہ اسے کالر سے پکڑتے ہوئے غصے سے دھاڑا۔

''فومی یہ کیا کر رہے ہو؟'' نانی ان کے درمیان آتے ہوئے بولیں۔ ''سہیل اس کا ہونے والا شوہر ہے۔''

''یہ اور شوہر...... وہ بھی میری آپی کا۔ اسے کبھی منہ دھو رکھے اور آپ سب لوگ بھی

کان کھول کر سن لیں۔ اب یہ شادی ہرگز نہیں ہو گی۔'' اس نے غرا کر کہا اور رضوان نے محبت سے بیٹے کو دیکھا اور انہیں احساس ہوا آج ان کے صبر کا پورا پورا پھل مل جائے گا۔

''یہ آج تم سب لوگوں کو ہو کیا گیا ہے؟'' سہیل کی ممی غصے سے کھڑی ہو گئیں مگر سہیل نے ان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

''دیکھو فومی! میں نے اگر ثناء پر ہاتھ اٹھایا ہے تو اس پر مجھے افسوس ہے اور میں اپنی حرکت پر معافی مانگنے کے لیے تیار ہوں۔'' وہ جو پہلے ثناء کی معافی پر زور دے رہا تھا اب بڑی عاجزی سے خود معافی مانگنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

''میں جانتا ہوں تم کیوں معافی مانگ رہے ہو۔'' فومی نے نفرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی ابھی کالج کی طرف سے ایبٹ آباد گئے ہوئے ٹور سے واپس آنے والے اپنے ایک دوست سے مل کر آ رہا تھا۔ وہیں سے اسے یونیورسٹی میں ہونے والی اس جھڑپ کی رپورٹ ملی تھی۔ محض ثناء کی شادی کی وجہ سے وہ کالج ٹور کے ساتھ نہیں گیا تھا۔

''ممی!'' فومی، سہیل کو گھورتے ہوئے بولا۔ ''آپ کے اس ذلیل بھتیجے نے یونیورسٹی میں اپنے دوستوں کے سامنے قسم کھائی ہے کہ یہ ثناء سے انتقام لینے کے لیے شادی کرے گا اور پھر اس کو اذیتیں دے دے کر ختم کر دے گا اور جب وہ بستر مرگ پر ہو گی تب اس کو طلاق دے گا۔''

''کیا......؟'' رضوان نے گھور کر سہیل کو دیکھا۔

''جی ہاں پاپا!'' فومی اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میں اپنے دوست شہباز کے گھر سے آ رہا ہوں۔ اس کا بھائی بھی یونیورسٹی میں پڑھتا ہے اور یہ سب باتیں اسی نے مجھے بتائی ہیں اور کہا ہے سہیل سے شادی کرنے کی غلطی مت کرنا اگر کی تو پچھتاؤ گے۔''

فومی غصے اور نفرت سے سہیل کو گھورنے لگا جو معاملہ خراب ہونے پر یوں کھڑا تھا گویا فوت ہو گیا ہو۔

''میرا خیال ہے اب مزید کچھ کہنے سننے کی گنجائش نہیں رہی۔'' رضوان خشک لہجے میں بولے جس کا مطلب تھا اب جاؤ۔

''میں تو بغیر رضامندی کے ہرگز نہیں جاؤں گی۔ آپ یقین کریں سہیل ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ وہ ثناء سے محبت کرتا ہے۔ وہ ایسی بات کہہ ہی نہیں سکتا۔ فومی کے دوست

کے بھائی نے بکواس کی ہے۔'' سہیل کی ممی نے معاملہ سنبھالنے کی آخری کوشش کی مگر بے سود ثابت ہوئی۔

''بکواس میرے دوست کے بھائی نے نہیں آپ کے بیٹے نے کی ہے۔'' فومی ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نفرت سے بولا اور وہ لوگ مارے غصے اور انسلٹ کے کھڑے ہو گئے۔ پھر جاتے ہوئے فوزیہ کا بھائی بولا۔

''فوزیہ! آج سے تم ہمارے لیے مر گئی ہو۔ ہماری محبت، ہمارے پیار کا یہ صلہ دیا ہے تم نے۔ آئندہ ہمارے گھر کی دہلیز پار کرنے کی کوشش مت کرنا۔''

''اور اگر تم نے ایسا کیا۔'' اب کے اس کی بھابی بولیں۔ ''تو ہم دھکے مار کر تمہیں گھر سے نکال دیں گے۔''

فوزیہ نے خاموشی سے ان کی تمام باتیں سنیں اور پھر ماں کو دیکھا۔ مکافات عمل کا دوسرا حصہ شروع ہو گیا تھا جو رول ایک طویل عرصہ سے اس کی اپنی ساس ادا کرتی آئی تھی۔ وہی رول آج اس کی ماں کو ادا کرنا تھا اور تقدیر کی اس ستم ظریفی پر وہ بے بس تھی۔ کچھ نہ کر سکتی تھی۔

فوزیہ کی ماں نے جاتے ہوئے نفرت سے بیٹی کو دیکھا اور بے رحمی سے بولیں۔ ''تم بہت بے غیرت ہو فوزی! تم نے بھائی کی بات نہیں مانی...... بھابی کی بھی نہیں مانی اور میرا کہا بھی ٹال دیا۔ آج سے تو ہم سب کے لیے مر گئی۔ آج سے تمہارا ہمارا کوئی ناطہ نہیں۔ ایک تو چوری اس پر سینہ زوری۔''

ان کی بات سن کر فوزیہ کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم بکھر گیا۔ ''میں جانتی تھی امی جان کہ آج یہ سب ضرور ہو گا کیونکہ آج سے یوم سزا شروع ہوا ہے۔ جب میں نے خود اپنے آپ کو مردہ تصور کر لیا ہے تو کسی اور کے کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ جب میں نے خود ہی دنیاوی رشتوں کو چھوڑ دیا ہے تو آپ دھمکی کس بات کی دے رہی ہیں۔''

وہ سب لوگ غصے سے بھرے ہوئے باہر نکلے تو دروازے کے قریب ہی پروین، کرنل، عمر اور ثناء کو کھڑے پایا، ہونہہ وہ غصے سے دندناتے ہوئے آگے بڑھے تو عمر سہیل کے ساتھ قدم ملا کر چلتے ہوئے بولا۔

''لگتا ہے تمہاری دال جل گئی۔''

''اوہ، یو شٹ اپ۔'' سہیل دانت پیس کر بولا۔

''نان سینس۔'' عمر نے کہا اور شرارت سے مسکراتا ہوا واپس آ گیا۔ تب تک کرنل اور پروین اندر جا چکے تھے۔ جبکہ ثناء کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' عمر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' ثناء نے نظریں چرا لیں۔

''مگر میں جانتا ہوں۔'' عمر اسے دیکھنے لگا۔

''کیا؟'' ثناء کا رنگ نہ جانے کیوں زرد پڑ گیا۔

''یہ کہ تم اس بلا سے پیچھا چھوٹ جانے پر بہت خوش ہو۔'' عمر نے کہا اور اس کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا مگر کمرے میں تو عجیب منظر تھا۔ فوزیہ پروین کے گلے لگ کر زور زور سے رو رہی تھی۔ کرنل اور رضوان کھڑے حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ جبکہ فومی ہونٹ بھینچے دونوں ہاتھوں سے اپنے بال سنوار رہا تھا۔ ثناء اور عمر جب کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے چونک کر عمر کو دیکھا چونکہ وہ خود غصے میں بھرا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ اس لیے اس نے باہر کھڑے پھپھا، پھپھو اور عمر کو دیکھا ضرور تھا مگر فوراً اندر آ گیا تھا۔ اب جب عمر کو دیکھا تو آگے بڑھ کر خود مصافحہ کیا شاید زندگی میں پہلی بار۔ پھر نہ جانے اچانک کیا ہوا کہ وہ عمر کے گلے لگ کر سسک پڑا۔

''یہ کیا کر رہے ہو فومی؟'' عمر نے اس کے شانے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ''تم تو بہت بہادر ہو، بہت غیرت مند ہو۔ پھر یہ آنسو کیسے؟''

''یہ آنسو شرمندگی کی علامت ہیں عمر بھائی۔ میں آپ سے......''

''آگے کچھ نہیں کہو گے فومی!'' عمر اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''ہم ماضی کے گزرے ہوئے کسی پل پر کبھی بات نہیں کریں گے۔ سب فیصلے آج ہو چکے ہیں۔ اب ہم اپنے حال اور مستقبل پر نظر رکھیں گے۔ ہم ماضی کی تمام غلطیوں کو نظرانداز کر دیں گے، ٹھیک ہے نا۔''

''عمر بھائی! آپ بہت اچھے ہیں۔'' فومی نے کہا اور ثناء مسکرا دی۔

''اب چپ بھی کریں بھابی!'' پروین، فوزیہ کے آنسو صاف کرتی ہوئی بولیں۔

''کیسے چپ رہوں پروین! مجھ سے اب چپ نہیں رہا جاتا۔ میرا رونے کو دل چاہتا ہے۔ بہت رونے کو۔ میں نے کیا کچھ نہیں کیا آپ لوگوں کے ساتھ۔ اس کے باوجود آپ

کی محبت دیکھتی ہوں تو مارے شرمندگی کے مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر مجھے تو موت بھی نہیں آتی۔ پتہ نہیں یہ موت کب آئے گی اور کب میری اذیت، میری سزا ختم ہو گی۔ میں نے تو اتنے ظلم کیے ہیں پروین کہ قبر میں بھی چین نہیں آئے گا۔ مگر پلیز تم لوگ مجھے معاف کر دو۔'' وہ ایک بار پھر شدت سے رونے لگیں۔

''اس کمرے میں ایک دن رہ کر میں نے اپنے تمام گناہوں کو یاد کیا ہے۔ وہ گناہ جو کبیرہ سے بھی بڑھ کر ہیں۔'' فوزیہ پھر روتے ہوئے بولی۔

''بھابی، سب بھول جائیں۔ قسمت میں یونہی لکھا تھا۔'' پروین بھی افسردہ ہو گئیں۔

کچھ دیر کے لیے گہری خاموشی چھا گئی پھر فوزیہ نے ہی روتے ہوئے کہا تھا۔

''پروین! اب جمعہ کو کیا ہو گا؟''

''کیوں جمعہ کو کیا ہے؟'' پروین باہر کھڑے رہ کر سننے والی تمام باتیں بھول گئیں۔

''پھپھو جان!'' فومی انہیں کاندھوں سے پکڑتے ہوئے بولا۔ ''جمعہ کو ثناء آپی کی شادی تھی۔''

''ثناء نہیں شیری۔'' ثناء نے آگے بڑھ کر اس کا کان پکڑتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب؟'' فومی حیران ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

''تمہارے دوست کے بھائی نے یونیورسٹی میں ہونے والی ہر بات تمہیں بتائی ہے، ساتھ یہ نہیں بتایا کہ ثناء رضوان نے نام بدل کر شہر بانو رکھ لیا ہے۔'' ثناء نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اچھا، کیا واقعی؟ اس حساب سے تو آپ واقعی شہر بانو ہوئیں مگر کیا فرق پڑتا ہے میرے لیے۔''

''کیوں، کیوں فرق نہیں پڑتا؟'' ثناء نے آنکھیں نکال کر اسے دیکھا۔

''پہلے پوری بات تو سن لیجیے۔'' فومی ہنس کر بولا۔

''ٹھیک ہے سناؤ۔'' ثناء اس کے مقابل کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔

فومی نے پہلے عمر کو دیکھا پھر شرارت سے ہنستے ہوئے آہستہ سے بولا۔ **''آپ کو معلوم** ہے جب میں آپ کو ثناء آپی کہتا ہوں تو آپ چیخ چیخ کر سارا **گھر سر پہ اٹھا لیتی ہیں کہ آپی** کہو، صرف آپی۔ آپ چاہے شہر بانو بن جائیں یا **ثناء ہمارے لیے تو آپی ہی رہیں** گی۔ البتہ عمر بھائی کو فائدہ پہنچ سکتا ہے کیونکہ انہیں **آپ کا پہلے والا نام پسند نہ تھا۔''**

"فومی......" ثناء مارنے کو پلٹی تو وہ بھاگنے کی بجائے ہنستے ہوئے جھک گیا۔

کرنل اور رضوان بیٹھ چکے تھے اور مسئلہ اس وقت سب کے ذہن میں جمعہ کا تھا۔

کمرے میں ایک بار پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ آخر کافی دیر سوچنے کے بعد کرنل بولے۔

"آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ رضوان صاحب! ثناء بہت پیاری بچی ہے میں اسے اپنی بیٹی بنانا چاہتا ہوں اگر آپ پسند کریں تو جمعہ کو میں عمر کو دولہا بنا کر لے آؤں گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" پروین نے خفا ہو کر شوہر کو دیکھا۔

"کیا مطلب؟" اس کا رویہ دیکھ کر کرنل حیران رہ گئے۔ کہاں تو ثناء کے لیے اس قدر پیار اور بے تابی کہ بیٹے کو گھر سے نکالنے پر آمادہ ہو گئیں اور اب جب انہوں نے ثناء کی بات کی ہے تو وہ خفا ہو گئی تھیں 'لاحول ولا قوۃ یہ عورت بھی عجیب چیز ہے۔' انہوں نے ایک نظر بیوی کو دیکھا اور سب کے سامنے پوچھا۔

"کیا تمہیں اس رشتے پر اعتراض ہے؟"

"ہائیں، یہ میں نے کب کہا؟ ایک تو آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھتے۔"

"تمہیں اگر معلوم ہے کہ میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھتا تو بات کو پہلے ہی مطلب کے ساتھ پیش کیا کرو۔" وہ کچھ بے زاری سے بولے۔

"دیکھیے نا۔" پروین شوہر کو دیکھتے ہوئے بولیں۔ "مجھے شیری سے بڑھ کر بھلا کون عزیز ہو سکتا ہے۔ وہ میرا اپنا خون ہے مگر یہ شادی جمعہ کو نہیں ہو گی۔"

"مگر کیوں، جمعہ پر تمہیں کیا اعتراض ہے؟" کرنل نے پوچھا اور وہ بجائے کرنل کو جواب دینے کے بھائی سے مخاطب ہوئیں۔

"بھائی جان! آپ کے گھر کی بھی یہ پہلی شادی ہے اور میرا تو خیر بیٹا ہی ایک ہے میرے گھر کی یہ پہلی شادی بھی ہے اور آخری بھی اس لیے یہ شادی بہت اہم ہے اور میں پورے دھوم دھام سے عمر کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔ ویسے بھی آپ کو شاید معلوم نہیں فری اور راہی امریکہ سے مستقل سکونت کے لیے اگلے ماہ واپس پاکستان آ رہی ہیں۔ ان سب کی موجودگی میں یہ شادی ہو گی۔ ابھی تو میں کسی طرح بھی رضامند نہیں ہو سکتی۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے۔" رضوان کچھ سوچ کر بولے۔ "مگر مسئلہ جمعہ کا ہے۔ لوگوں کو دعوت نامے دیئے جا چکے ہیں۔ اگر جمعہ کی شادی نہ ہوئی تو بہت سبکی ہو گی اور پھر دھوم

دھام میں رکھا ہی کیا ہے خواہ مخواہ کی فضول خرچی۔ میرا خیال ہے جمعہ کو شادی مناسب رہے گی۔"

"آپ کچھ بھی کہیں بھائی جان میں رضامند ہونے والی نہیں۔" پروین نے صاف انکار کر دیا اور رضوان کچھ سوچنے لگے فوزیہ تو پہلے ہی چپ تھی۔ ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ فومی چٹکی بجاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

"پھپھو جان! آپ اجازت دیں تو میں ایک درمیانی راستہ نکالوں۔"

"درمیانی راستہ مگر کہاں کا؟" پروین نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"شادی اور انکار کے بیچ کا۔"

"اگر کوئی ایسا راستہ ہے تو جلدی سے بتا دو۔" وہ خوش ہوتی ہوئی بولیں۔

"آپ ایسا کریں پھپھو جمعہ کو آپ۔" وہ رکا۔

"ہاں ہاں جمعہ کو؟" پروین نے بے تابی سے پوچھا۔

"جمعہ کو آپ عمر بھائی اور ثناء آپی کا نکاح کر دیجیے۔ رخصتی پھر جب آپ چاہیں گی ہو جائے گی۔ اب آپ بتائیں آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں۔"

"ارے میرا بیٹا کس قدر عقلمند اور ذہین ہے۔" پروین نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم لی۔

"شکریہ پھپھو جان!" فومی نے سر جھکا کر کہا اور مسکرا کر شرارت سے عمر کو دیکھنے لگا۔

"لو بھئی شادی کی فکر تو اب ختم ہو گئی یعنی اب جمعہ کو نکاح ہو گا۔" کرنل نے کہا۔

"ہاں ٹھیک ہے میرے خیال میں یہی بات سب سے مناسب رہے گی۔" رضوان نے کہا۔

"مناسب تو رہے گی۔" پروین نے انہیں دیکھا۔ "مگر اس سے پہلے آپ ایک کام کیجیے۔ زاہدہ باجی اور نسرین کو فون کر دیجیے تاکہ وہ یہاں آ جائیں۔ ان کے سامنے پروگرام بنے بلکہ چھوٹے بھائی کو بھی فون کر دیجیے۔ بہت عرصہ بعد سب مل کر بیٹھیں گے اور باتیں کریں گے اور ہاں......"

"ارے۔" وہ چپ چاپ بیٹھی فوزیہ کو دیکھ کر چونک پڑیں۔ "بھابی! آپ ابھی تک یہیں بیٹھی ہیں۔ بھئی ہم لوگوں نے تو دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا اور شیری نے تو صبح سے ہی

کچھ نہیں کھایا۔ کچھ بندوبست کریں۔ کھانے کا بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

فوزیہ نے پروین کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر سر جھکا لیا۔ ثناء بولی۔ ''پھپھو جان! آپ آئیں کھانا بنانے میں تو بہت دیر لگے گی۔ فومی بازار سے جا کر کھانا لے آتا ہے۔''

''مگر مجھے ریڈی میڈ کھانے پسند نہیں، آپ اٹھیے نا بھابی!'' پروین نے پھر کہا۔

''پھپھو!'' ثناء ہچکچا کر بولی۔ ''ممی یہاں سے......''

''تم چپ رہو شیری! بھابی تمہاری ماں ہیں تم نہیں اور عمر......'' انہوں نے بیٹے کو دیکھا۔ ''کسی کو بغیر کسی احساس کے کمرے میں بند کر دینا سزا نہیں ہوتی، جب تک انسان خود نہ محسوس کرے یہ سزا نہیں ہے اور اگر یہ سزا ہے تو بہت معمولی۔ سزا تو وہ ہے جو ان کا بھائی، بھابی اور ماں انہیں دے کر گئے ہیں اور بیٹا اصلی سزا تو یہ ہے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی ان کے گھر نہ جا سکیں گی۔ انہیں راہ چلتے اگر کبھی دیکھیں گی بھی تو آواز دے کر بلا نہ سکیں گی۔'' وہ خاموش ہو گئیں کچھ دیر افسردہ سی سوچتی رہیں پھر بولیں۔

''صباء نے شادی نہیں کی تھی اکیلی تھی۔ اس لیے خود کو سزا دیتی رہی اور اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھا کر دوسرے لوگ بھی اسے سزا دینے لگے مگر تمہاری ممانی سہاگن ہیں ان پر بچوں کے، شوہر کے کچھ حقوق ہیں، کچھ فرائض ہیں، انہیں انجام دینے کے لیے انہیں بند کمرے میں نہیں کمرے سے باہر رہنا ہو گا اور پھر جب انہوں نے خود اپنے ظلم کو محسوس کیا ہے۔ انہیں خود اپنے گناہوں کا احساس ہو گیا ہے تو پھر بیچ میں سزا دینے والے، تُو اور میں کون ہوتے ہیں۔ سزا اور جزا کا معاملہ تو خدا نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے اسے معلوم ہے کسے سزا دینی ہے اور کسے جزا۔ وہ دیر کر سکتا ہے مگر اندھیر نہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا۔'' انہوں نے بیٹے کو دیکھا۔

''جی ممی۔'' عمر کی آواز میں درد تھا شاید صباء ایک بار پھر اس کے ذہن میں سما گئی تھی۔

پروین نے غور سے اسے دیکھا اور پوچھا۔

''ہاں تو پھر تمہاری ممانی کو دنیاوی کاموں میں حصہ لینا چاہیے نا؟''

''مجھے کیا معلوم ممی! جو آپ مناسب سمجھیں وہی کریں۔'' کہہ کر عمر نے سختی سے منہ بند کر لیا۔

''اب اٹھیے بھابی جان۔'' پروین نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ سب کی نظریں بے ساختہ دروازے کی طرف اٹھ گئیں۔ یہاں نومی بے زاری سے منہ بناتے ہوئے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔

''آؤ بیٹا میرے پاس آؤ۔'' پروین نے محبت سے پکارا۔

''نہیں۔'' اس نے انکار میں سر ہلایا اور فوزیہ اسے گھورنے لگی۔ ''ممی آپ گھور کر بعد میں دیکھیے گا۔ پہلے یہ بتائیے آج ہمارے گھر میں کیا ہو رہا ہے؟ آپ بدل گئی ہیں، لوگ بدل گئے ہیں یا میں بدل گیا ہوں؟ پلیز مجھے بتائیے آسمان نیچے آ گیا ہے یا زمین اوپر چلی گئی ہے۔ دوپہر میں میں گھر آیا تو آپ نے کچھ بھی پکا کر نہیں رکھا تھا۔ میں نے خود ہی آملیٹ بنایا اور سلائس کے ساتھ کھا لیا اور ابھی تک رات کے کھانے کا کوئی بندوبست نہیں۔ میں پوچھتا ہوں۔ یہ سب کیا ہے؟ آج میرے سکول جانے کے بعد یہ کیا تبدیلی آئی ہے یہ اچانک آپ سب کو کیا ہو گیا ہے میں سمجھ نہیں سکا۔''

اس کی بات سن کر سب لوگ بے ساختہ ہنس پڑے نومی اور بھی جھلا گیا۔

''ادھر آؤ بیٹا میں تمہیں بتاؤں۔'' پروین نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' وہ دروازے کے دونوں پٹ پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ''پہلے آپ یہ بتائیں آج ہمارے گھر میں یہ عدالتی کارروائیاں کیوں ہو رہی ہیں اور اگر یہ کارروائیاں ختم ہو چکی ہیں تو آپ سب لوگ ابھی تک ڈربے کی طرح اس کمرے میں کیوں بیٹھے ہیں۔'' وہ روہانسا ہو کر بولا اور سب لوگ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ دیر پہلے فضا پر چھائی ہوئی سنجیدگی ختم ہو گئی پھر ثناء آگے بڑھ کر اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔

''تمہیں بہت بھوک لگ رہی ہے نومی؟''

''بھوک سے زیادہ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ مجھے تو آج یہ گھر بھوت خانہ لگ رہا ہے۔ عجیب و غریب منظر دیکھ رہا ہوں آپی۔ مجھے ڈر ہے کہیں میں پاگل نہ ہو جاؤں۔''

''اور یہ سب کھانا نہ ملنے کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ آؤ میں تمہیں بازار سے کچھ کھلا کر لاؤں۔ ان لوگوں کو تو بازار کا کھانا پسند ہی نہیں۔'' فومی پیار سے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر چلا گیا اور پروین، فوزیہ کے ساتھ ہاتھ بٹانے کے خیال سے کچن میں آ گئی۔ کرنل، رضوان کے ساتھ ان کے کمرے میں چلے گئے۔

صباء کے کمرے میں اب صرف عمر اور ثناء رہ گئے تھے اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ

کھڑے کسی گہری سوچ میں گم تھے۔ بہت دیر گزر گئی تو ثناء بولی۔

''عمر آپ شاید ناراض ہو گئے ہیں۔ ممی خود تو نہیں جا رہی تھیں وہ تو پھپھو نے۔''

''پلیز شیری!'' عمر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں یہ سب نہیں سوچ رہا۔ ممی نے ٹھیک کہا ہے۔ جب خدا خود اپنے بندوں کو سزا دے سکتا ہے تو ہمیں کسی کو سزا دینے کا کوئی حق، کوئی اختیار نہیں اور پھر انہیں جو سزا ملی ہے وہ کچھ کم تو نہیں۔ ماموں نے کبھی اپنی بہنوں کو اپنے گھر آنے سے منع نہیں کیا تھا۔ جبکہ یہ لوگ خود انہیں منع کر کے گئے ہیں۔ میں تو صرف آنٹی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ انہوں نے میرے بارے میں کتنے خواب دیکھے تھے۔ میری خوشیاں دیکھنے کی انہیں کتنی خواہش تھی اور آج جب یہ سب ہوا ہے تو آنٹی۔'' ضبط کرنے کے لیے عمر نے ہونٹ بھینچ لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔

ثناء نے دکھ سے انہیں دیکھا اور انہیں تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ''عمر! آپ آزردہ کیوں ہوتے ہیں۔ یہ سب دیکھنا ان کی قسمت میں نہ تھا۔ اس کے باوجود یہ کچھ کم تو نہیں کہ ان کے بعد ان کی یہ خواہش پوری ہو گئی۔ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔''

''ہاں مجھے خوش ہونا چاہیے اور میں خوش ہوں۔'' وہ ثناء کا ہاتھ پکڑ کر اس کی انگلی میں پہنائی ہوئی صباء کی انگوٹھی دیکھنے لگا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟'' ثناء نے اس کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا جس کے چہرے پر غم اور خوشی کے ملے جلے تاثرات تھے اور کچھ یہی کیفیت اس کی اپنی بھی تھی۔

''ہاں آں۔'' عمر چونک پڑے۔ نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی نہ جانے کیا سوچ کر مسکرا دیئے اور ثناء نے شرما کر سر جھکا لیا۔

